# نقدِ عبدالحق



نذر سنز

لاہور ـــ کراچی ـــ راولپنڈی

# نَقدِ عَبدُ الحق

خواجہ حمید الدین شاہد کے لیے
ہدیۂ مرتب
یکم جون ۱۹۷۰

# نقدِ عبدالحق

بابائے اُردو کے فکر و فن پر
مشاہیر اہلِ قلم کی نگارشات کا نمائندہ انتخاب

مُرتبہ:
سیّد معین الرحمٰن

o

نذر سنز

لاہور ـــــ کراچی ـــــ راولپنڈی

طبع اوّل: اگست ۱۹۶۸ء

ناشر: نذر سنز۔ لاہور

طابع: کنول آرٹ پریس لاہور

قیمت: آٹھ روپے پچاس پیسے



ہیڈ آفس:
۲۲۱۔ سرکلر روڈ،
لاہور (۲)

شاخیں:
۱۔ کراچی: فیرئر روڈ
۲۔ راولپنڈی: گارڈن کالج روڈ

مُرتّب :

سیّد مُعین الرحمٰن

مشاغل :

ریسرچ اِسکالر،

تَرقّیِ اُردو بورڈ - کراچی ۱۹۶۳-۶۴ء

اُستاد شعبۂ اُردو،

گورنمنٹ ڈگری کالج - بہاول نگر ۱۹۶۴-۶۵ء

اُستاد شعبۂ اُردو

پنجاب یونیورسٹی - لاہور ۱۹۶۵-۶۶ء

اُستاد شعبۂ اُردو، برائے طَلَبائے غیر مُلکی

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج —— لاہور ۱۹۶۶ء

مُوجودہ مَصروفیت :

اُستاد اُردو، شُعبۂ السنہ،

فارمن کرسچین کالج — لاہور

تصنیفات و تالیفات :

۱ - بابائے اُردو — اَحوال و اَفکار ۱۹۶۴ء

۲ - اَفسانوی اَدب کے اَہم نقّاد ۱۹۶۷ء

۳ - رشید احمد صدیقی ۱۹۶۸ء

۴ - یلدرم — اَفسانہ نگار، اِنشا پرداز ۱۹۶۸ء

۵ - خیالستان (ترتیب مع مُقدّمہ) ۱۹۶۸ء

۶ - اِشاریۂ غالب (زیرِ ترتیب) ۱۹۶۸ء

پتہ : بنگلہ نمبر ۲۳ - ایف سی کالج کیمپس - لاہور (۱۶)

مُستقل پتہ: رحمٰن اسٹریٹ نمبر ایک، بہاول نگر

# نذر

بابائے اردو کے رفیقِ دیرینہ اور اپنے کرمفرما:

## پروفیسر حمید احمد خاں

کی خدمتِ اقدس میں

جن کی ذاتِ گرامی اردو اور اس کے خادموں

کے لیے

باعث صد تقویت و ہزار برکت ہے

# ترتیب

مُقدّمات:



تنقیدات:



خُطبات:

سیرت نگاری :



اُسلوب :



مجموعی جائزہ :

# عرضِ مُرتّب

بابائے اُردو مولوی عبدُالحق نے اپنے تئیں طویل لیکن اپنے مدّاحوں کی آرزو سے کم تر عُمر پائی — اُن کی "طویل" زندگی کا کوئی لمحہ بے مَصرف نہیں گزرا۔ اُن کی خدمات کا سلسلہ بہت وسیع اور نتائج کے اِعتبار سے بے حد و قیمتی ہے۔ اُنھوں نے اُردو کے علمی و اَدبی سرمائے میں قدر اور قامت، ہر اِعتبار سے قابلِ ستائش اِضافہ کیا۔ زندگی بھر وُہ برابر زبان کی اشاعت و مدافعت کے لیے مَعرکہ آرا رہے اور جہاں کہیں اِس پر آنچ آتی دیکھی وُہ ایک ذمّہ دار وکیل اور جاں باز مُحافظ کی طرح اُس محاذ پر سینہ سپر ہو گئے — ہر جگہ دلوں کو گرمایا، حوصلوں کو بڑھایا اور زبان کی مُؤثر وکالت اور مُؤثر حفاظت کی۔

عبدالحق بلا مبالغہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک اردو کا مقدمہ لڑتے پھرے۔ اس کا سفیر بن کر دور دور اس کا پیغام پہنچایا۔ خطابت کے سہارے اسے دلوں میں اتارا اور انشا پردازی کے بل پر اس پیغام کو ذہنوں میں جمایا۔ زبان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اصول و قواعد، صرف و نحو، کتبِ حوالہ اور لغات کی تدوین و ترتیب کی طرف توجہ کی۔ قدیم ادبی تذکروں اور نادر و معدوم مخطوطوں کو گم نامی سے نکال کر اصحابِ علم کو اُن سے روشناس کرایا اور تحقیق و تنقید کی راہوں پر نت نئے چراغ روشن کیے ــــ

○

عبدالحق کی شخصیت متفقہ طور پر عظیم تھی، اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے عظیم شخصیت کی نشانی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ "اس کا احاطہ ایک کوشش یا ایک زمانے میں نہیں کیا جا سکتا۔ بابائے اردو کی پہلو دار اور عظیم شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کے کارنامے بھی اتنے زیادہ اور متنوع ہیں کہ ایک مضمون، ایک نمبر یا ایک کتاب میں بیان نہیں ہو سکتے ــــ" بیان کیے جا بھی نہیں سکتے کہ بڑی شخصیت کا متحمل ہونا آسان نہیں۔ اس کے لیے بجائے خود بڑی شخصیت کا حامل ہونا ضروری ہے اور یہ خود اختیاری بات نہیں! عبدالحق کی بلند اور غالب شخصیت، اپنے بھرپور احاطے اور یادگار تجزیے کے لیے کسی حالی کی منتظر ہے۔ یہ حکیم اسرار احمد کریوی بھی ہو سکتے ہیں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی ــــ

○

عبدالحق اپنی زندگی ہی میں مداحوں، محققوں اور طالبانِ علم کے لیے ایک شان دار موضوع بن چکے تھے۔ جمیل الدین عالی کے لفظوں میں عبدالحق بہت دن سے اردو کے ایک

کارکن کا نام نہیں رہا تھا۔ اِس کے معنی بدل گئے تھے اور اِن معنی کا حلقہ بھی بہت وسیع ہو گیا تھا۔ آج یہ حلقہ اور بھی وسیع ہے ۔۔ آج "عبدُالحق" ایک تحریک ہے، ایک ایسا مضمون ہے جس پر اور جس کے لیے بے شُمار کام کرنے والے کام کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے ۔۔

"بے شُمار کام کرنے والوں" کے ہاتھوں عبدُالحق کے بارے میں لکھا بہت کچھ گیا ہے لیکن "کام کا مواد" کم ہے، پھر جو اور جیسا کچھ لکھا بھی گیا ہے، وُہ مختلف رسالوں میں بکھرا پڑا ہے اور یہ سب کا سب کم و بیش ایسے رسالوں میں ہے جن کی بوجوہ عام اِشاعت نہیں ہوتی۔ اِس مُنتشر مواد کی بازیافت ایک اہم لیکن کٹھن کام ہے ۔ پیشِ نظر کتاب "نقدِ عبدُالحق" اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ عبدُالحق میرا محبوب و مرغوب موضوع ہیں۔ اُن پر لکھتے پڑھتے ہوئے بارہا مَیں نے ایک ایسی جامع کتاب کی ضرورت محسوس کی جو اُن کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر اِس طرح حاوی ہو کہ طالبانِ علم کو اِس موضوع پر اخبارات و رسائل کی فراہمی اور اُن کی ورق گردانی کے صبر آزما اور دِقّت طلب کام سے بے نیاز کر دے۔ یہ کتاب اِسی نُقطۂ نظر سے مُرتّب کی گئی ہے، گو "اِس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اِس ضرورت کو پُورا بھی کرتی ہے۔"

○

یہاں دو صراحتیں بے محل نہ ہوں گی: کتاب میں شامل بعض مضامین، عبدُالحق کی زندگی میں لکھے گئے تھے، اِس لیے جہاں تہاں بات اِس صیغے میں کہی گئی بھی ملے گی گویا، مولوی عبدُالحق حیات ہیں ۔۔ اور دوسرے یہ کہ ترتیب میں اہلِ قلم اصحاب کے حفظِ مراتب کا سختی سے لحاظ نہیں رکھا جا سکا، کہ کتاب کا مقصودِ اصلی عبدُالحق کے فکر و فن کو صحیح سیاق و سباق میں پیش کرنا تھا۔ اُمید ہے اِس "شُتر گربگی" سے صرفِ نظر کیا جائے گا۔

○

کتاب میں شامل مضامین، پاک و ہند کے مختلف علمی اور ادبی رسائل سے مضمون نگار اصحاب کی اجازت اور بعض صورتوں میں اُن کی اپنی نظرِ ثانی کے بعد شریکِ انتخاب کیے گئے ہیں۔ جہاں یہ ممکن نہیں ہو سکا، وہاں مدیرانِ رسائل سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اُن تمام اہلِ قلم کا منت کش اور شکر گزار ہوں جن کے نتائجِ فکر اس انتخاب کی زینت ہیں۔

یہاں خصوصیت کے ساتھ مجھے ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کے گراں قدر مضامین کی شمولیت سے کتاب کا وزن و وقار بڑھ گیا ہے۔ خطبات پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون، میرے حال پر اُن کی برادرانہ اور مشفقانہ عنایت ہے۔ وقار عظیم صاحب کا دامن ہمیشہ "زمانے کے طوفانی حوادث میں میرا مامن و مسکن رہا ہے —"، اس موقع پر انھوں نے محض اپنے مضمون ہی سے مفتخر نہیں کیا بلکہ اپنے مرتب کردہ رسالہ "اُردو" کے "بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۲ء" سے بعض دوسرے نہایت اہم اور مفید مضامین کے انتخاب کرنے کی اجازت بھی عطا فرمائی۔

○

کتاب کا بیشتر مواد مجھے برگِ گل (مجلہ اُردو کالج، کراچی) کے بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۳ء سے میسر آیا، جس کے لیے میں اس رسالے کی مجلسِ ادارت کے اپنے دو رفقا برادرم متین الرحمن مرتضےٰ اور اُمراؤ طارق کا خاص طور پر ممنون ہوں۔ مشفق خواجہ صاحب کی امداد و اعانت کا میں ذکر نہیں کروں گا، کہ اُن سے جو تعلقِ خاطر ہے، اُس کے سامنے شکریے کے رسمی لفظوں کی کچھ وقعت اور قیمت ہی نہیں!

○

آخر نہ کہ اخیر، مجھے محبت اور احسان مندی کے ساتھ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجتبیٰ ایس ایم شفیق اور عزیزہ خورشید زہرا کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کا پیہم خلوص کتاب کے ابتدائی منصوبے سے اشاعت کی آخری منزل تک میرا دمساز رہا۔

۲۳۔ ایف سی کالج، لاہور

۱۶ اگست ۱۹۶۸ء

# دو باتیں مزید

پہلی بات وضاحت کی ذیل میں آتی ہے اور وہ یہ، کہ زیر نظر کتاب میں مولوی عبدالحق کے فکر و فن پر صرف ایسے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے جن کا تعلق **'نقد'** سے ہے - سیرت و شخصیت اور احوالِ زندگی پر مبنی تأثراتی مضامین **'احوالِ عبدالحق'** میں پیش کیے جائیں گے - اس سلسلے کی تیسری کڑی مولوی عبدالحق کے سوانح اور اقوال و افکار کے مرقع پر مشتمل ہوگی یہ **'یادگارِ عبدالحق'** کے نام سے زیر ترتیب ہے -

دوسری بات کا تعلق حسرت اور معذرت سے ہے — **'نقد عبدالحق'** میں بعض قیمتی چیزیں شامل نہیں کی جا سکیں : اسلوب پر ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون اور تنقید پر کلیم الدین احمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر احسن فاروقی کے مطالعے — کہ یہ نگارشات پہلے ہی ان بزرگوں کی اپنی مستقل تصانیف کا جزو ہیں -

مولوی عبدالحق کی تحقیقات پر ، ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ایک مضمون ، کئی برس ہوئے قومی زبان ، کراچی میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا تھا - میں اسے شامل کرنا چاہتا تھا لیکن سبزواری صاحب نے فرمایا کہ یہ اُن کے ایک مستقل اور مفصل مضمون کی (جو فی بطنِ شاعر ہی رہ گیا)، محض تمہید ہے ، اس لیے اسے شریک اشاعت کرنا مفید نہ ہوگا - مولوی عبدالحق کے فکر و فن پر طبع آزمائی کرتے ، اہلِ علم کو پچاس ساٹھ برس سے زیادہ ہو چکے — ان سب چیزوں کا کسی ایک کی نظر سے گزرنا محالات سے ہے - اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ مضامین شریکِ انتخاب نہ ہو سکے ہوں —

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد !

**مرتب**

# سوانحی خاکہ

| | | |
|---|---|---|
| بابائے اُردو ایک نظر میں | ... | خورشید زہرا |
| بابائے اُردو | ... | ڈاکٹر ابوسعید نورالدین |

○

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز حیدر آباد .... میں ہوا۔ وہ علی گڑھ سے گریجویٹ ہو کر نکلے ہی تھے کہ حیدر آبادی افواجِ باقاعدہ میں ... ایک ادبی رسالہ "افسر" ... کی ادارت کا کام (اُن) کے سپرد (ہوا) ... حیدر آباد میں (اُن) کی زندگی کا دوسرا دَور، دفتر معتمدی اُمور عامہ میں بہ حیثیت مترجم شروع ہوا ... دکن میں مولوی عبدالحق کی زندگی کا تیسرا دور اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی سے شروع ہوتا ہے۔ ... مولوی صاحب کی زندگی کا چوتھا اور حیدر آباد کا آخری دور ... (یہاں) دوبارہ آمد اور بہ حیثیت صدر شعبۂ اُردو، (جامعہ عثمانیہ) مامور ہونے سے شروع ہوا۔ اُن کی زندگی کا پانچواں دور ... دہلی میں بسر ہوا ... آزادیٔ ہند ... نے (اُنہیں) دہلی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ... کراچی میں ... اُنہوں نے پھر سے دکام کی بنا ڈالی۔ یہ اُن کی زندگی کا چھٹا دَور تھا۔ ... پاکستان میں فوجی انقلاب اور مارشل ایوب خاں کی ملاقات کے بعد مولوی صاحب کی زندگی کا ساتواں دور شروع ہوتا ہے۔ ... مجھے یقین ہے کہ جب کبھی اُن کی سوانح عمری لکھی جائے گی، اُس کو انہی تاریخی اَدوار میں تقسیم کرنا ہوگا"

——— ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

خورشید زہرا

# بابائے اُردو — ایک نظر میں

آباؤ اَجداد : ہندو، کائستھ

مُشرّف بہ اسلام : بعہدِ شاہ جہانی

والد : شیخ علی حسین مرحوم

بڑے بھائی : شیخ ضیاء الحق مرحوم، جرنلسٹ : ۵۶-۱۸۴۶ء — ۱۹۳۶ء

چھوٹے بھائی : شیخ احمد حسن (ریٹائرڈ انجینیر بھوپال) مقیم : لالوکھیت، کراچی

مُولد : ہاپوڑ، ضلع میرٹھ

تاریخ ولادت : ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء

اِبتدائی تعلیم : فیروز پور مشرقی پنجاب

بسلسلۂ تعلیم علی گڑھ میں چھ سال :

علی گڑھ میں ورود : بعمر ۱۸ سال، ۱۸۸۸ء - ۱۸۸۹ء

علی گڑھ اسکول کے معلّمین : ہیڈ ماسٹر ہورسٹ، سیکنڈ ماسٹر ولایت حسین، مولوی خلیل احمد

کالج کے اساتذہ : پرنسپل تھیوڈر بیک، پروفیسر آرنلڈ، شبلی نعمانی، مولانا عباس حسین، بابو مکرجی۔

نامور مشاہیر کی صحبت : سرسید احمد خاں، سیّد محمود، محسن الملک، حالی

نامور ہم جماعت : ڈاکٹر ضیاء الدین — مولانا ظفر علی خاں — مولوی حمید الدین

حافظ ولایت اللہ — سیّد محفوظ علی — شیخ عبداللہ

خواجہ غلام الثقلین — سیٹھ یعقوب حسن — خان بہادر سید شوکت علی

بی۔ اے : مدرسۃ العلوم، علی گڑھ ۱۸۹۴ء

اعزازی ڈگریاں بصلۂ خدماتِ علمی : ڈی، لٹ، الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۷ء

ڈی، لٹ، علی گڑھ یونیورسٹی ۱۹۴۱ء

دکن، حیدر آباد میں چالیس سال :

ہیڈ ماسٹر مدرسۂ آصفیہ : ۱۸۹۵ء

مُدیر رسالہ "افسر" : ۱۸۹۹ء

ہوم سیکرٹریٹ میں مُترجم : ۱۹۰۰ء

ڈائریکٹر تعلیم کے مددگار : ۱۹۱۱ء

انسپکٹر آف سکولز، صوبہ اورنگ آباد : ۱۹۱۲ء

ڈائریکٹر سررشتۂ تالیف و ترجمہ : ۱۹۱۸ء

پرنسپل عثمانیہ کالج، اورنگ آباد

وظیفۂ حُسنِ خدمت (پنشن) : ۱۹۳۰ء

صدر شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی : ۱۹۳۰ء

سیکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو : ۱۹۱۲ء — ۱۹۳۵ء

## دلّی میں دس سال :

بحیثیت سیکرٹری "انجمن" : ۱۹۳۶ء — ۱۹۴۷ء

## پاکستان (کراچی) میں چودہ برس :

بھارت سے مستقلاً ہجرت : ۲۸ر جنوری ۱۹۴۹ء

بانی و سیکرٹری "انجمن" : ۴۸ - ۱۹۴۹ء

صدر انجمن ترقیٔ اُردو : ۱۹۵۰ء - ۱۹۶۱ء

وفات : کمبائنڈ ملٹری ہاسپٹل، کراچی ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء

## سیرت و شخصیت (خود اپنی نظر میں) :

"(لوگوں) نے جیسا مجھے سمجھ رکھا ہے، ویسا مَیں نہیں ہوں۔

بقول مولانا حالیؔ :

جیسا نظر آتا ہوں، نہ ایسا ہوں میں\
اور جیسا سمجھتے ہیں، نہ ویسا ہوں میں\
اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے\
بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں"

(مکتوبِ حق، بنام : مولانا عثمان جعفری، پرنسپل سٹی کالج، حیدر آباد)

ڈاکٹر ابو سعید نورالدین

# بابائے اُردو

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۲۰ / اگست ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے اور ۹۱ سال کی عمر پاکر ۱۶ / اگست ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا۔ اس کل مدت کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں ان میں سے پہلا حصّہ وہ ہے، جو بچپن اور تعلیم میں گزرا یہ حصّہ ۱۸۹۴ء میں ۲۴ سال کی عمر میں علی گڑھ سے بی۔ اے پاس کرنے پر ختم ہو جاتا ہے۔

ان کی زندگی کا دوسرا حِصّہ ملازمت کا زمانہ ہے۔ ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کرنے کے بعد وہ چند سال مدرسۂ آصفیہ، حیدر آباد دکن کے صدر مدرس رہے کئی سال ریاست کی معتمدی اور امور عامہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۰۱ء میں ناظم تعلیم کے مددگار اور چند ماہ کے بعد صوبۂ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات مقرر کیے گئے یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء تک کوئی ۱۸ سال جاری رہا اس وقت تک ان کی عمر ۴۲ سال کی ہو گئی تھی۔ یہ انسانی زندگی کا وہ مرحلہ ہے، جہاں نظر میں وسعت، عزم میں استقلال ارادوں میں استحکام افکار میں توازن اور آرا میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اس وقت انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ عظیم تر ذمّہ داری کا حامل ہو سکے۔

اس کے علاوہ ۱۸ سال کی طویل ملازمت کے دوران بابائے اُردُو نے اپنی علمی صلاحیتوں اور علمی قابلیتوں کو اس حد تک بڑھا لیا تھا کہ اہل دانش و بینش کی نظر کرم اُن پر پڑنے لگی۔ ۱۹۱۲ء سے گویا ان کی زندگی کا تیسرا اور آخری اور اہم ترین حصّہ شروع ہوتا ہے اس لیے کہ اس سال وہ انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے، انجمن ترقی اُردُو کی بنیاد اصل میں ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ میں پڑی تھی۔ پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی علی الترتیب اس کے پہلے صدر اور پہلے سکریٹری

مقرر ہوئے مولانا شبلی نے استعفیٰ دیدیا تو دسمبر ۱۹۰۵ء میں ان کی جگہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی سکریٹری منتخب ہوئے انجمن کے صدر پروفیسر آرنلڈ اس زمانے میں انگلستان جا چکے تھے۔ اس کے ارکانِ انتظامی بھی تقریباً سب کے سب حیدر آباد، دکن میں تھے اس لیے اس کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہ دے سکے بلکہ وہ حالات سے مجبور ہو کر سکریٹری کے عہدے سے دست بردار ہو گئے اب ان کی جگہ مولوی عزیز مرزا کو نیا سکریٹری بنایا گیا وہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ اس لیے بجا طور پر امید کی گئی تھی کہ وہ انجمن کی ذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گے لیکن وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا ایک سال بعد ہی انہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑا۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا دہلی میں سالانہ اجلاس ہوا انجمن ترقی اُردو اصل میں اسی کی ایک شاخ تھی۔ ترقی اُردو کا شعبہ مولوی عزیز مرزا کے بعد ایک طرح لاوارث رہ گیا کانفرنس کے سربراہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے اس موقع پر سیکریٹری کے عہدے کے لیے مولوی عبدالحق کا نام پیش کیا جو ان کی فطری استعداد اور صلاحیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس شبھ گھڑی میں بالاتفاق منظور ہو گیا مولوی صاحب نے اس عہدے کو پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اور بہ طیبِ خاطر قبول کیا۔

اس زمانے میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، مولوی صاحب ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد میں مقیم تھے اس لیے انہوں نے اپنا صدر دفتر وہیں قائم کیا لیکن نہایت بے سروسامانی کے عالم میں چنانچہ اس سلسلہ میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ "جب انجمن کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا تو اس کے نئے سکریٹری کو ایک پرانا صندوق ملا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسّی سے کسا ہوا تھا۔ اس میں ایک رجسٹر چند پرانے اور غیر مرتب مسودات ایک قلم دوات اور باقی۔ اللہ کا نام۔ یہ تھی کل کائنات انجمن ترقی اردو کی، جو اس نے اپنے معتمد چہارم کے حوالے کی۔"

۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۶ء تک وہ اورنگ آباد میں ملازمت بھی کرتے رہے اور انجمن کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے رہے اس ۲۴ سال کے عرصہ میں انہوں نے اپنی کوششوں سے

انجمن کی از سر نو تشکیل کی اور اس میں نئی جان پھونکی اس کو انہوں نے شب و روز کی محنت اور جاں فشانی سے اس قابل بنایا کہ پورے برصغیر ہند و پاکستان کی نمائندگی کر سکے۔

اورنگ آباد جیسے دور افتادہ مقام سے اُردو کی اس تحریک کو پورے برصغیر میں پھیلانا قدرے دشوار تھا: اس لیے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ کی مجلس مشاورت نے فیصلہ کیا کہ انجمن کا صدر دفتر دہلی میں ہونا چاہیئے مولوی صاحب کو ملازمت سے انجمن زیادہ عزیز تھی اس کے علاوہ اس دوران میں انہوں نے اُردو کی ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت کو اپنا لائحۂ عمل بنا لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے ملازمت کو اُردو کی خدمت پر قربان کر دیا اور مجلس مشاورت کے فیصلہ کے مطابق اورنگ آباد کی سکونت ترک کر کے انجمن کے دفتر کے ساتھ ساتھ منتقل ہو گئے۔

اب ان کے لیے سوائے انجمن کے کام کے اور کوئی شغل نہ رہا انہوں نے اپنے آپ کو انجمن کے لیے وقف کر دیا دہلی میں علمی کام کی رفتار کو اور تیز کر دیا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پورے برصغیر کا دورہ بھی کیا اور جگہ جگہ انجمن کی شاخیں قائم کیں اردو کا ہر جگہ نہایت زور و شور سے پروپیگنڈا کیا اور اس کی ہر جہتی ترقی کے لیے کوشاں ہوئے ان کی کوششوں کو دیکھ کر لوگوں کے ایک طبقہ کو خطرہ پیدا ہوا کہ اُردو تحریک کہیں برصغیر میں ہمہ گیر شکل اختیار نہ کرلے۔ اس لیے ہندی اُردو کا ایک لایعنی جھگڑا کھڑا کر دیا گیا مگر مولوی صاحب بھی جو اپنی دُھن کے پکے اور عزم کے سچے تھے، خوب ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے اور ہمیشہ زبان و قلم سے یکساں طور پر لڑتے رہے وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اپنے زورِ بیان اور قوتِ استدلال سے حریف کو نیچا دکھاتے رہے پورے برصغیر کے لیے اُردو ہی کو وہ واحد قومی زبان سمجھتے تھے جو ہماری تہذیب و ثقافت کی صحیح ترجمانی کرتی ہے اور کر سکتی ہے۔

دہلی میں بابائے اُردو نہایت جوش ولولے اور عزم و استقلال کے ساتھ اردو کی ترقی کے لیے نئے نئے منصوبے بناتے اور ان کو حتی الوسع عملی جامہ پہناتے رہے تھے کہ یکایک ۱۹۴۷ء میں زمانے نے ایک نئی کروٹ لی۔ برصغیر کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا آزادی ملی ایک ملک کے دو حصے ہوئے ایک بڑے حصے کا ہندوستان یا بھارت ہی کا قدیم نام برقرار رہا اور دوسرے کا ایک نیا نام پاکستان رکھا گیا یہ گویا ایک لحاظ سے ہندی اُردو کے دیرینہ جھگڑے کا خاتمہ تھا۔ ہندی نے اپنا جدا ملک بھارت قائم کیا اور اُردو نے اپنا گھر نئی امنگوں اور تمناؤں

کے ساتھ پاکستان میں بسایا اب دہلی میں رہ کر اُردو کے لیے کچھ کام کرنا محال تھا تاہم بابائے اُردو کو یہ یقین تھا کہ حکومت ہندوستان اگر تعاون کرے تو وہ دہلی میں رہ کر بھی کام کر سکیں گے اس لیے کہ وہ وہاں ایک طرح سے جم چکے تھے اور کام کی رفتار کافی تیز ہو چکی تھی۔ لیکن حکومت ہندوستان اس معاملہ میں ان کے ساتھ تعاون کرنے پر ہرگز آمادہ نہ ہوئی بلکہ ایک لحاظ سے ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ انجمن سمیت اپنا بوریا بستر سنبھالیں اور پاکستان کی راہ لیں اس سے انہیں بڑا دکھ ہوا۔ اور اِن کے عزائم متزلزل ہو گئے ہندی اُردو کے پرانے جھگڑے کے باوجود وہ اب تک یہی سمجھتے رہے کہ چونکہ اُردو ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترکہ زبان اور قومی اثاثہ ہے اس لیے دہلی میں بیٹھ کر کام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن حکومت ہندوستان کے سخت جانبدارانہ اور فرقہ وارانہ رویّہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔

مولوی صاحب ۱۹۴۷ء کے نومبر کے اواخر میں کراچی پہنچ گئے اس کے بعد انجمن کا دفتر بھی کراچی منتقل ہو گیا یہاں انہوں نے از سرِ نو کام شروع کیا لیکن حالات کی ناسازگاری سے ان کا دل اور افسردہ ہو گیا وہ اس طرح کام نہ کر سکے جس طرح وہ کرنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں انہیں کام کرنے کے اچھے مواقع میسّر آئیں گے لیکن ان کی توقعات پوری نہ ہو سکیں انہیں یہاں طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا دہلی میں وہ اگر غیروں کے ہاتھ لاچار تھے، تو پاکستان میں آکر وہ اپنوں کے ہاتھ اور زیادہ بے بس ہو گئے۔ ارباب اختیار سے انہیں موافقتوں سے زیادہ مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ان کی یہ کشمکش برابر جاری رہی حتیٰ کہ ۱۹۵۸ء میں ملک میں دوسرا انقلاب آیا اس انقلاب کے بعد اگرچہ حالات ذرا بہتر ہو گئے تھے لیکن مولوی صاحب خود اس وقت تک بہت زیادہ بوڑھے ہو چکے تھے، اور اُن کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ ہر دم بیماری لگی رہتی تھی آخر ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو بہت سی تمنّاؤں اور آرزوؤں کو ساتھ لے کر ابدی نیند سو گئے۔

مولوی صاحب انجمن ترقی اردو سے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۶۱ء تک تقریباً پچاس سال (نصف صدی) وابستہ رہے اس مدّت میں انہوں نے اچھے سے اچھے دِن بھی دیکھے اور بُرے سے بُرے دِن بھی ان کی زندگی میں انجمن کے تین دور گزرے ہیں (۱) ۱۹۲۲ء

۱۹۳۸ء ۲۲ سال۔ حیدر آباد دکن کا دور (۲) ۱۹۳۸ء - ۱۹۴۷ء ۹ سال۔ دہلی کا دور اور (۳) ۱۹۴۷ء - ۱۹۶۱ء ۱۴ سال کراچی، پاکستان کا دوران میں سے حیدر آباد، دکن کا دور ہی بہترین دور رہا ان کی خود اپنی زندگی کے لیے بھی اور انجمن کی کارکردگی کے لحاظ سے بھی انجمن کا تو گویا وہی دور عہدِ زرّین تھا دہلی میں بھی وہ اچھے جم گئے تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا پاکستان کا دور بہت بُرا رہا اس دور میں وہ ہمیشہ پریشانیوں میں مُبتلا رہے خصوصاً اکتوبر ۱۹۵۸ء تک بہت زیادہ کشمکش میں رہے۔

بایں ہمہ وہ جہاں بھی رہے، جس حالت میں بھی انہیں دن گزارنا پڑے ہمیشہ کام کرتے رہے ان کے زیرِ ہدایت و سرپرستی انجمن ترقی اُردُو نے نہایت مفید اور عمدہ کتابیں تالیف و ترجمہ کرا کے شائع کی ہیں ان میں سے اکثر کتابوں پر انہوں نے فاضلانہ مقدمے اور دیباچے لکھے ہیں جن سے ان کی تحقیقی صلاحیت اور تبحّرِ علمی کا بہ خوبی پتا چلتا ہے۔ خصوصاً قدیم اردو پر ان کی نظر بہت وسیع تھی وہ کہتے تھے کہ "انجمن کے کتب خانہ میں قدیم اُردُو کے بعض ایسے مسودے اور کتابیں موجود ہیں، جنہیں میرے بعد کوئی صحیح طور پر پڑھ بھی نہ سکے گا"۔ کسی نے ٹھیک لکھا ہے کہ "ان کی بدولت دکن میں بہت سے پرانے دبے ہوئے ادبی دفینے نکل آئے ہیں یہ ان ہی کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اُردُو ادب کی تاریخ میں کئی سو سال کا اضافہ ہو گیا ہے"۔ ان کی ان ہی بیش بہا خدمات کی بنا پر قوم نے انہیں بابائے اُردُو کے معزّز لقب سے نوازا۔

بابائے اردو عہد حاضر کے بلند پایہ نثر نگار گزرے ہیں بے شمار کتابوں پر ان کے مقدمات اور دیباچے، مختلف موضوعات پر ان کے لاتعداد مضامین اور اردو زبان و ادب پر ان کے عالمانہ خطبات اردو نثری ادب کا بڑا قیمتی ذخیرہ ہیں ان کے مقدمات کتابی شکل میں دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ سر سید پر ان کے جو مضامین تھے ان کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ "چند ہم عصر" اُن کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے برّصغیر کی مختلف علمی و ادبی شخصیتوں پر لکھے تھے یہ کتاب ان کی شخصیت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے "اُردُو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" کے نام سے بھی انہوں نے ایک کتابچہ لکھا تھا جو بنیادی معلومات پر مشتمل ہے ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "تنقیدات عبدالحق" کے نام سے شائع ہوا تھا قدیم اُردو پر ان کے جو مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ "اردو" میں

شائع ہوتے رہے ان کا بھی ایک مجموعہ "قدیم اردو کے نام سے شائع ہوا ہے۔

مولوی صاحب کی اُردو نثر بہت حد تک سرسید اور حالی کے طرزِ تحریر کی نمائندگی کرتی ہے ان دنوں بزرگانِ ادب کی طرح وہ بھی سادگی اور سلاست کو زیادہ پسند کرتے ہیں ان کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی پائی جاتی ہے جس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے رنگ جھلکتا ہے سیدھے سادے الفاظ سے جملوں میں زور پیدا کر دینا ان کا امتیازی اسلوب بیان سمجھا جا سکتا ہے۔ عبارت میں سادگی کے باوجود (کم و بیش) ہر جگہ شگفتگی پائی جاتی ہے۔ موقع و محل دیکھ کر عربی فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہلکے پھلکے ہندی الفاظ سے کہیں کہیں اپنی عبارت کی خوبی کو بڑھاتے ہیں روزمرہ اور محاورے کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں لیکن ہر جگہ سادگی ملحوظ رہتی ہے۔

---

○

"... پچھلے ایک دو سال کے عرصے میں ہندوستان اور پاکستان کے بعض رسالوں نے میرے بارے میں نمبر شائع کیے ہیں۔ ان میں اُشتجاع (کراچی)، نورس (کراچی)، اور مجلس (دکن) (وغیرہ شامل ہیں)۔ جلد ہی اُردو کالج، کراچی کی طرف سے بھی ایک خاص نمبر (برگِ گل) شائع ہو رہا ہے جو کم و بیش بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے ... ان سب کے پڑھنے سے (ناظرین) کو میرے متعلق بہت کچھ معلوم ہو جائے گا ___"

(مکتوبِ حق بنام غینورا زیبا ددوس) مورخہ ۲۱ جون ۱۹۶۱ء)

# تحقیقات

| | |
|---|---|
| مولوی عبدالحق اور دکھنیات | ... نصیرالدین ہاشمی مرحوم |
| اردوئے قدیم اور بابائے اردو | ... خواجہ حمید الدین شاہد |
| ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے | ... ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ |

عبدالحق صاحب کی روشِ تحقیق شُترِ بے مہار نہیں۔ اس کی منزل و
منہاج واضح ہے۔ وہ مخطوطات کی محض نقطہ شماری نہیں کرتے
ان کا مقصود نکتہ رسی ہے۔ ان کے ہاں انتخابِ موضوع کے معاملے
میں بھی توازن پایا جاتا ہے۔ وہ تحقیقِ مہمل نہیں کرتے۔ اُن کی تحقیق
کارآمد، عظیم اور بصیرت افروز ہوتی ہے ــــــــــــــ"

ڈاکٹر اختر اورینوی

نصیر الدین ہاشمی

# ڈاکٹر مولانا عبدالحق اور دکھنیات

ایک زمانہ وہ تھا کہ دنیائے اردو دکھنی شعرا میں سے صرف ولی دکھنی کے نام اور کلام سے واقف تھی۔ چنانچہ مولانا محمد حسین آزاد نے ان کو اردو کا پہلا شاعر بتاکر شاعری کا باوا آدم قرار دیا تھا۔ عرصہ دراز تک، دکن کی ادبی خدمات اور ادبی کارنامے پوشیدہ تھے۔ دکن کے شاعروں ادیبوں، ناظموں اور ناثروں سے کوئی واقف ہی نہ تھا۔ لیکن آج اردو ادب میں دکن کے ادبی کارنامے تاباں اور درخشاں ہیں۔ اہل بصیرت اور ارباب اردو اس امر سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں کہ اردو کی نشو و نما میں دکن کا بڑا حصہ ہے۔

دکن میں ولی سے دو سو سال پہلے اُردو زبان تحریر میں آچکی تھی۔ تمام اصناف سخن مثنوی غزل، قطعہ اور رباعی کا ذخیرہ فراہم ہو کر کلیات مرتب ہو گئے تھے۔ نثر کی داستانیں لکھی گئی تھیں غرض دکھنی ادب کے شہ کار موجود تھے، مگر ان کو دنیائے اُردو سے واقف کرانے والا کوئی نہیں تھا۔ دکھنی ادب کی تحقیق کا وسیع میدان بنجر پڑا تھا۔ اگرچہ عبدالجبار خان ملکاپوری نے تذکرہ شعرائے دکن ۱۹۱۲ء میں شائع کر کے دنیائے اردو پر ظاہر کر دیا تھا کہ ولی سے ڈیڑھ سو سال پہلے سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ نے اردو میں شاعری کی تھی لیکن اس تذکرہ سے ارباب علم زیادہ واقف نہیں تھے۔ خصوصاً شمالی ہند کے ہمدردان اردو اور صاحب ذوق، دکھنی شعرا اور نثر نگاروں کو نہیں جانتے تھے۔

مولانا ڈاکٹر عبدالحق کو دکھنیات کا پہلا معمار قرار دے کر دکھنی ادب سے اصحاب علم کو روشناس کرانے کا سہرا باندھنا حق بجانب ہے۔ مولانا عبدالحق ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آکر مدرسہ آصفیہ کی ہیڈ ماسٹری پر مامور ہوئے۔ رسالہ "افسر" کے ایڈیٹر بنے اور اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری چنے گئے۔ کتابوں پر مقدمات لکھنے لگے۔ قدیم کتابوں کو ایڈٹ کر کے

شائع کرنے کا آغاز کیا۔ انجمن کے لیے کتب خانہ فراہم کرنے لگے۔ رسالہ "اُردو" کی اجرائی عمل میں آئی۔ غرض انجمن ترقی اردو، ترقی کے کئی زینے طے کرتی گئی۔ اس کے کاموں میں وسعت ہوتی گئی۔ اُردو کی خدمت ہی کے سلسلے میں مولانا، دکھنیات کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور جنوری ۱۹۲۲ء میں رسالہ "اردو" میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات پر ایک مقالہ شائع فرمایا۔ اس مضمون میں سلطان محمد قلی کے کلیات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بصیرت افروز معلومات پیش کیے ہیں۔ اس کے علاوہ سلطان کے کلام کا نمونہ دیا ہے۔ اس کی شاعری پر تنقید کی ہے، خوبیوں کو گنایا محاسن شاعری کو اجاگر کیا اور سلطان کی شاعری کے بلند معیار اور مرتبہ کو نہایت وضاحت سے آشکار کیا ہے مولانا نے اس مقالہ کا آغاز اس عبارت سے فرمایا ہے:

"اردو نے اگرچہ شمالی ہند یعنی گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا، لیکن وہ بات چیت، کام کاج سودا سلف تک محدود رہی۔ اہل علم نے اسے کبھی منہ نہ لگایا اور اس لیے اس نے تقریر سے نکل کر تحریر کی کھکھیڑ نہ اٹھائی۔ سب سے اول، ادبی صورت اس نے دکن میں حاصل کی اور دکھنی کہلائی اور، گروہ عوام سے نکل کر مجلس خواص میں آئی شعرائے دکن جنکے تخیل کی جولانگاہ فارسی زبان تھی، اب اس نئی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے، دکن کو اسکا فخر حاصل رہے گا اور اردو زبان کی کوئی تاریخ اس تذکرہ سے خالی نہ ہوگی (رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۲ء ص ۱۳)

مولانا عبدالحق نے انجمن ترقی اُردو کی جانب سے دکھنیات پر جو کام فرمایا ہے، اس کو چند اقسام پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنی:

(۱) دکھنی شعرا کے تذکرے ایڈٹ کر کے شائع کرنا۔

(۲) دکھنی نظم اور نثر کی کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کرنا۔

(۳) دکھنیات پر تنقیدی کتابیں تصنیف کرنا۔

(۴) دکھنیات پر مضامین اور مقالے مرتب کرنا۔

(۵) دکھنی نظم اور نثر کی قلمی کتابوں کا فراہم کرنا۔

دکھنی تذکروں میں چمنستان شعرا اور گل عجائب خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں، اگرچہ ان کے پہلے مولانا نے گلشن ہند مولفہ مرزا علی لطف اور دیگر تذکرے بھی شائع فرمائے مگر ان کو دکھنی تذکروں میں شامل کرنا درست نہیں ہے۔

چمنستان شعرا کو لالہ لچھمی نارائن شفیق اور گل عجائب کو اسد علی خاں نے مرتب کیا تھا۔ جو آصفی دور کے شعرا تھے اور ان کے مخطوطات نایاب تھے۔ مولانا عبدالحق نے ان کو ایڈٹ کر کے شائع فرمایا تھا، اس کی وجہ سے دکن کے بیسیوں شعرا کا حال ارباب علم کو معلوم ہوا اور دنیائے اردو کو دکھنی شعرا سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔

"ریاض حسنی" یعنی تذکرہ فتوت کو بھی شائع کرنیکا ارادہ مولانا نے فرمایا تھا، مگر ہنوز اس کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔

دکھنی نظم اور نثر کی کتابیں جنکو مولانا نے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) معراج العاشقین، مصنف، خواجہ بندہ نواز۔

(۲) سب رس، مصنف وجہی۔

(۳) قطب مشتری مصنف، وجہی۔

(۴) مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں و آصفجاہ مصنف غضنفر۔

(۵) گلشن مثنوی، مصنف، نصرتی۔

(۶) علی نامہ، مصنف، نصرتی۔

آخر الذکر دونوں کتابیں پاکستان بن جانے کے بعد شائع ہوئی ہیں۔ باقی کتابیں اس کے پہلے شائع ہوئیں۔

"سب رس" ملا وجہی کی تصنیف ہے جو پہلی نثر کی داستان ہے اور سنہ ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس کا تذکرہ میری کتاب "دکن میں اُردو" کے پہلے ایڈیشن جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی، موجود ہے، اور عبارت کا کسی قدر نمونہ یہاں شامل ہے۔

مولانا عبدالحق نے اس کتاب کو رسالہ "اُردو" بابتہ اکتوبر ۱۹۲۴ء کے ذریعہ خصوصیت سے تفصیل کے ساتھ متعارف کرایا ہے اور چند سال کے بعد، یہ کتاب انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوئی جس میں مولانا کا تفصیلی معلومات آفریں مقدمہ بھی شامل ہے۔

"قطب مشتری" وجہی کی تصنیف ہے۔ جو سنہ ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی ہے، اس کا نسخہ انڈیا آفس میں تھا۔ میں نے اپنے مضمون کے ذریعہ جو رسالہ معارف سنہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ہے، اس کا تعارف کیا ہے۔ "قطب مشتری" میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی عشقیہ داستان

درج ہے۔ اس کو انجمن ترقی اردو نے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔

"جنگ نامہ عالم علی خاں" رسالہ اردو میں شائع ہوئی اور پھر علیحدہ شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں آصفجاہ اول اور عالم علی خاں کے جنگ شکر کرہ کا حال قلمبند ہوا ہے۔ اس جنگ میں فتح کے بعد آصف جاہ، دکن کے حکمران بنے تھے۔

"گلشن عشق" اور "علی نامہ" دونوں بیجاپور کے عادل شاہی دربار کے ملک الشعرا نصرتی کی تصانیف ہیں۔ گلشن عشق اور علی نامہ دونوں اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں خصوصاً علی نامہ ایک رزمیہ مثنوی ہونے کے لحاظ سے، اردو ادب میں اس کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔

دکھنی ادب سے متعلق جو تنقیدی کتابیں مولانا نے تالیف کر کے شائع کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے کارنامے (۲) نصرتی۔

پہلی کتاب میں دکن کے صوفی بزرگوں کے حالات اور ان کی دکھنی نظم و نثر کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ دکھنی زبان کے آغاز اور اس کے نشو و نما میں صوفیائے کرام نے کیا کیا کارہائے نمایاں کئے ہیں اور اردو کو پروان چڑھانے میں انھوں نے کس طرح گرانبہا خدمت انجام دی ہے۔

"نصرتی" بڑے معرکہ کی کتاب ہے اس میں نصرتی کے حالات اور اسکے کلام پر تنقید ہے حق یہ ہے کہ مولانا نے اس میں اپنی تنقیدوں اور زور قلم کو خوب خوب جولانی دی ہے اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ نصرتی کے کمال فن کو اجاگر کیا ہے۔ اس بصیرت افروز کتاب میں یہ واضح کیا ہے کہ اردو شاعری میں نصرتی کو کسقدر بلند مرتبہ حاصل ہے اور اس نے "علی نامہ" اور "گلشن عشق" لکھ کر اردو پر کیا احسان عظیم کیا ہے۔

مولانا نے دکھنیات کے ضمن میں جو جو ٹھوس کام کیا، وہ یہ ہے کہ مولانا نے رسالہ "اردو" وغیرہ میں دکنی ادب کے متعلق کئی بلند پایہ مضامین لکھے ہیں جن کے ذریعہ دکن کے شعرا اور نثر نگاروں کو ارباب علم سے روشناس کیا گیا اور ان کی نظم اور نثر کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ اس موقع پر ان تمام مضامین یا مقالوں کا تذکرہ کرنا دشوار ہے کیونکہ میرے پاس وہ تمام ذخیرہ نہیں ہے جو مولانا نے رسالہ اردو کے علاوہ دیگر رسالوں میں شائع کیا ہے۔ جن مضامین سے میں واقف ہوں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) حضرت شاہ میران جی شمس العشاق۔ (۲) حضرت شاہ برہان الدین جانم (۳) حضرت

شاہ امین الدین اعلیٰ (۴) سب رس منظوم یعنی وصال العاشقین از ذوقی اور گلشن حسن ودل از بحری (۵) حسن شوقی (۶) لچھمی نارائن شفیق (۷) مراثی غواصی (۸) شمع پروانہ (۹) غزلیاتِ اشرف (۱۰) غزلیاتِ ایجاد (۱۱) شیخ ملا نصرتی (۱۲) دلی کے سنہ وفات کی تحقیق (۱۳) حیدرآباد کا ایک شاعر خاندان عشرتی (۱۴) قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں۔

یہ تمام مضامین نہایت اہم ہیں۔ ان میں شعرا اور نثر نگاروں کے حالات بڑی جد وجہد اور کاوشش کے ساتھ تحقیق کر کے درج کئے گئے ہیں، اور ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس سے ان کے اسلوب بیان، طرز ادا اور زبان کی تدریجی ترقی کا حال بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

دکھنیات کے ضمن میں مولانا کا ایک اور کارنامہ بھی قابل قدر اور لائق اظہار ہے۔ یعنی مولانا وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انجمن ترقی اُردُو کے کتب خانہ کی بنیاد ڈالی اور دکھنی قلمی کتابوں کو بھی جمع کرنے کا آغاز کیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت ایک بڑا حصہ ہندوستان میں چھوڑ گئے۔ جو اب انجمن ترقی اردو علی گڈھ کی ملک ہے۔

اگر مولانا، یہ کتابیں جمع نہ کرتے تو کام کرنے کے لیے دشواری ہوتی اور جو ذخیرہ محفوظ ہوگیا ہے، وہ تلف ہوگیا ہوتا۔ مولانا کے ذوق و شوق کے مدنظر ہی دوسرے کتب خانوں میں قدیم کتابیں جمع ہونے لگیں۔

دکن کے ادبی کارناموں کو اُجاگر کرنے اور دکھنی شہ کاروں کو دُنیائے اُردُو سے روشناس کرانے کے سلسلے میں کئی اور نام مثلاً سیّد شمس اللہ قادری، ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زور، پروفیسر حفیظ سید، پروفیسر سید عبدالقادر سروری، سخاوت مرزا صاحب، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب وغیرہ کے اسمائے گرامی فراموش نہیں کئے جا سکتے، مگر اس امر کا اعتراف بلاخوفِ تردید کیا جا سکتا ہے کہ مولانا نے دکھنیات کے متعلق بہت کام کیا ہے۔ اپنی کتابوں اور مضامین سے دکھنیات کے میدان میں قابلِ قدر اور لایق ستایش اضافہ کیا اور رہنمائی فرمائی اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے دکھنیات کی جانب توجہ فرمائی ہے۔

بہر حال دکھنی ادب کے سلسلے میں جو کام مولانا عبد الحق نے فرمایا ہے، وہ ناقابل فراموش ہے۔ دنیائے اُردو کو مولانا کا سپاس گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے تاریخ زبان اُردو اور اُردو ادب کو قلمبند کرنے کے لیے بیش بہا ذخیرہ مہیّا کر دیا، اور شایقین علم اور دادِ تحقیق دینے والوں کے لیے گراں قدر مواد جمع کر کے بڑی اچھی رہنمائی اور صحیح راہبری فرمائی ہے۔

---

"مولوی عبد الحق کا اصل کارنامہ لسانی حیثیت کا ہے۔ اُردو کے قدیم تذکرے، دواوین اور نثر کی اہم کتابیں جو ناپید تھیں، وہ مولوی صاحب کی بدولت سامنے آئیں۔ ان کی ترتیب و تدوین، ان کی تاریخی اور ادبی اہمیت کی وضاحت اور ان سے متعلق ہر طرح کی معلومات کو یک جا کر کے مولوی صاحب نے اُردو زبان کی بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔ سب رس، ریاض الفصحا نکات الشعرا، معراج العاشقین، ذکر میر، نصرتی، اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، مرحوم دہلی کالج —— یہ ساری کتابیں اُردو کے سرمائے میں بیش قیمت سرمایہ ہیں ——"

—— ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

# اردوئے قدیم اور بابائے اردو

...... اردو کی قدیم کتابوں اور مصنفوں کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر اردو دنیا سے روشناس کرانا دراصل تاریخ ادب اردو کے اولین باب کو متعین کرنا ہے۔ دکنی (قدیم اردو) کی تحریریں مخطوطات کی شکل میں ملتی ہیں۔ ان مخطوطات کی تلاش و جستجو اور ان کی فراہمی میں بہت زیادہ وقت اور روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام بڑا صبر آزما اور محنت طلب ہے۔ معمولی قابلیت کا آدمی اس کام کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

بابائے اردو ان چند خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں، جنہیں قدرت علم، دولت اور شہرت سے سرفراز کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی علمیت، دولت، شہرت اور ذاتی رسوخ سے فائدہ اٹھا کر حیدرآباد دکن کے علمی خزانوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ قدیم اردو کے مخطوطات نہ جانے کہاں کہاں دبے پڑے تھے، ان کو یک جا کرنے میں بابائے اردو نے جو زحمتیں اٹھائی ہیں، ان کو صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں، جنہیں قلمی کتابوں کے جمع کرنے اور ان پر کام کرنے کا تجربہ ہوا ہو۔ شیخ چاند مرحوم نے رسالہ "نورس" اورنگ آباد کالج کے "عبدالحق نمبر" میں لکھا تھا۔

"آپ کو اس زبان کو ترقی دینے کی جو دھن اور لو ابتدا ہی سے تھی، اس کا اندازہ اس امر کے مدنظر آسانی سے ہو سکتا ہے کہ آج سے چالیس سال قبل آپ علی گڑھ سے طالب علمی کے زمانے میں اورنگ آباد کے پن چکی کے کتب خانے کی تلاش میں آئے تھے۔ اس زمانے میں اورنگ آباد تک ریل جاری نہ ہوئی تھی۔ اس لیے آپ کو احمد نگر کے راستے سے آنا پڑا تھا لیکن افسوس کہ اس سے بہت قبل، وہ مشہور کتب خانہ لٹ چکا تھا۔ آپ کو دکھنی زبان کی چند

---

سالِ تحریر: ۱۹۳۰ء

کتابوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا"۔ دکنی مخطوطات کو پڑھنا، سمجھنا اور مصنفوں کے حالات کی چھان بین کرنا بڑی قابلیت چاہتا ہے۔ مخطوطات کے رسم خط سے آگاہی بھی ایک خاص فن ہے جس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مشق و مزاولت کرنی پڑتی ہے۔ مصنفین کے ناموں اور مخطوطات کے زمانۂ تصنیف و کتابت کا تعین بڑی تحقیق اور علمی بصیرت چاہتا ہے۔ مختلف ادوار کے ادبی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ بڑی دیدہ ریزی، سعیٔ پیہم اور گہرے مطالعہ کے بعد ہی مخطوطات کے بارے میں کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بابائے اردو نے شروع ہی سے اس اہم کام کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی چنانچہ جب رسالہ "اردو" کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تو "آغاز" کے عنوان کے تحت، ان خیالات کا اظہار فرمایا:

"بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں، جن کا کلام ابھی تک بساط قدردانی تک نہیں پہنچا۔ بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شائع ہوتے ہی ناپید ہو گئیں"۔

"قلم کا مسافر آبلہ پا نہ ہو تو یہاں وہ منظر نظر آئیں گے، جن کے لطف اٹھانے اور بیان کرنے کو ایک عمر چاہیئے۔ نظر کوتاہی نہ کرے تو بہت سے خزانے ایسے ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں، اور جنہیں ہوا تک نہیں لگی۔ ہمت جی نہ چرائے تو بہت سی کانیں ہیں، جو ابھی کھودنی ہیں"۔ دکھنی نہ ہوتے ہوئے بھی دکنی زبان کے مخطوطات پر کام کرنا مولوی صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

رسالہ اردو میں قدیم مصنفین اور شاعروں پر آپ کے کئی محققانہ مضامین شائع ہوئے تھے، جو اردو زبان کی تاریخ پر تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لیے بہت ممد و معاون ثابت ہوئے۔ سب سے پہلا مضمون اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری پر جنوری ۱۹۲۲ء کے رسالہ اردو میں چھپا تھا۔

قطب شاہی دور کے لکھنے والوں میں ملا وجہی سب سے بڑا ادیب اور شاعر تھا۔ اس نے ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) میں ایک مثنوی "قطب مشتری" لکھی تھی جس میں محمد قلی قطب شاہ کی داستان عشق، استعارے کے پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ یہ مثنوی اپنے دلکش اسلوب اور اعلیٰ تخیل کی وجہ سے قدیم اردو کی بہترین کتابوں میں سمجھی جاتی ہے۔ بابائے اردو کو اس مثنوی

کا ایک مخطوطہ مل گیا تھا، جسے برٹش میوزیم کے مخطوطے سے مقابلہ کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی طرف سے شائع کیا۔ مثنوی کی ابتدا میں (۷۰) صفحات کا پُر از معلومات مقدّمہ تحریر فرمایا جس میں وجہی کے حالات، مثنوی کی زبان اور انداز بیان کی خصوصیات اور قصے کے پلاٹ پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں دکنی الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ مقدمے کی ایک عبارت اور مثنوی کے چند شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں:

"اس کتاب میں وجہی نے ایک باب "در شرح شعر" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں وُہ بتاتا ہے کہ شعر کی اصل خوبی کیا ہے اور اس میں کیا کیا جوہر ہونے چاہئیں۔ سب سے پہلی بات وہ یہ کہتا ہے کہ شعر بیس ہونا چاہیئے زیادہ کہنے کی ہوس نہ کر، ایک شعر کہہ مگر اچھا کہہ اس میں کچھ نزاکت ہونی چاہیئے ...... ایک بات بڑی اچھی کہی ہے کہ شعر میں کوئی جدت ہونی چاہیئے۔ دوسروں کی تقلید کرنی آسان ہے، لیکن شاعر وہی ہے جو اپنے دل سے نئی بات پیدا کرتا ہے ...... اب ان باتوں کو خود اس کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیئے":

گُتیا ہوں تجھے پند کی ایک بات
کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بَیتاں بچیس !
بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
جسے بات کے ربط کا فام نیں
اسے شعر کہنے سوں کچ کام نیں
نکو کر تو لئی بولنے کا ہوس
اگر خوب بولے تو یک بیت بس

---

وجہی کی ایک دوسری کتاب "سب رس" قدیم اُردو نثر کی قابل قدر تصنیف ہے۔ قطب مشتری کی طرح یہ قصّہ بھی استعارے کے پیرایہ میں لکھا گیا ہے اور اسے قدیم اُردو نثر کی پہلی ادبی کوشش سمجھا جاتا ہے۔ رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۲۴ء میں بابائے اُردو نے اس کتاب پر (۲۶) صفحات کا ایک طویل مقالہ قلمبند فرمایا تھا۔ اس مقالہ کی اشاعت

سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ شاہ فضل اللہ فضلی کی "دہ مجلس" اردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو "کربل کتھا" کے نام سے بھی مشہور رہے۔ اس مقالے کی ابتدائی عبارت یہ ہے:

"میں ایک مدت سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے لیے سامان بہم پہنچا رہا ہوں۔ اس تحقیق و جستجو میں بہت سی قدیم نظم و نثر کی ایسی کتابیں دستیاب ہوئیں جو بالکل نایاب ہیں اور ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔ ان میں سے ایک "سب رس" ہے۔"

بابائے اُردو کو اس مخطوطے کے دو نسخے ملے تھے۔ ایک حیدر آباد دکن میں اور دوسرا بیجاپور میں۔ یہ دونوں نسخے تقریباً ایک صدی بعد کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن کسی میں بھی سنہ تصنیف کا ذکر نہیں ہے، البتہ دونوں نسخوں میں سنہ کتابت سنہ ۱۱۷۱ھ اور سنہ ۱۱۷۷ھ درج ہے۔ بابائے اُردو نے وجہی کے ممدوح عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے سنہ اور وجہی کے ایک ہم عصر شاعر غواصی کی دو مثنویوں (طوطی نامہ اور سیف الملوک و بدیع الجمال) کے سنہ تصنیف کی مدد سے سب رس کو سنہ ۱۰۴۵ھ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ اس مقالے میں "سب رس" کے موضوع اور قصے کے پلاٹ کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی قدامت اور اہمیت کے مدنظر بابائے اُردو نے اسے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ سنہ ۱۹۳۲ء میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے شائع فرمایا۔ پھر اس کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۵۲ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ کتاب کے آخر میں قدیم الفاظ کی ایک فرہنگ دیگئی ہے۔ مقدمہ کی چند سطریں ملاحظہ کیجئے:

"اس زمانے میں اردو نثر کا نام نہ تھا۔ اور نہ نثر لکھنا کوئی کمال کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ایک دو رسالے جو اس کے قبل کے پائے جاتے ہیں، سو وہ اس قابل نہیں کہ محفلِ ادب میں جگہ پائیں۔ "سب رس" اردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو ادبی اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے اور اس کی فضیلت اور تقدم کو ماننا پڑتا ہے۔ نثر میں قافیہ کا التزام بذاتِ خود ایک ایسی چیز ہے۔ کہ تکلف اور آورد سے بچنا محال ہے۔ . . . . . لیکن اس سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اس میں بے حد فصاحت، روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ حال کے زمانے میں جو اسی ڈھنگ پر بعض کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً "فسانۂ عجائب" وغیرہ ان سے یہ کسی طرح کم نہیں بلکہ میری رائے میں بیان کی سادگی میں ان سے بڑھ کر ہے۔"

"سب رس" کی اس عبارت سے بابائے اُردو کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے:

"حسن نار چنز سار، صاحب صورت صاحب دیدار، دُسرے دیس غمزے کوں بلائی، کہی میں سنی ہوں کہ بہوت دیساں بچھڑیا تھا۔ سو ملیا ہے۔ تیرا بھائی کیا نام دھرتا ہے، کیا کام کرتا ہے۔ غمزا بولیا کہ میرے بھائی کا نام نظر، عجب مرد ہے باخبر۔ بولی کہ کیا ہنر جانتا ہے۔ بولا کہ لعل، مانک، ہیرے، رتن خوب پچھانتا ہے۔"

رسالہ اُردو، جولائی سنہ ۱۹۲۵ء میں "سب رس منظوم" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ وجہی کی سب رس اتنی مقبول ہوئی کہ سید شاہ حسین ذوقی نے "وصال العاشقین" اور مجرمی نے "گلشن حسن و دل" کے نام سے قریب کے زمانے میں سب رس کے قصے کو منظوم کیا۔ اس مضمون میں ذوقی کی زندگی اور اس کے زمانے کے حالات کا تفصیلی ذکر ہے۔ نیز ذوقی کی منظوم سب رس اور وجہی کی سب رس کا موازنہ کرکے ذوقی کی دوسری تصانیف کا سرسری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح مجرمی کی "گلشن حسن و دل" کی خصوصیات اور شاعر کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں

"قدیم اُردو" کے عنوان سے بابائے اُردو کے کئی مضامین سلسلہ وار شائع ہوئے ہیں۔ اپریل سنہ ۱۹۲۷ء کے رسالہ اُردو میں اس سلسلے کی پہلی کڑی "بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان" شائع ہوئی ہے۔ اس میں حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے حالات زندگی، ان کے ماحول اور تصنیفات کو روشناس کرایا گیا ہے۔ مضمون کے ابتدائی حصے میں شہر بیجاپور کی تاریخی اور تمدنی اہمیت اس طرح دکھائی گئی ہے:

"شاید دلی کے بعد ہندوستان کے کسی شہر میں اس قدر اسلامی یادگاریں اور عمارتیں نہ ہوں گی جتنی اس شہر میں ہیں۔ یہ عادل شاہی بادشاہوں کا مستقر تھا۔ جو علم کی قدر دانی اور فنون لطیفہ کے ذوق میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان کے پاکیزہ مذاق کے نشان اس شہر میں قدم قدم پر ملتے ہیں جو ان کے اعلیٰ تمدن، ذوق سلیم اور شان و عظمت کی کھلی دلیل ہیں۔ اُمراء، علماء اہل کمال اور صناعوں کے علاوہ عرفا، صوفیا اور اولیاء اللہ کا بھی مرکز رہا ہے۔"

اس کے بعد حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی مذہبی شخصیت اور شاعرانہ عظمت کا حال درج ہے۔ ان کی تاریخ وفات کی تحقیق اس طرح کی گئی ہے:

"تذکرۂ اولیائے دکن میں ان کی تاریخ وفات ۹۱۰ھ لکھی ہے، مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ شمس العشاق" سے ان کی وفات کی تاریخ نکلتی ہے جو ۹۰۲ھ ہوتی ہے اور یہ مادۂ تاریخ شاہ حسین ذوقی کا کہا ہوا ہے۔ مجھے ایک پرانا مرثیہ ملا جو کسی نے حضرت میراں جی کی وفات پر لکھا ہے۔ اس سے ان کی

وفات کی تاریخ ۲۵ شوال ۹۰۲ھ معلوم ہوتی ہے۔

تاریخ اور سنہ وفات کے اشعار یہ ہیں:

سرور میرا ڈھل گیا      کرتار بھایا اُن کیا
جو اُن کیا ہیں سر لیا      جے کچھ حکم الٰہی کا

---

تاریخ حضرت سال نوسو      اس پر اگلے بھی دو
دو دن مدت وفا شو      جے کچھ حکم الٰہی کا

---

اربع سوں یو سال ہے      ماہے کوں شوال ہے
رحلت کئے اس حال ہے      جے کچھ حکم الٰہی کا

---

تاریخ بست و پنج بود      بسیار گریاں رنج بود
در حال واصل گنج خود      جے کچھ حکم الٰہی کا

---

شاہ میراں کی ہر تصنیف کے بارے میں مکمل معلومات یکجا کر کے نمونۂ کلام بھی دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اُن کے ایک منظوم رسالہ "خوش نامہ" کا ذکر ہے جس کی کتابت ۱۰۶۸ھ میں ہوئی تھی۔ یہ رسالہ مثنوی کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ جس میں ایک سو ستّر سے کچھ زیادہ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کا ایک نسوانی کردار خوش یا خوشنودی ہے جس کے بارے میں بابائے اُردو کا یہ خیال ہے کہ یہ کسی فرضی لڑکی کا نام ہے یا پھر حضرت شاہ میراں کی کوئی عزیزہ یا بیٹی ہو گی، جس کے لیے انہوں نے یہ نظم لکھی ہے۔ اس مثنوی کے آخری دو شعر یہ ہیں:

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھرپور
یہ خوش خوشیاں اللہ کیرا نورؐ علیؑ نور
کھنڈیا خوش خوش نامہ تمت ہوا تمام
خوش سب کوئی دائم قائم جیتا خواص عوام

"خوش نغز" میراں جی کی دوسری نظم ہے، جس کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے:

"یہ نظم بھی "خوش نامے" ہی جیسی ہے۔ خوش یا خوشی سوال کرتی ہے اور میراں جی جواب دیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اس کا نام بھی "خوش نغز" ہے۔ نظم میں جگہ جگہ اسی ڈھنگ سے میراں جی کا نام آیا ہے، جس طرح ہم نے "خوش نامے" میں دیکھا ہے۔ اگرچہ اس میں گنتی کے کل بہتر تہتر شعر ہیں۔ لیکن اسے نو باب میں تقسیم کیا ہے۔"

اس نظم کے ہر باب سے چند شعر بطور نمونہ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً باب دوم کا پہلا شعر یہ ہے:

خوش پوچھے کے کہو میراں جی عالم اچھے کیتے
پیر، کہیں سن جیتے تن، اچھیں عالم تیتے

"شہادت الحقیقت" کے متعلق اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

"یہ تیسرا منظوم رسالہ ہے اور خوش نامے سے زیادہ بڑا ہے۔ اس میں (۵۶۳) شعر ہیں۔ اس کے بھی میرے پاس دو نسخے ہیں۔ ایک میں تو صاف حضرت میراں جی کی تصنیف بتائی گئی ہے۔ دوسرے میں کسی کا نام نہیں لکھا، لیکن خود نظم میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ یہ انہی کی تصنیف ہے۔ حمد و نعت اور منقبت کے بعد خاندان چشتیہ اور اپنے پیر حضرت شاہ کمال بیابانی کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:"

اس کمالیت کے سنگ | اس خانوادہ کے انگ
اُن کمائے اپنا حال | تو ہوئے پیر کمال
کچھ تھے نصیب میرے | پگ دیکھے توان کیرے

آگے چل کر بابائے اردو نے جو وضاحت کی ہے، وہ درج ذیل ہے:

"اس کے بعد تصوف کی وہی معمولی باتیں ہیں لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے تصوف و معرفت کے مسائل بیان کریں، ہندی میں لکھنے کی وجہ اور معذرت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بہت ایسے لوگ ہیں جو عربی جانتے ہیں نہ فارسی، ان کے لیے ہندی میں یہ باتیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر پر نہ جانا چاہیئے۔ باطن کو دیکھنا چاہیئے۔ زبان کوئی بھی ہو۔ معنول پر خیال کرنا چاہیئے۔ جیسے مٹی چھان کر سونا نکالتے ہیں۔ اسی طرح بات کے مغز کو لو اور لفظوں پر خیال نہ کرو۔"

ہیں عربی بول کیرے | اور فارسی بھو تیرے

یہ ہندی بولوں سب　　　اس معنوں کے سبب
یہ بھاکا بھلسو بولی　　　پن اس کا بھاوت کھولی
یو گر مکہ پند پایا　　　تو ایسے بول چلایا
جے کوئی اچھیں خاصے　　　اس بیان کیرے پیاسے
وے عربی بول نہ جانے　　　نا فارسی پچھانے
یہ ان کی بچن ہیت　　　سنت بوجھیں ریت
یو دیکھت ہندی بول　　　پن معنی ہیں پنتول

"شرح مرغوب القلوب" میراں جی کا نثری رسالہ ہے۔ جس کے دو نسخے بابائے اردو کو دستیاب ہوئے تھے۔

رسالہ اردو جنوری سنہ ۱۹۲۸ء میں بیجاپور کے ایک صوفی شاعر حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ کی زندگی اور شاعری پر جو مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"آپ شاہ برہان الدین جانم کے فرزند ہیں۔ مادرزاد ولی سمجھے جاتے تھے۔ اس پر سب تذکرہ نویسوں کو اتفاق ہے کہ یہ ولی کامل اور مجذوب واصل تھے، اور باوجود جذب کمال اور محویت کے معارف واسرار کی تلقین فرماتے تھے"۔

شاہ امین الدین اعلیٰ کا جتنا کلام بابائے اردو کو مل سکا بہ غائر مطالعہ کر کے اپنے تاثرات اور کلام کا نمونہ دیا گیا ہے۔ ان کے ایک مدحیہ قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:

برہان حجت نام ہے، وردین پیش اقدام ہے
اسرار حق با نام ہے، برہان بن میراں اپر
اکمل ولایت تج عطا، ثابت ثبوت نافی خطا
جز عین حق دیگر نہ تھا برہان بن میراں اپر

دوسری نظم "محب نامہ" یا "محبت نامہ" کی لفظی اور معنوی خوبیوں کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

"یہ نظم قصیدے کے طرز میں ہے۔ قافیہ تو ایک ہی ہے لیکن ردیف کی پروا نہیں کی گئی۔ اپنے خیالات کو روانی کے ساتھ ادا کیا ہے"۔ نمونہ کے طور پر دو شعر لکھے جاتے ہیں:

قمریں نین تیرے ساحر ہوئے ہموں کوں　　　گمراہ کر بھلاوے قوس قزح بھوں کو

پیچوں بھریا زلف تج موجوں ڈبے موں
ہر لہو پرُ کرشمہ عشاق کے ریجھن کوں

تیسری نظم "رموز السالکین" ہے، جس میں وحدت الوجود، نور د روح اور دل و نفس پر بحث کی گئی ہے۔ اس نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

اللہ پاک منزہ ذات
اُسوں صفتاں قائم سات
علم، ارادت، قدرت، بار
سنتا، دیکھتا، بولنہار
ایساں صفتاں سوں ہے ذات
جونکے چندنا چاند سنگھات

آخری دو شعروں میں کتاب کا نام اور شاعر کا تخلص دونوں آ گئے ہیں۔

ناؤ رموز السالکین سالک پھر دیکھ لاؤ یقین
حق کی راہ میں پکڑ یقین کیوں نا اس کو ہوئے امین

ان کے علاوہ اور کئی نظمیں اور دوہرے بھی دیئے گئے ہیں۔ شاہ امین نے ریختہ میں بھی غزلیں کہی ہیں جن کی یہ خصوصیت ہے:

"ایک غزل تو بالکل اس زبان میں ہے، جسے ابتدا میں ریختہ کہتے تھے یعنی آدھا مصرع فارسی اور آدھا ہندی چنانچہ ایک غزل کے، جس کے عنوان پر "خیال ریختہ" لکھا ہے۔ چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:"

چرا مستغنی ہوا تو منجھتے اے پیارے
آیا وقت کدام آید کہ منج تج بیچ پروائیں
محض فریاد می دارم کہ تج سنگ میل اچھنے کو
امین گوید بیاں ہجر بن ساقی بنارائیں

شاہ امین کی نثر کے رسالوں پر جو رائے ظاہر فرمائی ہے اس کا اقتباس یہ ہے:

"شاہ صاحب نے بعض رسالے نثر میں بھی لکھے ہیں۔ ایک چھوٹا رسالہ "گفتار حضرت شاہ امین" کے نام سے ہے، جس میں تصوف کے بعض مسائل اور اصطلاحات

کی تشریح کی ہے۔ ایک دوسرا مختصر رسالہ "گنج مخفی" نام کا ہے۔ اس میں شاہد و مشہود کی بحث کی ہے"۔

عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے:

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنے چاہا، اوّل اس میں سوں ایک نظر نکلی، سو اس سے اپن دیکھ ہوا۔ اپن شاہد کہتے ہیں، یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔ ذات نے آپس کو دیکھا، اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

رسالہ اُردو اپریل سنہ ۱۹۲۸ء میں "قدیم اُردو" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اردو نثر کی ایک بہت قدیم کتاب "شرح تمہید ہمدانی" کا تعارف کرایا گیا ہے۔ سب سے پہلے حضرت شاہ میراں حسینی کے حالاتِ زندگی پر مفید معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ شاہ صاحب حیدر آباد دکن سے بیجاپور گئے اور حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ کی مریدی کا شرف حاصل کیا۔ مدتوں کی ریاضت کے بعد مرشد کی اجازت سے اپنے وطن لوٹے اور مرتے دم تک حیدر آباد دکن ہی میں رہے۔ بابائے اُردو کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۰۷۴ھ میں انتقال فرمایا۔

"شرح تمہید ہمدانی" کی اہمیت بابائے اردو کی اس تحریر سے واضح ہو جاتی ہے:

"افسوس کہ تذکروں میں کہیں ان کی تصنیف کا ذکر نہیں حالانکہ ہمارے نقطۂ خیال سے ان کی بڑی کرامت یہ ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب کے مولّف ہیں جو اُردو ادب کی تاریخ میں قدر و منزلت کے لائق ہے۔ اس کتاب کا نام "شرح تمہید ہمدانی" یا "شرح شرح تمہید" ہے۔ اس کتاب کی حقیقت بتانے سے پہلے "تمہید ہمدانی" کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پاس اس کے دو نسخے ہیں۔ ایک میں اس کا نام "شرح تمہید ہمدانی" ہے، اور دوسرے میں جو زیادہ قدیم (بلکہ مصنّف کے زمانے کا ہے) "شرح شرح تمہید" لکھا ہے۔ جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ حضرت بندہ نواز کی شرح تمہید کی شرح یا اس کا ترجمہ ہے۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی شرح کا ترجمہ یا کوئی جدید شرح نہیں بلکہ اصل "تمہیدات" کا دکھنی ترجمہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سب سے قدیم نسخے میں سنہ کتابت سنہ 1012ھ لکھا ہے جو یقیناً مؤلف کے زمانہ کا لکھا ہوا ہے کیونکہ کاتب اپنے آپ کو "خادم درگاہ فلک بارگاہ" لکھتا ہے۔ دوسرے نسخے کی کتابت سنہ ۱۰۶۷ھ کی ہے۔ سنہ ۱۰۱۲ھ کی کتابت

سے یہ ظاہر ہے کہ اس وقت یہ اردو نثر کی سب سے قدیم کتاب ہے۔"

جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس دور کی زبان کا اندازہ حسب ذیل عبارتوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے:

"خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قاضی عین القضات کوں کہے کہ تمیں کئے سو کتاب مُنجے دکھلاؤ۔ تو کتاب دیکھ کر بہوت خوش ہوئے ہور کہے کیا خوب بیان میرے نور کا ہور خدا کے نور کا کئے۔ ہور اے کہنا بھی میرا چہ ہے، ہور ظاہر شریعت کا کہنا بھی میرا چہ ہے!" "اے عزیزاں، اے بات نیں سنیاں، بادشاہاں گھوڑا مستعد کیے باج نہیں سوار ہوتے۔ ہور گھوڑے میں کچ کھوڑا چھپے تو بھی قبول نہیں کرتے یعنی پیر کے عشق میں پختا ہوئے باج خدا کے عشق میں نہ آسکسی ہور دیکھ نہ سکسی اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلوقے مہیّا کن۔ اس کا معنا خدا کی پچھانت کامل میں تو اوّل اپنی پچھانت کر۔"

رسالہ اُردو بابت جولائی سنہ ۱۹۲۹ء میں "قدیم اُردو" کے عنوان سے حسن شوقی پر ایک پر مغز مقالہ تحریر فرمایا ہے جو (۲۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ حسن شوقی عادل شاہی دور کا شاعر ہے جو سلطان محمد عادل شاہ کے عہد میں زندہ تھا۔ اس مقالے سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

"افسوس ہے کہ اس کا حال مجھے کسی تذکرے میں نہیں ملا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اپنے زمانے کے مشہور شعراء میں سے تھا۔ چنانچہ ابن نشاطی نے اپنے قِصّہ "پھول بن" کے آخر میں جہاں چند مشہور اور نامور دکنی شعراء کا ذکر کیا ہے، وہاں حسن شوقی کا نام بھی لیا ہے:

حسن شوقی اگر ہوتا فی الحال
ہزاراں بھیجتا رحمت منج اپر آل

"پھول بن" کا سنہ تصنیف ۱۰۶۶ھ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حسن شوقی کا انتقال ہو چکا تھا۔"

"علاوہ غزلیات کے مجھے حسن شوقی کی دو نظمیں ملی ہیں۔ ایک "فتح نامہ نظام شاہ یا ظفر نامہ نظام شاہ" اور دوسری "میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ" فتح نامے یا ظفر نامے کے میرے پاس دو نسخے ہیں۔"

اس نظم میں حسن شوقی نے ایک جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ بابائے اُردو نے بہ غائر مطالعہ کرنے کے بعد اس نظم کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ اس جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"شوقی نے اس جنگ کا حال شاعرانہ طرز پر لکھا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا نام "فتح نامہ نظام شاہ" کیوں رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو حسین نظام شاہ کو رام راج بہت ذلیل کر چکا تھا، اور وہ انتقام کی فکر میں تھا۔ دوسرے نظام شاہ نے اس جنگ میں بڑی دلیری اور شجاعت دکھائی۔۔۔۔۔ اس لحاظ سے بھی فتح کا سہرا نظام شاہ ہی کے سر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ شوقی نے اس فتح کو نظام شاہ سے منسوب کیا اور اپنی نظم کا نام "فتح نامہ نظام شاہ رکھا"

اِس موضوع پر بابائے اُردو کے اور کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔[1]

(۱) شاہ علی محمد جیو گام دھنی (گجری زبان کا ایک قدیم شاعر) مطبوعہ رسالہ اُردو جولائی ۱۹۲۸ء

(۲) میاں شیخ خوب محمد چشتی (گجری زبان کا ایک قدیم شاعر) مطبوعہ رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۹ء

(۳) غواصی (گولکنڈہ کا ملک الشعراء) مطبوعہ رسالہ اُردو اپریل ۱۹۳۰ء

(۴) عشرتی (گولکنڈہ کا ایک قدیم شاعر) مطبوعہ رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۱ء

(۵) ملّا نصرتی (بیجاپور کا ملک الشعرا) مطبوعہ رسالہ اُردو جنوری ۱۹۳۴ء

(۶) علی نامہ (ملّا نصرتی کی مثنوی) مطبوعہ رسالہ اُردو اپریل ۱۹۳۴ء

(۷) تاریخ اسکندری (ملّا نصرتی کی مثنوی) مطبوعہ رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۴ء

اُردوئے قدیم کی جو کتابیں بابائے اُردو نے مرتب کر کے انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کروائیں ان کے نام یہ ہیں:

(۱) قطب مشتری (۲) سب رس (۳) نصرتی (۴) گلشن عشق (۵) اُردو کے نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ۔

---

[1] حال ہی میں انجمن ترقی اُردو کراچی کی طرف سے یہ سارے مضامین قدیم اُردو کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر رفیعہ سُلطانہ

# ڈاکٹر عبُدالحق کے تحقیقی کارنامے

حکایت از قدآں یار دِل نواز کنیم          بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

"بابائے اُردو" کو لوگ اُردو کے خدمت گذار اور عاشقِ راز کی حیثیت سے جتنا جانتے ہیں، اُتنا "محقق" کی حیثیت سے نہیں۔ سچ پوچھئے تو بابائے اُردو کا بڑا کارنامہ اُردو ادب کے اُن شعراء اور مصنّفین کو زندگی عطا کرنا ہے جو معنوی طور پر مر چکے تھے۔ اس طرح وہ اُردو کے " بابا " ہی نہیں "مسیحا" بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنی تحقیقات سے کئی مُردوں کو زندہ کیا، کئی جاں بہ لب مریضوں کو چنگا کیا۔ ان کی بے گور و کفن لاشوں کو منزلِ مقصود پر پہنچایا اور اُردو کے جسدِ بے جان میں زندگی کی روح پھونکی۔ اُردو کا قدیم دور، ان ہی کی تحقیقات کی بدولت زندہ ہے۔ مولوی صاحب کی ذات ہزار شیوہ اور ہزار رنگ ہے۔

انہوں نے انشائیے بھی لکھے، سیرت نگاری بھی کی۔ تنقیدیں بھی کیں، لسانیاتی بحثیں بھی چھیڑیں۔ تراجم بھی کئے۔ وُہ لغت اور قواعد نگاری کے بھی رمز آشنا ہیں، لیکن تحقیق کا پلّہ سب پر بھاری ہے۔ اُن کی تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسی " لچک " ہے کہ وہ ہر زمانے میں زندہ رہ سکتی ہے۔ حالانکہ تحقیق میں "حرفِ آخر" نہیں ہوتا، کیونکہ "سب کچھ" کہنے کے بعد بھی "بہت کچھ" کہنے کی گنجائش باقی رہتی ہے، اور پچھلے نظریے باطل ہو سکتے ہیں۔ مولوی صاحب آنے والوں کے لیے بہت کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رکھتے۔ وُہ اپنے موضوع کا پوری طرح مطالعہ کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ اُن کی تحقیق اتنی جامع ہوتی ہے کہ پھر مزید تحقیق کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

ان کی تحقیقات، اُردو زبان کے متعلق بھی ہیں اور ادب کے تعلّق سے بھی۔ دونوں

ہیں ان کا طریقہ استخراجی (Inductive) بھی ہے اور اشتقاقی (Derivative) بھی، یعنی وہ اندرونی اور بیرونی دونوں شواہد (Evidences) سے کام لیتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ تحقیق میں یبوست یعنی "خشکی" نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی تحقیقات "محقق" اور "منتظم" سے قطع نظر، عام آدمی (Lay man) کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ ان کے پیش رو اور مابعد کے محققین میں بھی، بجز چند کے، بہت کم ہیں، یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ حالی اور آزاد کے پاس شگفتگی ہے۔ لیکن دقتِ نظر نہیں شبلی کے پاس دقتِ نظر ہے، لیکن شگفتگی کا فقدان ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحقیق، حالی اور شبلی دونوں کا سنگم ہے۔ وہ اپنے اسکول کے آپ بانی ہیں؛ اس میں شک نہیں کہ "عبدالحق اسکول" کا اثر زیادہ تر، جامعہ عثمانیہ ہی کے اساتذہ پر پڑا۔ جنہوں نے میںجاٹے اُردو سے فیض حاصل کیا۔ یوں تو مولوی صاحب کے تحقیقاتی کارناموں کی فہرست طویل ہے، لیکن مضامین سے قطع نظر، میں یہاں صرف مستقل تصانیف کا ذکر کرونگی۔ اُن کی مستقل تصانیف میں ذیل کے نوادر قابل قدر ہیں:

(۱) اُردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام (۲) مرحوم دہلی کالج (۳) نصرتی۔ (۴) مُقدّمہ قطب مشتری (۵) سب رس (۶) مُقدّمہ باغ و بہار (۷) مُقدّمہ معراج العاشقین۔ (۸) قواعد اُردو (۹) مقدّمہ گلشن ہند (۱۰) مُقدّمہ خطبات گارساں دتاسی (۱۱) مرہٹی کا اثر فارسی زبان پر۔

**اُردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام:** مولوی صاحب کی یہ تصنیف بیک وقت سیرت بھی ہے۔ تذکرہ بھی اور ٹھوس تحقیق بھی نہ صرف یہ اُردو کے آغاز پر روشنی ڈالتی ہے، بلکہ لسانیاتی پہلو سے بھی یہ بہت اہم کارنامہ ہے۔ کیونکہ اس میں نہ صرف اُردو کے ابتدائی "روپ" نظر آتے ہیں بلکہ مسلمانوں کی آمد کے بعد کے ہندوستان کی سماجی و معاشی حالت سے بھی آگہی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ان میں ان بزرگوں کی حیات کی تفصیلات بھی ملتی ہیں، جنہوں نے اہل بھارت کے ذہنوں کو روشنی بخشی اور ایک نئے سماج کی تعمیر کی۔ تاریخی اعتبار سے یہ کافی اہم ہے۔ کیونکہ اس نے اُردو کی قدامت کو مستحکم کر دیا۔ مواد جمع کرنے کے لیے مولوی صاحب نے کس قدر محنت کی، اس کے ہر ورق سے ظاہر ہے۔ نہ صرف انہیں تواریخ کا مطالعہ کرنا پڑا بلکہ بزرگانِ دین کے ملفوظات اور تصانیف کو بھی کھنگالنا پڑا جن کا ذکر اس کتاب میں

کیا گیا ہے۔ اس تصنیف نے اُردو کے آغاز کے پُرانے نظریوں کو بھی باطل کر دیا۔ کیونکہ مولوی صاحب نے نویں اور دسویں صدی عیسوی کے نمونے فراہم کئے اور اُردو کی اشاعت کے ایک اہم ادارہ ( Institution ) (یعنی صوفیا کی مساعی) کو بیان کیا ہے۔

**سب رس:** دوسرا اہم کارنامہ دکھنی شاعر وجہی کی تصنیف "سب رس" ہے۔ مولوی صاحب نے ہی دکھنی دور کو کھوج کر نکلا اور ثابت کیا کہ دکھنی دراصل اُردو ہے۔ ورنہ بہت سے عالموں کو، دکھنی کو اُردو ماننے میں تامل تھا جن میں علامہ نیاز فتح پوری بھی شامل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دکھنی سے اُردو کا ڈانڈا ملانا ایسا ہی ہے، جیسا کہ انسان کو بندر کی ارتقا یافتہ شکل بتانا۔ یہ مولوی صاحب ہی کی تحقیق اور تجسّس تھا، جس سے دکنی دور کا پورا ادبی سرمایہ فراہم ہو سکا۔ اُن کے جلائے ہوئے دیوں کو اُن کے جانشینوں ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری اور پروفیسر سید محمد صاحب نے فروزاں و تاباں کیا۔

"سب رس" مولوی صاحب کی تحقیق کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ سب سے پہلے مولوی صاحب نے کتاب کا ماخذ ڈھونڈا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وجہی کا اپجی کارنامہ نہیں بلکہ فارسی قصہ "حسن و دل" کے مختلف نسخوں سے جن میں نظم و نثر دونوں اصناف شامل ہیں۔ بحث کی ہے۔ بعد میں وہ وجہی کے زمانے اور اس کے حالات کی تحقیق، اسی تصنیف کے اندرونی شواہد (Internal Evidence) سے کرتے ہیں۔ آخر میں نفس قصہ سے بحث کی ہے، جو فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کی حامل ہے۔ یہ بحث بہت دلچسپ ہے۔ ساتھ ہی مولوی صاحب کا اندازِ بیان اتنا شگفتہ اور سلیس ہے کہ تحقیق کی خشکی محسوس نہیں ہونے پاتی۔

**مُقدّمہ قطب مشتری:** اس کے بعد مولوی صاحب نے اسی مُصنّف کی دوسری تصنیف "قطب مشتری" کا سراغ لگایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قطب مشتری بیک وقت تحقیق بھی ہے، اور تنقید بھی۔ کیونکہ فرہنگ میں انہوں نے متروک دکنی الفاظ کی شرح کی ہے، بلکہ نظم کے محاسنِ شعری کی وجہی کے نُقطۂ نظر سے وضاحت بھی کی ہے۔ یہ اتنی جامع ہے کہ بعد کے آنے والے علما اور مُتعلّم، شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔

**نصرتی:** دکنی دور ہی کے متعلق ان کا معرکۃ الآرا تحقیقی کارنامہ "نصرتی" ہے۔ جس میں

نصرتی کی شاعری کے جملہ اصناف، قصاید، مثنوی، غزل، رباعی، مرثیوں وغیرہ کا جائزہ لیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس عہد کے بہت سے واقعات کی تفصیل بھی اسی کی تصانیف کے حوالے سے دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کے لیے انہیں پورے عادل شاہی دور کی تواریخ ............ اور معاصر شعرا کے کارنامے دیکھنے پڑے ہوں گے۔
غرض مولوی صاحب کی ایک ادنیٰ تصنیف بھی کئی سو کتابوں کے مُطالعے، تفحّص و تحقیق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس محنت و کدوکاوش کی قیمت کو پُر لطف اندازِ بیان اور بڑھا دیتا ہے۔ مثلاً "سب رس" کے دیباچہ میں وجہی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ملّا صاحب نے بظاہر تو اسے ایسے پیش کیا ہے کہ جیسے ان کی تصنیف ہو، لیکن دراصل یہ ........ فارسی مُصنّف کا ترجمہ ہے۔"

**مرحوم دہلی کالج:** بھی اسی نوعیت کی تحقیق ہے۔ اس میں مولوی صاحب نے انگریزوں کی آمد کے فوری بعد کے نثری اور علمی کارناموں کا اور اُن مُصنّفین کا حال بیان کیا ہے، جنہوں نے اُردو میں ٹھوس کارنامے پیش کئے۔ مثلاً ماسٹر رام چندر جنہوں نے پہلی مرتبہ اُردو میں ریاضی جیسے مشکل فن کو روشناس کروایا۔

**تذکرہ گلشنِ ہند:** مرزا علی لُطف کا تحریر کردہ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے مُصنّفین میں شامل تھے۔ اِس پر مولوی صاحب نے بڑی دقّت اور محنت سے پیش لفظ لکھا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مُصنّف کی کوتاہیاں اور لغزشیں بھی واضح کی ہیں۔ مُصنّف نے جہاں کسی شاعر یا ادیب کے حالات میں غلطی کی، وہاں مولوی صاحب نے دوسرے تذکروں سے مقابلہ و موازنہ کرکے اصلاح کی ہے۔ اسے اُردو میں تحقیق در تحقیق کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اُنہوں نے صرف مواد کی پیش کش پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مواد کو بھی کھوجا اور جانچا ہے۔

**مُقدّمہ معراج العاشقین:** ان سب سے اہم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے قلمی رسالے معراج العاشقین کی دریافت اور اس کی اشاعت ہے۔ خواجہ صاحب کے اُردو رسائل کے متعلق بڑے شبہات کا اظہار کیا جاتا تھا، خود مولوی صاحب نے بھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ

ڈرتے ڈرتے اِس گتھی کو سُلجھایا ہے۔ مگر ان کا قیاس ہی آنے والے علماء کے لیے "یقین" بن گیا، اور اُردو کے تسلسل کی ابتدائی کڑیاں جو گم گشتہ تھیں، پھر سے جُڑ گئیں۔ ورنہ بعض انگریز اور بنگالی علماء کی تحقیقات نے اُردو کی ابتدا کو بہت پیچھے لا ڈالا تھا اور وہ کھڑی بولی کے روپ، ہندی کا مابعد روپ سمجھی جاتی تھی۔ کم از کم اس سے یہ مُسلّم ہو گیا کہ کھڑی بولی کے دو علیحدہ علیحدہ ارتقا پائے ہوئے روپ اُردو ہندی ہیں۔ کیونکہ ان کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا یہ نہیں کہ ہندی کے بعد اُردو کا ارتقا ہوا۔ یہ دریافت بجائے خود ایک عظیم تحقیق تھی جس نے دوسروں پر تحقیق کے راستے کھول دیئے۔

**مُقدمہ باغ و بہار:** قصہ چہار درویش کا ایک ترجمہ عطا حسین خاں تحسین نے "نوطرزِ مُرصع" کے نام سے کیا تھا لیکن یہ اپنے مُرصّع اسلوب کی وجہ سے مقبول نہیں ہو سکا۔ میرامن نے سلیس اور بامحاورہ اسلوب میں لکھ کر جدید نثر کی گویا داغ بیل ڈالی۔ اس طرح مولوی صاحب نے اس کتاب کو شائع کر کے نثر کے سادہ اسلوب کو رواج دیا۔ ساتھ ہی وہ اُردو، ہندی کے تعلق سے بڑی پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔

**نکاتُ الشعراء:** میر کے تذکرہ پر مولوی صاحب کی تحقیق اپنی نوعیت کی آپ ہے۔ اس میں بھی تحقیق پر تنقید کا رنگ غالب ہے۔ میرؔ نے جن شعراء کا تذکرہ اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ مولوی صاحب نے مقدمہ میں ان لکھنے والوں کے متعلق بھی اشارے کئے۔ ساتھ ہی میر کے زمانے اور ان کے حالاتِ زندگی کو بڑی محنت سے یکجا کیا۔ اِس تذکرے کے علاوہ مولوی صاحب نے قدیم شعراء کے اور بھی کئی تذکرے چھاپے۔ ادب کے علاوہ اردو زبان کی قواعد کی تدوین مولوی صاحب کا شاندار تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں اُردو حروف تہجی، اُردو افعال اور اُردو صرف و نحو کا جس طرح مولوی صاحب نے مطالعہ کیا ہے، وہ اُردو لسانیات کے مُتعلّم کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اس کے بعد، یوں تو بہت سی قواعدیں لکھی گئیں لیکن سب قواعد نویسوں نے اس کی خوشہ چینی کی اور ان ہی کے فراہم کردہ مسالہ سے عمارت تعمیر کی۔ اسی نوعیت کی تصنیف "مرہٹی کا اثر فارسی زبان پر" ہے، جو بڑا اچھا لسانیاتی مطالعہ ہے۔ "خطباتِ عبدالحق" میں اکثر جگہ مولوی صاحب نے محققانہ

رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ بھی اُردو کے تحقیقاتی ادب کے سلسلے کی اہم کڑی ہے مولوی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ نہ صرف وہ خود تحقیق کے رسیا ہیں بلکہ اپنے طالب علموں میں بھی تحقیق کی لگن، لگا دیتے ہیں۔ اس کی مثال مرحوم شیخ چاند، پروفیسر عزیز احمد، ہاشمی فرید آبادی ڈاکٹر یوسف حسین خاں ہیں۔ متذکرہ بالا اصحاب بھی میدان تحقیق میں یکتا ہیں۔

مختصراً اُردو زبان جب تک زندہ رہے گی اس کے متعلم، اس محقق اعظم کو فراموش نہیں کر پائیں گے جس نے اُردو کو نہ صرف آن بخشی بلکہ "جان" بھی دی اور صحیح معنوں میں وہ مسیحا ہے۔

---

"اُردو کے محسنوں اور مخلص خادموں کی فہرست مختصر نہیں، اچھی خاصی طویل ہے سینکڑوں ناموں سے متجاوز اور خدمات کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک ـــــ پھر بھی اگر مجموعی طور پر کسی ایک کو محسنِ اعظم کا لقب دیا جا سکتا ہے تو وہ ذات بلا اختلاف بابائے اُردو عبدالحق ہی کی ہو سکتی ہے"

ـــ مولانا عبدالماجد دریابادی

# مُقدّمات

"مولوی عبدالحق صاحب اپنے موضوع پر قلم اُس وقت اُٹھاتے ہیں جب کہ اس پر پورا عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ نہ صرف کتاب پر بلکہ مصنّف پر اور موضوعِ کتاب پر۔ اس لیے یہ سہ گانہ پہلو روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتے ہیں۔ جس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے۔ اس کے موضوع پر، اس کے مطالب پر ایسی محققانہ بحث کی ہے کہ بعض اوقات مقدمہ کتاب سے بہتر فیصلۂ موضوع کر گیا ہے۔ . . . بیان وہ ہے جس میں صفائی ہے، محاورہ ہے، ادب ہے، زور ہے۔ اور۔ ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، مقدمہ لکھتے نہیں لڑاتے ہیں۔ ان تمام اوصاف کی وجہ سے بیانِ دل آویز بھی ہے اور غور آفریں بھی۔"

(۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

ڈاکٹر عبادت بریلوی

# مقدّماتِ عبدُالحق کا مرتبہ

اُردو ادب میں "مقدّماتِ عبدُالحق" کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وُہ مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ ظاہری اور معنوی اعتبار سے اُن کی اہمیت مُسلّم ہے۔ وہ اُردو ادب میں کئی لحاظ سے اضافہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ اُن کے موضوعات بھی مختلف اور متنوع ہیں۔ اُن میں خیالات و نظریات کی رنگا رنگی اور افکار و تصورات کی بوقلمونی ہے، لیکن اس کے باوجود زندگی اور ادب دونوں کے پرستاروں کے لیے اُن میں دلچسپی کا بڑا سامان ہے۔ اُن میں زندگی اور اُس کے مختلف پہلوؤں کے بہت سے اَسرار اور رموز کھُلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زبان و لِسان کے بعض اہم اور پیچیدہ معاملات و مسائل کی گتھیاں سلجھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور شعر و ادب کے اَن گِنت رموز و نکات کی تہوں کے کھلنے کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں بڑی وسعتیں ہیں۔ بڑی ہی گہرائی اور گیرائی ہے۔ کہنے کو تو یہ مقدمے ہیں، لیکن اِن میں سوانح اور سیرت نگاری کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ادبی اور لِسانی تحقیق و تفتیش کا بھی ان میں کمال نظر آتا ہے۔ ادبی تنقید اور تبصرہ نگاری بھی ان میں اپنے شباب پر دکھائی دیتی ہے، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں جگہ جگہ خود لکھنے والے کی عظیم شخصیت کا عکس بھی اپنا جلوہ دکھاتا ہے، اور یہ ان مقدمات کی شاید سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان میں ایک عظیم انسان، ایک عظیم محقق، ایک عظیم ماہر لسان، ایک عظیم نقاد اور ایک عظیم قومی رہنما کے دل کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔ جن مختلف اور متنوع موضوعات پر یہ مقدمات لکھے گئے ہیں، اُن پر اُردو زبان میں خاص کام ہو چکا ہے، اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے، لیکن یہ مقدمات اِن

موضوعات کو جس طرح پیش کرتے ہیں، اور اُن کے مختلف پہلوؤں پر جس طرح روشنی ڈالتے ہیں اُس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔

اُردو تو کیا، کسی اور زبان میں بھی، کسی ایک شخص نے، اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر اتنی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ ایسے بلند پایہ مقدمے نہیں لکھے۔ بابائے اُردو کے مقدمات اس اعتبار سے منفرد ہیں اور اُن میں واقعی ایک انفرادی شان نظر آتی ہے۔

مقدمہ نگاری ایک فن ضرور ہے۔ اُس کے کچھ بنیادی اصول بھی ہیں۔ ان اصولوں کا اُس میں خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ بعض لوازم و عناصر کے مجموعی امتزاج سے اس فن کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔ یہ لوازم و عناصر اُس میں پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مقدمہ نگاری کی حیثیت کسی مستقل صنفِ ادب کی نہیں ہے۔ کسی زبان کے ادب میں بھی اُس کو ادب کی ایک باقاعدہ شاخ نہیں سمجھا گیا ہے کیونکہ مقدمے تو کسی مُصنف یا کسی کتاب کے بارے میں محض تعارف کے طور پر لکھے جاتے ہیں، اور عام طور پر اُن کا انداز کچھ رسمی سا ہوتا ہے۔ اکثر تو وہ کسی کے کہنے سے یا کسی کی فرمائش پر لکھے جاتے ہیں۔ اسی لیے اُن میں وہ بات نہیں ہوتی جو کسی ادبی تصنیف کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ بابائے اُردو کے مقدمات میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ کسی کی فرمائش پر محض رسمی انداز میں نہیں لکھے گئے ہیں۔ ایک لگن اور ایک دُھن نے یہ مقدمات اُن سے لکھوائے ہیں۔ ایک والہانہ جذب و شوق ان مقدمات کی تخلیق کا محرک ہوا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، اُردو زبان اور ادب کے عالم ہی نہیں عاشق بھی ہیں، اس زبان اور ادب میں جو بھی اہم کام ہوتا ہے، اُس کو وہ تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

اور اُس کے مرتبے کو متعین کرنے میں انہیں خاص طور پر خوشی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ ان موضوعات پر اپنے مقدمات میں دل کھول کر اظہار خیال کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اُن کے بیشتر مقدمات اُردو زبان اور ادب ہی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ہیں، اور ان پہلوؤں سے غیر معمولی دلچسپی ہی نے اُن کے یہاں

ان مقدمات پر لکھنے کا خیال پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اُن کے بیشتر مقدمات زبان اور ادب کے انہیں پہلوؤں سے متعلق ہیں، اور ان میں بڑی ہی بصیرت افروز باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اُردو زبان اور ادب کے علاوہ انہوں نے جن موضوعات پر مقدمات لکھے ہیں، اُس کا محرک اُن کا علمی میلان ہے۔ لیکن یہ علمی میلان محض کتابی نہیں ہے۔ وہ انسانی زندگی کو دیکھنا اور اُس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہی خواہش اُن کے یہاں ایسے مقدمات کی تخلیق کا باعث بنی ہے، جن کا موضوع اُردو زبان اور ادب نہیں ہے، بلکہ انسانی زندگی کے عام معاملات ہیں۔ وہ ان معاملات کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ان موضوعات پر مقدمات میں اظہار خیال کو ضروری سمجھا ہے، اور اس سلسلے میں بڑی ہی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ غرض یہ مقدمات چاہے، اُن کے موضوعات کچھ بھی ہوں، محض لکھنے کی خاطر نہیں لکھے گئے ہیں۔ کسی نے زور دے کر انہیں نہیں لکھوایا ہے۔ ان میں فرمائش اور اثر و رسوخ کو مُطلق دخل نہیں ہے۔ اسی لیے ان میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں، جو مقدمہ نگاری کے فن کے لیے ضروری ہیں ان میں لگی لپٹی باتیں نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے دوٹوک بات کہنے کا انداز ہے۔ زیر نظر موضوع پر متوازن طریقے سے اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے کہ کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ جذبات کو اظہار خیال میں ذرا بھی دخل نہیں۔ برخلاف اس کے عقل و شعور پر ان کی بنیادیں استوار نظر آتی ہیں۔ اسی لیے ہر جگہ ایک منطقی زاویۂ نظر ملتا ہے۔ ان پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے وہ تفصیل اور جزئیات میں ضرور جاتے ہیں۔ لیکن اس تفصیل و جزئیات میں دلچسپی کا بڑا سامان ہوتا ہے، اور اس کے پڑھنے والے کو بڑی روشنی ملتی ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان مقدمات میں جو انداز و اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ حد درجہ شگفتہ اور شاداب ہے، یہی وجہ ہے یہ مقدمات دماغ ہی کو متاثر نہیں کرتے، دِل پر بھی ان کا اثر ہوتا ہے اور اس طرح ان تمام خصوصیات کے مجموعی امتزاج سے ان مقدمات میں وہ لوازم اور عناصر رونما ہو جاتے ہیں، جن کے ہاتھوں مقدمہ نگاری کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ بابائے اُردو نے یہ مقدمے

لِکھ کر واقعی مقدمہ نگاری کو اپنا فن بنا دیا ہے اور اس طرح اِسے
ایک مستقل حیثیت دے دی ہے۔

یہ مقدمات تعداد میں بھی خاصے ہیں۔ ان کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اردو ادب کی عظیم ترین شخصیت ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہیں۔ اس عظیم شخصیت نے اُردو زبان اور ادب پر جتنا کام گزشتہ نصف صدی میں کیا ہے، کئی شخصیتیں مل کر بھی اِتنا کام نہیں کر سکتیں۔ انہوں نے لِسانی معاملات پر تحقیق کی ہے۔ زبان کے اُصول و قواعد مرتب کئے ہیں۔ لُغات لِکھی ہیں۔ قدیم ادب کا سراغ لگایا ہے۔ پرانے شعراء کے دیوان مرتب کئے ہیں۔ شعراء کے تذکروں کو ترتیب دیا ہے۔ نثر کی قدیم سے قدیم کتابیں تلاش کی ہیں، اور ان کا صحیح متن تیار کیا ہے، اور چھپتے وقت ان سب پر مقدمے لکھے ہیں۔ ان مقدمات کا اصل مقصد تو تعارف تھا لیکن اس میں تحقیق اور تنقید کے پہلو بہت نمایاں ہو گئے ہیں۔

اِس تحقیقی اور تنقیدی کام نے بابائے اُردو کو زبان اور ادب کا سب سے بڑا عالم اور محقق ثابت کر دیا، اور اُن کی یہ عظمت تسلیم کر لی گئی۔ چنانچہ زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر کام کرنے والوں نے جب بھی کوئی کام کیا تو ان میں سے ہر ایک کے دِل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اُن کا کام مولوی عبدالحق صاحب کے تعارف کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ چنانچہ اُنہوں نے ان کاموں میں سے جن کو اہم سمجھا، اُن پر مقدمات کی صورت میں اظہارِ خیال کیا، اور اس طرح ایسے مقدمات بھی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے جو انہیں اپنے بعض ہم عصروں کی کتابوں پر لکھنے پڑھنے۔ اس زمانے میں زبان اور ادب میں جو رُجحانات پیدا ہوئے اور علمی تعلیمی اداروں میں جو تحریکیں شروع ہوئیں، انھوں نے بھی بعض تصانیف کو جنم دیا۔ ظاہر ہے کہ ان پر بھی مولوی عبدالحق صاحب ہی کو مقدمے لکھنے پڑے۔ اس طرح گزشتہ پچاس ساٹھ سال میں مختلف موضوعات پر بابائے اُردو کے مقدمات کی خاصی تعداد جمع ہو گئی، اور انھوں نے بہت تھوڑے عرصے میں نہ صرف اپنی اہمیت تسلیم کرالی بلکہ اُردو کے تحقیقی اور تنقیدی ادب میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔

ان میں سب سے اہم تو وہ مقدمے ہیں جو خود اُن کی مُرتب کی ہوئی کتابوں پر لکھے گئے

ہیں۔ یہ کتابیں اُردو کے قدیم کلاسیکی ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ان پر مقدمے لکھ کر نہ صرف ان کا تعارف کرایا ہے۔ بلکہ تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے ان پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ جن مصنفوں نے یہ کتابیں لکھی ہیں، اُن کے حالات، شخصیت ماحول اور ادبی مرتبے کے تمام خط و خال واضح ہو جاتے ہیں۔ اُن مصنفوں کے بارے میں جتنا مواد مولوی صاحب نے فراہم کیا ہے، اُس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ اِس مواد سے نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بعض اہم انکشافات ہوتے ہیں۔ مصنف کے صحیح حالات کا پتہ چلتا ہے، اُس کے ماحول کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں، اور اُس کی تصانیف کی ادبی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا سادہ لیکن پُرکار اسلوب، اس بیان میں بڑی دلکشی اور دِل آویزی پیدا کر دیتا ہے چنانچہ اُن کے یہ بیانات نہ صرف عالموں، ادیبوں اور ادب کے طالب علموں کے لیے دلچسپ ہو جاتے ہیں، بلکہ عام آدمی بھی اِن سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بابائے اُردو اِس سلسلے کی تمام تفصیل و جزئیات کو زندگی کا جزو بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اِسی لیے اُن کے یہاں خاص تحقیقی باتیں بھی دلچسپ بن جاتی ہیں۔ نام نہاد محققوں کا یہ عام انداز ہوتا ہے کہ وہ بے شمار حوالوں سے پڑھنے والے کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ سیدھی سادی باتوں پر بھی اسی طرح حاشیے لکھتے ہیں کہ اصل موضوع پس منظر میں جا پڑتا ہے، اور اس طرح ان کی تحریر جس کو وہ خود تحقیق کا شاہکار سمجھتے ہیں، پڑھنے والے کے لیے گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے۔

> بابائے اُردو کے اِن مقدمات میں تحقیقی پہلوؤں پر بہت زور ہے۔ لیکن یہ عام تحقیقی تحریروں کی طرح اُلجھی ہوئی خشک، اور پراگندہ نہیں ہیں۔ ان میں توانا، سیدھا سادہ لیکن دِل موہ لینے والا انداز جادو سے جگاتا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو زبان کے سب سے بڑے غزل گو شاعر میر تقی میرؔ پر دو معرکہ آرا مقدمے لکھے ہیں۔ ایک تو اُن کے انتخابِ کلام پر ہے اور دوسرا میر کی خود نوشت سوانح حیات ذکرِ میر پر۔ یہ مقدمے آج سے برسوں پہلے لکھے گئے تھے لیکن ان میں میرؔ کی زندگی اور شاعری کے بارے میں جو بصیرت افروز باتیں ہیں، ان پر آج تک کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ حالانکہ میرؔ پر تحقیق و تنقید کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، اور بعض لوگوں نے بزعمِ

خود میرؔ صاحب کے بارے میں بڑا کام کیا ہے۔ لیکن بابائے اُردو نے اپنے مقدمات میں میرؔ پر جو کچھ لکھا ہے اُس کے سامنے اُن کی حیثیت کچھ بھی نہیں رہ جاتی۔ اس آفتابِ عالم تاب کے سامنے وہ محض ٹمٹماتے ہوئے چراغ معلوم ہوتے ہیں۔

میرؔ کے انتخابِ کلام پر جو مقدمہ اُنھوں نے لکھا ہے اُس کا آغاز میرؔ کے تعارف سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں "میر تقی میرؔ سرتاج شعرائے اُردو ہیں۔ اُن کا کلام اُسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔ جیسے سعدیؔ کا کلام فارسی میں۔ اگر دُنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میرؔ کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا۔ یہ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے مَوزونیٔ طبع کی وجہ سے یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کے لیئے شعر کہے ہیں، بلکہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے، اور جنھوں نے اپنے کمال سے اُردو کی فصاحت کو چمکا دیا اور زبان کو زندہ رکھا۔ شاعری میرؔ صاحب کی زندگی کا جُز تھی۔ گویا فطرت نے اُنھیں اسی سانچے میں ڈھالا تھا۔ اُن کا احسان اُردو زبان پر تاقیامت رہے گا، اور اُن کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہوگا کیونکہ اس میں وہ عالمگیر حُسن ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں"۔ اِس مختصر بیان سے میرؔ صاحب کی شاعرانہ شخصیت کی ایک مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اُس کے قدوقامت کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے، اور اُن کی شخصیت کے ساتھ ایک طرح کی موانست پیدا ہو جاتی ہے۔

چنانچہ اس موانست کو پیدا کرنے کے بعد وہ آگے بڑھتے ہیں۔ اور میرؔ صاحب کی زندگی کے بارے میں تحقیقی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ اس بحث سے میرؔ کی زندگی کے بارے میں نشیب و فراز کا علم ہو جاتا ہے لیکن یہ علم ذہن پر بوجھ نہیں بنتا۔ کیونکہ اُن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش اُس موانست کے ہاتھوں بیدار ہو جاتی ہے جس کو مقدمہ نگار مقدمے کے آغاز ہی میں پیدا کر دیتا ہے۔ میرؔ کے حالات بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے نکات الشعرا، گلزارِ ابراہیم اور گلشن ہند کے حوالے سے جو معلومات فراہم کی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ میرؔ صاحب اکبرآباد کے رہنے والے تھے، لیکن انھوں نے شاہجہاں آباد میں پرورش پائی۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ اُن کے دُور کے رشتے داروں میں تھے۔ میرؔ کے بُزرگ حجاز کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد کا نام میر علی متقی تھا،

اور وہ ایک گوشہ نشین بزرگ تھے، میر ابھی کمسن ہی تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا چنانچہ انھیں تلاشِ معاش کی فکر ہوئی۔ دِلّی میں صمصام الدولہ امیر الامراء سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ایک روپیہ روزانہ مقرر کیا لیکن وہ نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے۔ اُس کے بعد انھیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ اس سلسلے میں دِلّی سے باہر بھی جانا پڑا۔ بالآخر لکھنو چلے گئے اور وہیں ۱۲۲۵ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ یہ تمام واقعات تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کو بیان کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ "ذکرِ میر" سے زیادہ مُستند حوالہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ اس لیے" خواہ مخواہ" دوسرے حوالوں کی تلاش میں بھٹکے نہیں ہیں، اور ان حوالوں سے اپنی تحریر کو گرانبار نہیں کیا ہے۔ اس مقدمے کے آخری حصّے میں اُنھوں نے میرؔ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی بحث کی ہے، اور اس سلسلے میں بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں، اور بہت ہی جچے تلے انداز میں چند خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے میرؔ کے شاعرانہ مرتبے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "میرؔ صاحب کی شاعری اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے اُردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور اُن کی خاص ترتیب و ترکیب، زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر کا رُتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ میرؔ کے کلام میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں، اور اُس کے ساتھ ہی اُن کا کلام اتنا درد بھرا ہے کہ اُس کے پڑھنے سے دِل پر چوٹ سی لگتی ہے جو لُطف سے خالی نہیں ہوتی"۔ اور آگے چل کر میرؔ کے کلام کی وسعت اور ہمہ گیری پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے "جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اُس کے نیچے ہزاروں لہریں موج زن ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں، اُسی طرح اگرچہ میر صاحب کے الفاظ مُلائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن اُن کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا رہتا ہے۔" یہ تنقیدی فقرے میرؔ کے کلام کی بنیادی خصوصیات کو واضح کر دیتے ہیں اور یہی اُن کا مقصد بھی ہے۔

کم و بیش یہی انداز اُس مقدمے کا بھی ہے، جو انھوں نے میرؔ صاحب کی خود نوشت سوانح حیات "ذکرِ میر" پر لکھا ہے۔ اس میں پہلے میر صاحب کا مختصر سا تعارف ہے، اور

اور ایک شاعر کی حیثیت سے اُن کی اہمیت کی وضاحت ہے، پھر ادب میں آپ بیتی کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور لکھا ہے کہ "مورخ ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق و تلاش میں سر مارے، آپ بیتی کے لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اُس کے ایک بے ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں، جو مدتوں تاریخ کی ورق گردانی کے بعد بھی میسّر نہیں ہوتے۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے، اور کچھ کیا بھی ہے، اپنی آپ بیتی لکھ جایا کرے تو ادب کے خزانے میں یہ جواہرات انمول ہوں۔" ذکرِ میر "ایسا ہی انمول موتی ہے"۔ کیونکہ اس سے میرؔ کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہے، اور بہت سی باتیں جن کا لوگوں کو مُطلق علم نہیں تھا، ذکرِ میر سے واضح ہو گئی ہیں۔ اس کتاب میں اُس زمانے کے جو تاریخی اور سیاسی حالات بیان کیے گئے ہیں، اُن کی اہمیت کو خاص طور پر بابائے اُردو نے واضح کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اُس زمانے کی تاریخ کے لیے یہ کتاب ایک حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ میرؔ نے اس زمانے کی تباہی اور بربادی ہنگاموں اور پریشانیوں کا چشم دید حال لکھا ہے اور ذکرِ میرؔ میں نجی حالات سے زیادہ اِن پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔ بابائے اُردو نے میرؔ صاحب کے تاریخی شعور پر اپنے مقدمے میں خاص طور پر بحث کی ہے، اور انہیں ایک اعلیٰ درجے کا مورخ ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے اُن نئی باتوں کی وضاحت کی ہے جو ذکرِ میرؔ سے معلوم ہوتی ہیں۔ مقدمے کا یہ حصہ تحقیقی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے ذکرِ میرؔ کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرؔ کے والد کا نام میر عبداللہ نہیں بلکہ میر علی متقی ہے کیونکہ ذکرِ میرؔ میں ہر جگہ انھوں نے اپنے والد کا یہی نام لکھا ہے۔ پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ میر صاحب..... نجیب الطرفین سید تھے۔ خان آرزو سے میر صاحب کے تعلقات کی کشیدگی کا اصل سبب بھی انھوں نے معلوم کر لیا ہے۔ نکات الشعراء میں میرؔ نے خان آرزو کی جو تعریف کی ہے، اور ذکرِ میرؔ انھیں جو بُرا بھلا کہا ہے۔ اُس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ نکات الشعراء کی نوعیت چونکہ ذاتی نہیں تھی، اور خیال یہ تھا کہ وہ مختلف لوگوں کے ہاتھوں میں جائے گا اس لیے وہاں اس قضیے کو چھیڑنا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن ذکرِ میرؔ چونکہ آپ بیتی تھی، اس لیے وہاں اس کو لکھ کر خوب خوب اپنے دِل کی بھڑاس نکالی۔ میرؔ صاحب کے لکھنؤ جانے پر جو روشنی اس کتاب سے پڑتی ہے، اُس کی اہمیت کو بھی بابائے اُردو نے اس مقدمے میں واضح کیا ہے۔ اور آزاد نے آبِ حیات میں جو کچھ لکھا ہے،

اُس کی تردید کی ہے۔ اُن کی بد دماغی کو جس طرح بعض لوگوں نے مبالغے سے بیان کیا ہے، اُس کی اصل حقیقت بھی واضح کی ہے، اور ذکرِ میرؔ کے بعض حصّوں سے جس طرح میرؔ کی بعض نظموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اُس کا بھی ذکر کیا ہے۔ غرض اس کتاب کے جتنے اہم پہلو ہیں اُن میں سے کوئی بھی اُن کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ ایک ایک کرکے سب پر انھوں نے تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقدمے کو پڑھ کر نہ صرف اس کتاب کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ ہوجاتا ہے بلکہ میرؔ کی زندگی اور شخصیت کے تقریباً تمام پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی مقصد سے یہ مقدمہ لکھا گیا ہے۔

تحقیقی اعتبار سے بابائے اُردو کا شاید سب سے اہم مقدمہ وہ ہے جو انھوں نے میرامن دہلوی کی "باغ و بہار" پر لکھا ہے۔ اس میں اُردو کی اس مشہور داستان کے ماخذ پر انھوں نے بڑی ہی بصیرت افروز بحث کی ہے، اور بحث کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے، وہ آج بھی حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرامنؔ نے باغ و بہار کے دیباچے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ باغ و بہار کا قصّہ امیر خسروؒ کی چہار درویش سے ماخوذ ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ وہ تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ باغ و بہار کا ماخذ فارسی کی کتاب چہار درویش نہیں بلکہ نوطرزِ مرصّع ہے۔ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کی کتاب کا ترجمہ نہیں۔ قصّہ وہی ہے مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے اُردو کی کتاب نوطرزِ مرصّع ہے۔ اس کے مولف میر محمد حسین عطا خاں متخلص بہ تحسینؔ اٹاوے کے رہنے والے تھے۔ میرامنؔ نے فارسی کتاب اور اُس کے ترجمے کا تو ذکر کیا مگر نوطرزِ مرصّع کا ذکر صاف اُڑا گئے"۔ اور اُس کے بعد تینوں کتابوں کے بعض مقامات کا مقابلہ کرکے اپنے اس خیال کو صحیح ثابت کیا ہے۔ اس سے باغ و بہار کے ماخذ کے بارے میں جو ایک غلط فہمی عام ہوگئی تھی، وہ دور ہوگئی ہے۔ اس مقدمے میں وہ زیادہ تر تحقیقی پہلو کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ اس لیے اس میں تنقیدی پہلو زیادہ نمایاں نہیں ہوسکا ہے۔ البتہ بعض لسانی پہلوؤں کی وضاحت انھوں نے ضرور کی ہے۔ اسی میں ضمنی طور پر میرامنؔ کے اسلوب اور اُن کی زبان کا بھی ذکر آگیا ہے۔

شعرائے اُردو کے بیشتر تذکرے خود بابائے اُردو نے مرتب کرکے شائع کئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر اُن کا مقدمہ بھی ہے۔ ان مقدمات میں انھوں نے صرف اُن تذکروں

ہی کی اہمیت کو واضح نہیں کیا ہے، اُن کے لکھنے والوں پر بھی اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہے تحقیقی اعتبار سے یہ مقدمے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں میرؔ کے تذکرۂ نکات الشعرا، شفیق کے تذکرۂ چمنستانِ شعرا، قائم کے تذکرۂ مخزنِ نکات گردیزی کے تذکرۂ ریختہ گویاں، لُطف کے تذکرۂ گلشنِ ہند مصحفی کے تذکرۂ ہندی گویاں اور ریاض الفصحا وغیرہ پر جو مقدمے انھوں نے لکھے ہیں وہ ادبی تحقیق کے شاہکار ہیں۔ اِن سے اُردو شاعری اور اُردو شعرا کے بارے میں بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے، جن تک اس سے قبل کبھی کسی کی نظر پہنچی ہی نہیں تھی۔ نکات الشعرا کا مقدمہ مختصر ہے لیکن اختصار کے باوجود اس میں بعض نئی اور اور دلچسپ باتیں ملتی ہیں۔ یہ تذکرہ چونکہ اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے، اس لیے وہ اس کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہیں کہ تقریباً تمام تذکروں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں: "اس وقت تک جتنے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں اُن میں نکات الشعرا کو تقدم حاصل ہے۔ میرؔ صاحب کے علاوہ بعض اور تذکرہ نویس بھی اس بات کے مُدعی ہیں کہ سب سے پہلے ریختہ گو شعرا کا تذکرہ انھوں نے لکھا ہے۔ مثلاً قائم جس کے تذکرے کا سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ ہے یا خاکسار جس نے ۱۱۶۵ھ میں "معشوقِ چہل سالہ خود" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا۔ گارساں دی تاسی نے غلطی سے یہ خیال کر لیا ہے کہ گردیزی کو بھی یہ دعویٰ ہے کہ اُس کا تذکرہ سب سے پہلا ہے۔ حالانکہ اُس نے کہیں ایسا دعویٰ نہیں کیا اور اپنے دیباچے میں اُن تذکروں کی ناانصافی اور کم تحقیقی کی شکایت کی ہے، جو اس سے قبل لکھے گئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اُس نے اپنا تذکرہ میرؔ صاحب ہی کے جواب میں لکھا ہے۔ خاکسار کے تذکرے کے متعلق میرؔ صاحب فرماتے ہیں۔ عملی لازم این تذکرۂ تذکرہ ......... نوشتہ است بنام معشوق چہل سالۂ خود۔ احوال خود را اوّل از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سیدالشعرا پیش خود قرار دادہ!۔ اِس کی حقیقت ان چند سطروں سے صاف ظاہر ہے تذکرۂ گردیزی کا سنہ تالیف ۱۱۶۶ھ ہے اور قائم کا ۱۱۶۸ھ"۔ اس بیان سے ... نکات الشعرا کی نہ صرف اوّلیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ شعرائے اُردو کے بعض دوسرے تذکروں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں میرؔ کے حالات پر اُنھوں نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ اُن کے بارے میں مقدمۂ ذکرِ میر، اور مقدمۂ انتخابِ کلامِ میر میں اس سے قبل لکھ چکے تھے۔ صرف سراج الدین علی خاں آرزو سے اُن کے تعلقات کی کشیدگی کو واضح کیا ہے۔

"چمنستان شعراء" کے مقدمے میں اُنھوں نے اس تذکرے کے مولف لچھمی نرائن شفیق کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اِس لیے کہ اُن کے حالات کہیں اور نہیں ملتے۔ ساتھ ہی اس تذکرے کی حقیقت بھی واضح کی ہے۔ لکھا ہے کہ "اگرچہ شفیق نے اپنے تذکرے کی بُنیاد میرؔ صاحب اور فتحؔ علی کے تذکروں پر رکھی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ جہاں جہاں سے جو حالات مِل گئے ہیں، حوالے کے ساتھ اُن کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب کے مطالعے میں بعض جگہ شاہ عبدالحکیم حاکم کے "تذکرۂ مُردم دیدہ" اور تذکرۂ "مجمع النفائس" تالیف سراج الدین علی خان آرزو "سرو آزاد" اور حاجی علی اکبر اور رضا خاں انوار کی بیاضوں کا حوالہ ملے گا"۔ اس سے تذکرہ کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اور یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کون کون سی کتابوں کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اِسی طرح مخزن نکات کے مقدمے میں پہلے تو اُنھوں نے قائم چاندپوری کے حالات اختصار کے ساتھ لکھے ہیں، اور پھر اُس کے تذکرے پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح کہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ ان کی حقیقت اور تذکرے کے بارے میں اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے لکھتے ہیں: "قائم کا دعویٰ ہے کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس سے دو چار سال قبل میر تقی میر اور علی الحسینی الگردیزی نے اپنے تذکرے لکھے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قائم کو ان تذکروں کی اطلاع نہ تھی لیکن ڈاکٹر اسپرنگر کا کہنا کہ قائم نے جو اقتباسات ریختے کے شاعروں کے دیئے ہیں، وہ وہی ہیں جو گردیزی کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ دونوں تذکرے ہمارے سامنے ہیں۔ اشعار کے انتخابات اور حالات دونوں مختلف ہیں"۔ اس بیان سے قائم کے تذکرے کی صحیح حیثیت کو واضح کر دیا ہے۔ اسی طرح گردیزی کے تذکرے پر جو چند صفحات کا مقدمہ لکھا ہے، اُس میں اُس کی قلعی کھول دی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے بعد کہ یہ تذکرہ میر کے نکات الشعراء کے جواب میں لکھا گیا ہے، اور اِس میں میرؔ کو گرانے کی کوشش کی گئی ہے، اصل تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں: "گردیزی نے جس دعوے کے ساتھ اس تذکرے کے لکھنے کا قصد کیا ہے، اُس کا کتاب میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ اِس میں کہیں غلط حالات کی تصحیح کی گئی ہے نہ مظلوم ہمسروں اور ہم عصروں کی بے جا خُردہ گیری کا جواب دیا گیا ہے۔ نہ اُن نازک خیال رنگین نگار شعراء کے حالات کا اضافہ کیا گیا ہے جو دوسروں کی بے اعتنائی

کے شکار ہوگئے تھے، اور نہ اُن حقائق کو آشکارا کیا جو دوسرے تذکرہ نویسوں کے ایجاد کی وجہ سے نظروں سے پوشیدہ تھے۔ ایسی صورت میں اُس کا دعویٰ بے دلیل اور اُس کا الزام بے بنیاد ہے" اس بیان سے گردیزی کے تذکرے کی خصوصیات کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے، اور حقیقت حال سامنے آجاتی ہے۔ اور مرزا علی لطف کے گلشن ہند کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :-

"حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد اور امیر الممالک لارڈ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کے زمانے میں علی ابراہیم خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی میں لکھا تھا، اور اُس کا نام گلزارِ ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں جاکر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اُردو کے بڑے قدردان اور محسن مسٹر گلگرسٹ کی نظر سے گزرا۔ انھوں نے مولفِ تذکرۂ ہذا سے فرمائش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اُن کا منشا اُس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں اور اُن میں اُردو زبان اور اُردو شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے۔ بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے، اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے"۔ اس سے بھی پڑھنے والا اس تذکرے سے پوری طرح واقف ہو جاتا ہے، اور اُس کی شانِ نزول اُس پر روشن ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مصحفی کے تینوں تذکروں کی حقیقت صرف چند جملوں میں واضح کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں "تین تذکرے بھی اُن کی بڑی یادگار ہیں جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ سب سے پہلا تذکرہ فارسی گو شعراء کا ہے جس کا نام "عقدِ ثریا" ہے۔ اس میں تین قسم کے شعراء کا ذکر ہے۔ اوّل شعرائے ایران جو ہندوستان میں کبھی نہیں آئے۔ دوسرے وہ شعرائے ایران جو ہندوستان آئے۔ تیسرے ہندوستانی فارسی گو شاعر ـــ دوسرا تذکرہ اُردو کہنے والے شاعروں کا ہے۔ تیسرے تذکرے کا نام "ریاض الفصحا" ہے۔ اس تذکرے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جن لوگوں کے نام پہلے تذکرے میں لکھنے سے رہ گئے تھے اُن کا اس میں ذکر کیا گیا ہے"۔ اس بیان سے اِن تمام باتوں کا علم ہو جاتا ہے کہ مصحفی نے اپنے تینوں تذکرے کیوں لکھے، کس طرح لکھے اور یہ کہ اِن کو اس طرح تین ناموں سے لکھنے کا کیا مقصد تھا۔

یہ تفصیل صرف اس خیال سے پیش کی گئی ہے اور اس کو پیش کرتے ہوئے مختلف مقدمات

کے اقتباسات صرف اس خیال سے دیئے گئے ہیں کہ اِن سے بابائے اُردو کے اُن مقدمات کا صحیح انداز معلوم ہوتا ہے جو اُنھوں نے قدیم اَدب کی کتابوں پر لکھتے ہوئے اختیار کیا ہے۔

مُقدّمات میں وُہ ہمیشہ تحقیق اور تنقید دونوں کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ لیکن تحقیق کو خشک اور بوجھل نہیں بناتے، بلکہ کچھ ایسی سادگی سے ضروری باتوں کی وضاحت کرتے ہیں کہ اُن کی تحقیق پڑھنے والے کے لیے حد درجہ دلچسپ بن جاتی ہے، اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

لیکن ساتھ ہی تمام ضروری معلومات اُسے حاصل ہو جاتی ہے، اور موضوع کے تمام نشیب و فراز اُس پر آئینہ ہو جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب اس ضمن میں کبھی غیرضروری باتیں نہیں کرتے۔ بر خلاف اِس کے ہمیشہ ایسی اہم اور ضروری باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، جن سے اصل موضوع پر روشنی پڑتی ہے اور اُس کے خط و خال پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ کتاب کے مُصنّف کا حال بھی بیان کر دیتے ہیں۔ لیکن بُنیادی طور پر اُن کی توجہ اصل موضوع ہی کی طرف رہتی ہے۔ مثلاً جب کسی تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں تو تذکرہ ہی اُن کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اور اسی کی تفصیل کو وہ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی نئی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے، اور یہ باتیں معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ اس تفصیل و جزئیات کو پیش کرتے ہوئے وہ تمام تحقیقی پہلوؤں کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ لیکن اِن سے ملی جُلی تنقید بھی اُن کے یہاں نظر آتی ہے۔ چنانچہ اِن مُقدّمات میں اُنھوں نے تحقیق اور تنقید کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ جن کتابوں پر وہ مقدمات لکھتے ہیں۔ اُن کی لِسانی اور ادبی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے وہ تنقید سے بھی کام لیتے ہیں۔ اسی لیے تحقیق اور تنقید دونوں اُن کے یہاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اور اس طرح تحقیق اور تنقید میں ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے اور ایک ہم آہنگی نظر آنے لگتی ہے۔ تحقیق اور تنقید دونوں کا اِن مُقدّمات میں کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے، اور وہ مقصد یہ ہے کہ جس کتاب کے بارے میں وہ اظہارِ خیال کر رہے ہیں، اُس کی اصل حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے۔ اِسی لیے یہ دونوں پہلو اُن کے یہاں ذریعہ ہیں، مقصد نہیں، اور یہ خصوصیت اُن کے اُن مُقدّمات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو ادبی کتابوں پر لکھے گئے ہیں، اور جن میں شعرائے اُردو کے تذکروں پر لکھے جانے والے مقدّمات خصوصیت کے ساتھ

اہمیت رکھتے ہیں۔

زبان وَلِسان کے مختلف معاملات و مسائل سے مولوی عبدالحق صاحب کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقدمات میں بھی جو ادبی کتابوں پر لکھے گئے ہیں، وہ اُردو زبان اور اُس کے لسانی پہلوؤں پر جگہ جگہ بعض بہت ہی بلیغ اشارے کرتے ہیں۔ مثلاً نکات الشعرا کے مقدمے میں انھوں نے میر کے حوالے سے اُردو زبان کے ابتدائی نام ریختہ پر اظہارِ خیال کیا ہے، اور مصحفی کے تذکروں پر، جو مقدمہ لکھا ہے، اُس میں بھی لسانی معاملات و مسائل کو نظر انداز نہیں کرتے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان مقدمات میں لسانی معاملات و مسائل پر اُنھوں نے جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ محض اشارے ہیں۔ ان پر مفصل بحث تو انھوں نے اُن مقدمات میں کی ہے جو ایسی کتابوں پر لکھے گئے ہیں جن کا موضوع زبان ولِسان کے مختلف پہلو ہیں۔ ان مقدمات میں سید انشا کی دریائے لطافت کا مقدمہ، مقدمہ قواعدِ اُردو، مقدمہ فرہنگِ اصطلاحاتِ علمیہ اور مقدمہ مطبوعات دارالترجمہ عثمانیہ وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

قواعدِ اُردو خود مولوی صاحب کی قابلِ قدر تالیف ہے۔ اس پر جو مقدمہ انھوں نے لکھا ہے، اُس میں سب سے پہلے علم اللسان کا اُصول بیان کیا ہے کہ "زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے۔ اور نہ کوئی اُسے ایجاد کر سکتا ہے۔ جس اُصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، پتّے نکلتے، شاخیں پھیلتی، پھل پھول لگتے ہیں، اور وہی ایک ننھا سا پودا، ایک تناور درخت ہو جاتا ہے، اُسی اُصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے"۔ اور پھر اس اُصول کی روشنی میں اُردو کی پیدائش اور اُس کے آغاز کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "اُردو اُس زمانے کی یادگار ہے، جب مسلمان فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے اور اہلِ ہند سے اُن کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا۔ اُس وقت سے ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہوتا چلا گیا جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی، جس کا اُن میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ مسلمان، فارسی بولتے آئے تھے اور ایک زمانہ تک اُن کی زبان فارسی ہی رہی۔ دربار و دفاتر میں بھی اُسی کا سکّہ جاری تھا۔ ہندوؤں نے بھی اُسے شوق سے سیکھا۔ اور اُس زمانے میں فارسی لکھنا پڑھنا تہذیب میں داخل تھا۔ فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ دستارِ فضیلت کا ملنا عربی

زبان کی تحصیل کے بغیر ناممکن تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے علوم و فنون کا خزانہ اسی زبان میں مدفون ہے۔ اِدھر ملک میں جو زبان (قدیم ہندی یا پراکرت) رائج تھی، اُسے بھی مسلمانوں نے سیکھا۔ عوام وہی زبان بولتے تھے۔ چنانچہ اس مخلوط زبان میں بڑے بڑے شاعر ہوئے، مسلمان شاہی درباریوں اور علماء شعراء نے بھی یہ زبان سیکھی، اور اس میں تالیف و تصنیف (جو زیادہ تر نظم تھی) بھی کی۔ غرض ہندو مسلمانوں کے اس میل جول اور خلا ملا سے ایک نئی زبان نے جنم لیا، جس کا نام بعد میں اُردو رکھا گیا۔ اُردو کے معنی لشکر کے ہیں، اور لشکری زبان جیسی ہوتی ہے یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اس لیے اوّل اوّل ثقہ لوگ اِس کے استعمال سے بچتے رہے اور اُس کے لکھنے کو عار سمجھتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے قدم جمتے چلے گئے اور مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شعراء نے اس بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ اور پال پوس کر بڑا کیا۔ بہت کچھ صفائی پیدا کی اور نئی تراش خراش سے آراستہ کیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر سمندر کے راستے ایک نئی قوم ہندوستان پر مُسلط ہوئی جو مسلمانوں سے بالکل غیر تھی۔ اُس قوم نے اُس کی اُنگلی پکڑی، اُس نے انگلی پکڑ کر اُن کا پہنچا پکڑا۔ اور دربار میں اُس کی رسائی ہوگئی"۔ رفتہ رفتہ سرکاری دفاتر سے فارسی کو نکال باہر کیا، اور خود اُس کی کرسی پر جلوہ گر ہوئی۔ آخر ہندوستان کی قدیم راج دھانی اُس کا جنم بھوم اور دوآبہ اُس کا وطن ہوا۔ اب دُور دُور پھیل چکی ہے، اور ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک چلے جایئے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے"۔ اِن چند جُملوں میں مولوی صاحب نے اُردو زبان کی تاریخ اور اُس کے لِسانی ارتقا کو پوری طرح واضح کر دیا ہے، اور اپنے ارتقائی سفر میں وہ جن حالات سے دوچار ہوئی ہے، اُس کی تصویر بھی کھینچ دی ہے، اور ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی تاریخ نے اس زبان کو جس مخصوص سانچے میں ڈھالا ہے اُس کا پورا نقشہ پیش کر دیا ہے۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان اور اس کے لِسانی پہلوؤں پر بابائے اُردو کی نظر کتنی گہری ہے، اور وہ اِس موضوع پر کتنے اعتماد کے ساتھ کیسی بصیرت افروز گفتگو کر سکتے ہیں۔ اِس مُقدمے میں اُنھوں نے اُردو زبان کی اہمیت واضح کرنے کے بعد اُس کی صرف و نحو پر بھی بحث کی ہے؛ اور یہ بحث بھی اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ وہ اُردو زبان کے نہ صرف بہت بڑے عالم بلکہ مزاج داں ہیں۔

زبان کی مزاج دانی کا یہ شعور اُن کے اُس مقدمے میں بھی نظر آتا ہے، جو اُنھوں نے سید انشا کی کتاب "دریائے لطافت" پر لکھا ہے۔ اس میں سید انشا کے حالات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے اور اُن کے لسانی شعور کی وضاحت کرنے کے بعد اُنھوں نے جہاں اس کتاب کی اہمیت کی طرف اشارہ کیے ہیں، وہاں زبان کی مزاج دانی کا یہ شعور نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں: "سید انشاء اللہ پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے، اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے تو وہاں بھی زبان کی حیثیت کو نہ بھولے۔ علاوہ اس کے الفاظ و محاورات کی تحقیق، بیگمات کی زبان اور اُن کے محاورات، مختلف الفاظ کے تلفظ، مختلف فرقوں کے میل جول سے زبان پر جو اثر پڑا، اُن سب کو بڑے لطف سے ادا کیا ہے اور بعض بعض نکات ایسے بیان کیے ہیں جن کی قدر وہی کر سکتے ہیں جنھیں زبان کا ذوق ہے" ۔ اور پھر ان نکات پر مفصل بحث کی ہے، جس سے زبان کے بارے میں اُن کے صاحبِ ذوق ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس مقدمے میں لسانی تحقیق کے ساتھ زبان کے ذوق و شعور کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں، اور اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بابائے اُردو نہ صرف اُردو زبان کے سب سے بڑے ماہر اور محقق ہیں بلکہ مزاج داں بھی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مزاج دانی آسانی سے پیدا نہیں ہوتی، اور زبان کا یہ ذوق و شعور آسانی سے عام نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تو زبان سے عشق کرنے کی ضرورت ہے۔ بابائے اُردو کو اس زبان سے محبت ہے، اور اُن کی یہ محبت عشق کے درجے تک پہنچ گئی ہے، چنانچہ اُن کے مقدمات میں جگہ جگہ اُردو زبان سے والہانہ وابستگی کا اظہار نظر آتا ہے، اسی لیے اُن کی تحقیق محض تحقیق نہیں رہ جاتی، بلکہ اُس میں زبان کی یہ محبت رس پیدا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لسانی تحقیق کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور خشک سے خشک موضوع کو بھی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ دلوں میں جگہ بنا لیتا ہے۔

ادبی اور لسانی موضوعات کے ساتھ ساتھ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے بعض مقدمات ایسے موضوعات پر ہیں جو اُن کا خاص میدان نہیں ہے، لیکن جن پر اُنھوں نے بڑے ہی عالمانہ اور مفکرانہ انداز میں بہت ہی سلیقے سے اظہارِ خیال

کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنی کتابوں پر بھی مقدمے لکھے ہیں جن کا موضوع اسلام اور اس کے مختلف معاملات و مسائل ہیں۔ اِن مُقدمات میں مقدمۂ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام مقدمۂ تحقیق الجہاد اور معرکۂ مذہب و سائنس بہت اہم ہیں۔ ان مقدمات میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اُس سے دینی اور دُنیاوی پہلوؤں کے متعلق اُن کے حالات و نظریات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

"اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام، مولوی چراغ علی کا ایک رسالہ تھا جو انھوں نے پادری کینن میلکم میکال کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں پادری صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو موجودہ حالت میں چل نہیں سکتا، اور اگر مسلمان اُس پر عامل رہے تو کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ مولوی چراغ علی نے اپنے رسالے میں انھیں اعتراضات کے جواب دیئے ہیں اور بقول مولوی صاحب بہت پُر زور اور جامع کتاب لکھی ہے جس میں ان تمام بڑے بڑے اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو عموماً اور اکثر اسلام پر ہوتے آئے ہیں۔ اور اب بھی ہوتے ہیں۔ اب تک کسی شخص نے ان اعتراضات کا جواب اس طرز سے اور اس جامعیت کے ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس کے پہلے حصّے میں سیاسی حالات پر اور دوسرے حصّے میں معاشرتی اور تمدّنی حالات پر بحث ہے۔ کتاب کے مُقدّمے میں فقہ اور اصولِ فقہ پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور قرآن و حدیث پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ بابائے اُردو، مولوی چراغ علی کے بیشتر خیالات سے اتفاق کرتے ہیں۔ مثلاً اسلامی فقہ کے بارے میں اُنھوں نے مولوی چراغ علی سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ" اگرچہ اسلامی فقہ کے بعض ضابطے اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت مُناسب اور معقول تھے، لیکن موجودہ ضروریات کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ کوئی شے سوائے قرآن پاک کے قطعی اور ناقابل تبدیل نہیں۔ لہٰذا اس زمانے میں بھی اجتہاد کا وہی حق حاصل ہے، جو پہلے زمانے میں تھا۔ بشرطیکہ وُہ احکام قرآن سے مُطابق ہوں"۔ مولوی صاحب کے مُقدّمے میں اس کتاب پر تنقید نہیں ہے۔ اُس کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے اور اِس کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وُہ مولوی چراغ علی کے خیالات سے متفق ہیں۔ یہ مُقدّمہ اِس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ اس کے پہلے حصّے میں مولوی چراغ علی کا حال بہت تفصیل سے درج کیا گیا ہے، اور اُن کی شخصیت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اِس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بابائے اُردو اُن سے متاثر ہیں

ان کے مذہبی اور دینی خیالات ونظریات کا اُن پر گہرا اثر ہے۔ اُن کے رسالے تحقیق الجہاد پر بھی اُنہوں نے جو مقدمہ لکھا ہے، اُس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ اسی لیے وُہ مولوی چراغ علی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مولوی چراغ علی مرحوم کی کتاب پیاسے کے لیے آبِ حیات، مریض کے لیے نوش دارو اور مار گزیدہ کے لیے تریاق کا کام دیں گی۔ مرحوم اس ضرورت کو بہت پہلے سمجھ چکے تھے، اور جب کہ مقلّد اور غیر مقلّد، سنّی و شیعہ تو تو مَیں مَیں میں مصروف تھے وُہ ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے دین و ملّت کی ادا کر رہے تھے کہ اُس کی نظیر اُن کے بعد پھر نظر نہ آئی۔ بعض مدّعیانِ حمایتِ دین کی آنکھیں اب کھُلی ہیں، اور دن ڈھلے پر ایک جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ اور اُس کے متعلق مشورے اور کمیٹیاں ہو رہی ہیں لیکن انھیں خبر نہیں کہ مدّت ہوئی اس کی بنیاد سر سیّد ڈال چکے اور مولوی چراغ علی مرحوم اُس کی تکمیل بھی کر چکے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولوی عبدُالحق صاحب کو سر سیّد اور چراغ علی کے مذہبی تصورات سے پوری طرح اتفاق ہے اور وُہ انھیں کے خیالات ونظریات کے قائل ہیں۔ کیونکہ اُن میں انھیں عقلیت اور روشن خیالی نظر آتی ہے۔

'معرکۂ مذہب وسائنس' پر مولوی صاحب نے نہایت معرکہ آرا مقدمہ لکھا ہے، اور ان دونوں کے مختلف پہلوؤں پر اس میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب پر ہے جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے کیا تھا۔ اس مُقدمے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مذہب کی اہمیت واضح کی ہے، اور اس کو انسانی زندگی کے ساتھ لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ اُن کے خیال میں مذہب انسان کی گھُٹّی میں بلکہ اُس کی فطرت میں ہے جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود وقیود کو نہیں توڑ سکتا، اُسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اُس میں جاگزیں ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ "شکوک وشبہات پیدا ہوں گے۔ نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی۔ جدوجہد قائم رہے گی۔ اُس کے محدود حالات اُس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے۔ لیکن آخر فتح مذہب کی ہوگی۔" سائنس بھی مذہب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ وُہ صرف مادّے سے تعلق رکھتا ہے، لیکن مذہب کی حکمرانی روح پر ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں "سائنس انسان کا کامل تعلّق کائنات

سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ مذہب کرتا ہے، کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ اُس کی رسائی صرف مادی اشیا تک ہے۔ لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے، اور وہ مادی اور غیر مادی دونوں مملکتوں پر حادی ہے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ زندگی میں مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں، اور سائنس کے مقابلے میں اُس کو افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔ لیکن تمام مذہبوں میں اُن کے نزدیک مذہب اسلام زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ اُس نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ غرض اس مقدمے میں مولوی صاحب نے بڑی ہی فلسفیانہ بحث کی ہے، اور اس موضوع پر بہت سُلجھے ہوئے خیالات پیش کئے ہیں۔

اِن مقدمات کے علاوہ بابائے اُردو کے بعض مقدمات ایسے بھی ہیں، جن سے اُن کے معاشرتی تصوّرات اور نفسیاتی نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اُن میں سب سے اہم تو مقدمۂ "تجرّد وازدواج" ہے جس میں اُنھوں نے شادی شدہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُنھوں نے اس مُقدّمے کے شروع میں اِس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ وُہ خود اس نازک مسئلے کی اُونچ نیچ سے واقف نہیں لیکن اس موضوع پر جو خیالات اُنھوں نے پیش کئے ہیں، اُن میں گہرے معاشرتی اور نفسیاتی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اُن کے خیال میں شادی شدہ زندگی کی بنیاد مُحبّت پر اُستوار ہونی چاہیئے۔ کسی اور ذریعے سے اس میں کامیابی ناممکن ہے۔ شادی کے معاملے میں آزادیٔ انتخاب کے بھی وہ قائل ہیں، اور ایسی رسموں کو اچھا نہیں سمجھتے، جن سے یہ آزادی سلب ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ چونکہ شادی کا بوجھ لڑکے اور لڑکی کو اُٹھانا پڑتا ہے، اِس لیے اس کی تمام تر ذمّہ داری انھیں دونوں پر ہونی چاہیئے۔ ماں باپ کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اُنھوں نے لکھا ہے" شادی کی اِبتدا جبر سے شروع ہوئی۔ قدیم زمانے میں عورت کا اڑالے جانا ایسا ہی تھا جیسے مال واسباب اور مویشی کا لوٹ مار کرلے جانا۔ جس کے آثار اب بھی شادی کے چند رسومات اور ماں باپ کی زبردستی میں پائے جاتے ہیں؛ اور لوگ اسی لکیر کو پیٹتے چلے آتے ہیں۔ دو شخصوں کو حکم دینا کہ آپس میں محبت کرو۔ ایک لایعنی بات ہے۔ جہاں جبر ہے وہاں محبت کہاں، اور جہاں جبر ہے وہاں محبت

کی حاجت نہیں۔ ممکن ہے کہ بعضے یہ کہیں کہ اکثر بعد میں محبت پیدا ہو جاتی ہے، مگر یہ اتفاقی باتیں ہیں اور اتفاقات پر بھروسہ کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔" اس سے مولوی صاحب کی روشن خیالی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ وہ ان معاملات کو عقلی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ مقدمہ اگرچہ مختصر ہے، لیکن اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے بابائے اُردو کے معاشرتی تصورات کی وضاحت ہوتی ہے اور اُن کے نفسیاتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

غرض مولوی صاحب نے مختلف اور متنوع موضوعات سے متعلق کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ ان کے موضوعات علمی بھی ہیں، معاشرتی بھی ہیں تہذیبی بھی ان مقدمات میں انھوں نے فلسفہ و سائنس کے اسرار و رموز بھی کھولے ہیں، دین اور مذہب کے حقائق کے چہرے سے پردہ بھی اُٹھایا ہے۔ ادب و شعر کے نکتے بھی بیان کئے ہیں۔ معاشرت اور تہذیب کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔ تاریخی اور سیاسی حقیقتوں کو آئینہ بھی دکھایا ہے۔ غرض زندگی اور ادب کے ان گنت پہلوؤں پر ان مقدمات میں اظہارِ خیال ہے، اور ان تمام موضوعات پر بابائے اُردو کے خیالات و نظریات ان مقدمات میں اظہار خیال ہے، اور ان تمام موضوعات پر بابائے اُردو کے خیالات و نظریات ان مقدمات سے پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں، اور اس طرح اُن کی شخصیت پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ حالانکہ وہ ان مقدمات میں براہِ راست اپنی بات بہت کم کہتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت کم نمایاں کرتے ہیں لیکن اسی میں اُن کی بڑائی ہے۔ اُن کے خیالات و نظریات کی وضاحت ان مقدمات میں بالواسطہ طور پر ہوتی ہے۔ جب وہ دوسروں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں، تو ایک خاص اسلوب سے اپنی بات کی پوری طرح وضاحت کر دیتے ہیں۔ اِسی انداز کی بدولت اُن کی بات اثر کرتی ہے، اور اُن کے خیالات و نظریات دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ اِن خیالات و نظریات میں گہرائی کا پتہ چلتا ہے، یہ وسیع مطالعے کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ اِن میں ایک تحقیقی مزاج کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایک روشن خیال طبیعت کا عکس نظر آتا ہے۔ ایک انسانیت پرست اور انسان دوست شخص کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ ایک قوم پرست شخص کی اُفتاد طبع

اور ذہنی رُجحانات کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ انسان اور انسانیت کی آزادی کے ایک بہت بڑے پرستار کی جنون سامانیاں نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن خیالات و نظریات میں ایک زندگی اور جولانی کا پتہ چلتا ہے، اور یہ درحقیقت اُس شخصیت کا عکس ہے۔ جو شروع سے آخر تک زندگی ہی زندگی اور جولانی ہی جولانی ہے جو پیہم رواں دواں اور ہر دم جواں ہے، جس کو کسی مقام پر رُکنا نہیں آتا، اور جس کی منزل آسمانوں سے بھی پرے ہے۔

اِن مقدمات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مولوی صاحب کی عظیم شخصیت کے صحیح آئینہ دار ہیں۔ ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا سب سے بڑا مقصد اُردو زبان کی خدمت ہے۔ وہ اس کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ اُس سے والہانہ محبت اُن کا نصب العین ہے۔ اس لیے ان خُطبات میں جگہ جگہ وُہ اُردو زبان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے ہیں، اور اُس کی ترقی کی باتیں بڑی اخلاص مندی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

اُنھیں اُردو ادب کے ساتھ گہری دلچسپی ہے اور وہ اُس کو بھی ترقی کے راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے اُردو ادب کے قدیم سے قدیم شاہکاروں کا سُراغ لگانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ جدید ادب کے علم برداروں کی ہمت افزائی بھی اُن کے نزدیک ضروری ہے تاکہ اُردو ادب کا ارتقائی تسلسل قائم رہے اور ادب کا قافلہ آگے بڑھتا رہے۔ اسی خیال سے وُہ بعض نوجوان کی کتابوں پر بھی مقدمے لکھنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، اور اُن کے کاموں کی دل کھول کر داد دی ہے۔ بابائے اُردو اس معاملے میں بُخل سے کام نہیں لیتے، بلکہ وُہ نوجوانوں اور جدّت پسندوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں، اور اُن کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہیں۔ اِس میں اُن کی روشن خیالی اور کُشادہ دلی کو بھی خاصا دخل ہے۔ تنگ نظری اُن کے مزاج میں نہیں ہے۔ قدامت پسندی سے وُہ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اِن مقدّمات میں جگہ جگہ اُن کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ دُھن کے پکّے ہیں۔ انھیں کام کرنے کی لگن ہے۔ اُن کے سامنے

ایک بلند نصب العین ہے۔ اس نصب العین کی نوعیت قومی اور ملی، معاشرتی اور تہذیبی ہے اور اُردو زبان اور ادب کی خدمت کا خیال بھی درحقیقت اُن کے اسی نصب العین کا جزو ہے۔ برِّعظیم کے مسلمانوں کے جو قومی اور ملّی مسائل ہیں، اُن سے انھیں گہری دلچسپی ہے۔ وُہ انھیں اجتماعی طور پر، تہذیبی و معاشرتی اعتبار سے آگے بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ چُنانچہ اُن کا نقطۂ نظر ہر جگہ قومی اور اجتماعی ہوتا ہے۔ اِنفرادی معاملات کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ اُن کے نزدیک وہی افراد زیادہ قابلِ قدر اور لائق ستائش ہیں جن کا زاویۂ نظر قومی ہوتا ہے اور جو انفرادی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کردیتے ہیں۔ مذہب سے بھی اُنھیں دلچسپی ہے۔ اُن کے نزدیک وہ انسانی فطرت اور مزاج میں داخل ہے۔ مذہب اُن کے خیال میں خیر کی قدروں کا علم بردار ہوتا ہے، اور کوئی قوم اُس کے سہارے صحیح راستے پر گامزن ہوتی ہے۔ سائنس کی ترقی اور عقلیت کے فروغ سے بھی مذہب کی روشنی ماند نہیں پڑسکتی۔ لیکن اُن کے خیال میں سائنس کی ترقی بھی انسانی زندگی کے ارتقا کے لیے لازمی ہے۔ اس لیے مذہب اور سائنس کو بہ یک وقت فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔ ان کی حیثیت ایک میان میں دو تلواروں کی نہیں ہے۔ مذہب تہذیب نفس کے لیے ضروری ہے، اور اس اعتبار سے تمام مذاہب میں اسلام کو فوقیت حاصل ہے۔ لیکن مذہب کو انسانی زندگی کے لیے ضروری سمجھنے اور خود مذہبی ہونے کے باوجود وہ طبیعت اور مزاج کے خشک نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے اُن کے یہاں تو بڑی شگفتگی اور شادابی ہے۔ وہ بڑا غضب کا احساسِ مزاح رکھتے ہیں۔

اُن کے پاس ایک رچا ہوا ذوقِ جمال ہے، اور وہ حسن کے پرستار ہیں۔ چنانچہ اس حُسن کی تلاش اِن کے یہاں برابر جاری رہتی ہے۔ زندگی اور ادب دونوں میں وہ اِس حُسن کو تلاش کرتے ہیں۔

اس کا اثر اُن کے مزاج اور طبیعت پر بھی ہوتا ہے۔ اور اسی لیے اُس میں اِس حُسن کے ساتھ لگاؤ کی وجہ سے شگفتگی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ اُن کی شگفتہ مزاجی کی بہت سی مثالیں اُن مقدمات میں جگہ جگہ بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان مقدمات سے اُن کی ذہانت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ذہانت اُن

کی ایک ایک بات میں معنویت کی بجلیاں بھر دیتی ہے۔ اسی ذہانت کی بدولت وہ ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقتِ حال اُن پر بغیر کسی کوشش اور کاوش کے روشن ہو جاتی ہے۔ اس ذہانت کو اُن کا عالمانہ رنگِ طبیعت کو چار چاند لگا دیتا ہے، اور وہ اس کے لیے سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ ذہانت کے ساتھ علمیت کا یہ امتزاج جو مولوی صاحب کی شخصیت میں اتنا نمایاں ہے اُس کی مثال کہیں اور ذرا مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ذہانت اور علمیّت کے اِس امتزاج ہی نے بابائے اُردو کی شخصیت میں تنقیدی شعور کو اُبھارا ہے۔ اور اسی لیے وُہ زندگی اور ادب دونوں کے بہت اچھے نقاد نظر آتے ہیں۔

غرض مولوی صاحب کی شخصیت کے اُن تمام پہلوؤں کی جھلکیاں اُن کے اِن مقدمات میں جگہ جگہ نمایاں ہیں اور اس آئینے میں اس شخصیت کی عظمت کو پوری طرح بے نقاب دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ مقدمات اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں مقدمہ نگاری ایک مُستقل فن کا روپ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے؛ اور اس کو ایک فن بنا دینا مولوی عبدُالحق صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مُقدّمات بڑے شوق اور انہماک کے ساتھ لکھے گئے ہیں ان کا مقصد محض کسی مُصنّف یا کتاب کا معمولی سا تعارف نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اہمیت کا مکمل اظہار ہے۔ اسی لیے بابائے اُردو کے بیشتر مُقدّمات مفصل ہیں۔ اُن میں تفصیل و جزئیات ہے۔ وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ گہرائی اور گیرائی ہے۔ یہ خصوصیات اِن مُقدّمات میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں، اور انھیں کی بدولت یہ مُقدّمات ایک مُستقل فن کی صورت اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بابائے اُردو کے ذہن میں مُقدمہ نگاری کا ایک واضح تصوّر ہے اور ہر مُقدّمے میں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مُقدّمے لکھتے وقت اس تصوّر کو سامنے رکھتے ہیں۔ اور اس تصوّر کو عملی صورت دینا اُن کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ چنانچہ وُہ اپنے مُقدّمات میں اُس کو عملی صورت دیتے ہیں۔ اُن کے مقدمات کی تکنیک یہ ہے، کہ وُہ سب سے پہلے تو کتاب کے مُصنّف یا مؤلف کا تعارف کراتے ہیں۔ اس تعارف

ہیں اُس کے زندگی کے حالات بیان اور اُس کے کردار کی تصویر کشی اُن کے پیش نظر رہتی ہے۔ اسی ضمن میں وہ اُس کی مختلف تصانیف پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں، اور اس طرح کتاب کے مصنف یا مولف سے پڑھنے والے کو پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ حالات، سیرت، اور تصانیف کے اس بیان میں صرف عام باتوں کو وہ پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ اس سلسلے میں تلاش و جستجو کے بعد نئے مواد کو پیش کرتے اور اس میں نئے نکتے پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مقدمات میں بعض مصنفین کے بارے میں ایسی معلومات ملتی ہیں جو کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

بڑی خوبی اُن کی یہ ہے کہ حالات کے بیان کو وہ سیرت نگاری کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ سیرت نگاری میں بابائے اُردو کو کمال حاصل ہے۔ اس لیے حالات اور سیرت کی یہ ہم آہنگی اُن کے مقدمات کے اس حصے کو بلا کا دلچسپ بنا دیتی ہے اور پڑھنے والے کو اس میں ہلکے پھلکے ادب کا سا لطف آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مقامات پر ..........

اُن کے مقدمات میں جذبے اور تخییل کی آمیزش ایک تخلیقی رنگ و آہنگ کو نمایاں کر دیتی ہے۔

حالات اور سیرت پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ زیر نظر تصنیف یا تالیف کا تعارف کراتے ہیں، اور اس سلسلے میں پہلے تو یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ کیوں اور کس طرح لکھی گئی اور پھر اُس کے موضوع کا ایک خاکہ پیش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس خاکے سے کتاب کا ایک خلاصہ سامنے آ جاتا ہے، اور اُس کے موضوع سے پوری طرح واقفیت ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد وہ اس کی ادبی، فنی اور لسانی حیثیت پر بھی کرتے ہیں اس بحث میں ان کا زاویۂ نظر ہمیشہ تحقیقی اور تنقیدی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی اس بحث سے کتاب کے فنی اور جمالیاتی پہلو آئینہ ہو جاتے ہیں، اور آخر میں وہ ان مباحث سے بعض نتائج نکال کر علم و ادب میں اس کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں..... اور اُن کا مقدمہ کتاب کا ایک مکمل تحقیقی اور تنقیدی جائزہ بن جاتا ہے اور پڑھنے والے کو اِس سے بڑی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ وہ کتاب سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لیتا ہے، اور پھر کتاب کو پڑھنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسی موانست پیدا ہو جاتی ہے

جس سے اجنبیت کے پردے اُٹھ جاتے ہیں، اور رجحانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اِسی مقصد سے یہ مقدمات لکھے بھی گئے ہیں۔ ان کا مقصد محض تحقیق اور علمیت کا اظہار نہیں ہے۔ صرف تنقید اور تبصرے کا خیال ہی اِن کا محرک نہیں ہوا، بلکہ مُصنّف، مُولّف اور کتاب کا ایک مکمل تعارُف، جس سے لکھنے اور پڑھنے والے کے درمیان ایک موانست پیدا ہو جائے تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے پوری طرح آشنا ہو جائیں۔ اِسی بنیادی خیال نے مقدماتِ عبدالحق میں وہ تکنیک پیدا کی ہے جس نے اُن کی مقدمہ نگاری کو ایک فن بنا دیا ہے۔

مُقدمہ نگاری کے اِس فن میں مولوی صاحب کے اسلوبِ بیان اَور اندازِ نگارش کو بھی ایک نمایاں مرتبہ حاصل ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اُن کے اس اسلوب نے اِن مقدمات کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔

یہ مقدمات جو اتنے دلچسپ نظر آتے ہیں اور ان میں جو اس قدر دلکشی کا احساس ہوتا ہے، اُس کا سبب اُن کا اسلوب ہے۔ اسی اسلوب نے اُن میں وہ خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو تخلیقی ادب میں پائی جاتی ہے۔

مولوی صاحب کا اسلوب صاف اور سادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سیدھے سادے انداز میں سوچتے ہیں۔ اُن کے افکار و خیالات میں کسی قِسم کا اُلجھاؤ نہیں ہے۔ اِسی لیے اُسلوب میں بھی کوئی پُر پیچ کیفیت نظر نہیں آتی۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اور جو کچھ سوچتے ہیں، اُس کو آسان اور سادہ زبان میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ اُن کے خیالات میں ایک فطری روانی اور بہاؤ اُس کی نمایاں ترین خصُوصیت ہے۔ اُس میں کسی قِسم کی کاوش کا احساس نہیں ہوتا۔ تکلّف اَور تصنّع سے وہ کام نہیں لیتے۔ کیونکہ یہ تکلّف اور تصنّع تو اُن کے مزاج ہی میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اسلوب میں آرائش و زیبائش کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ سجا سجایا نہیں ہے۔ لیکن اُس میں ایک باقاعدگی ضرور ہے اور اِسی باقاعدگی اور خوش سلیقگی ہی میں اِس کا حسن ہے۔ اِس حسُن کا زیور سادگی ہے اور اسی سادگی میں اُن کے یہاں ایک پُرکاری نظر آتی ہے۔ موضوع ........ اور خیال کی مناسبت سے زبان کے

استعمال اور الفاظ کی دَر و بست کو اُنھوں نے ایک فن بنا دیا ہے؛ اور اُن کے اسلوب کی یہ نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ مقدمات کی یہ چند عبارتیں اُن کے اسلوب اور اندازِ نگارش کی بنیادی خصوصیات کو پوری طرح واضح کرتی ہیں:

"جن ملکوں میں انتہا سے زیادہ آزادی ہے۔ اور جہاں انتہا سے زیادہ پابندی ہے۔ اُس کا رونا دونوں جگہ یک ساں ہے۔ مگر ہمارے ملک میں تو غضب یہ ہے کہ ماں باپ لڑکے کی کچھ پیش نہیں جانے دیتے۔ وہ آنکھ بند کر کے انھیں کنویں میں دھکیل دیتے ہیں، اور جب گرنے کی دھم سے آواز آتی ہے تو اُس پر تالیاں بجاتے قہقہے لگاتے اور خوشی مناتے ہیں۔ اور اِس قدر غُل غپاڑہ مچاتے ہیں کہ اُن کشتگانِ خنجرِ تسلیم کی آواز تک نہیں سنائی دیتی۔" (مقدمہ تجرد و ازدواج)

---

"شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چُست ہے قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا ایک آدھ محاورہ آگیا۔ کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہو گیا۔ رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اُس میں برکت ہی برکت تھی، اور اب بھی وہی حال ہے۔"
(مقدمہ گلشنِ ہند)

---

"خود ڈاکٹر ڈریپر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پولیٹکل حیثیت سے عالم پر چھا گئے۔ اِسی طرح اُنھوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مُردہ علوم کو زندہ کیا بلکہ اپنے علمی انکشاف و ایجادات اور اپنے بے بہا خیالات سے دُنیا کو مالا مال کر دیا، اور صلح جوئی، آزادی، بے تعصبی اور مسالمت میں سب آگے بڑھ گئے اور یورپ کے اندھیرے گھُپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔" (مقدمہ معرکۂ مذہب و سائنس)

اِن عبارتوں میں کیسی شگفتگی اور شادابی ہے! کس غضب کی سادگی اور صفائی ہے! یوں تو یہ عبارتیں سیدھی سادی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں ایک حُسن نظر آتا ہے؛ اور یہ حُسن اُن کی سادگی اور صفائی، روانی اور بہاؤ، ترنم اور نغمگی، بے ساختگی اور برجستگی، زبان اور الفاظ کے استعمال کی خوش سلیقگی میں ہے۔ اِن عبارتوں کے موضوعات سنجیدہ ہیں۔ ان میں جو خیالات

پیش کئے گئے ہیں، اُن میں گہرائی ہے۔ لیکن اس سنجیدگی اور گہرائی کے باوجود یہ شگفتہ اور شاداب ہیں۔ اِن میں لکھنے والے کی ذہانت جگہ جگہ گل بوٹے سے کھلاتی ہے، اور اُس کے مزاج کی لطافت اور طبیعت کی شگفتگی کہیں سنجیدہ بجلیاں سی چمکاتی ہے۔ اسی لیے اِن کا اثر ہوتا ہے۔ یہ دلوں میں جگہ بناتی ہیں۔ باباے اُردو کے مقدمات اِس قسم کی شگفتہ اور شاداب عبارتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اِن مقدمات میں شروع سے آخر تک یہی اسلوب پایا جاتا ہے جس کی جھلک یہ عبارتیں دکھاتی ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ اِسی اسلوب نے اِن مقدمات کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اُردو ادب میں یہ مقدمات ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اسی اعتبار سے اُن کا پایہ بہت بلند ہے۔ اِن سے قبل اُردو میں مقدمہ نویسی کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ کتابوں پر صرف تقریظیں لکھنے کا رواج تھا۔ اِن تقریظوں میں صرف مدّاحی ہوتی تھی اور لکھنے والے الفاظ کے ساتھ کھیلتے تھے۔ صداقت ان میں ناپید تھی۔ خلوص نام کو بھی نظر نہ آتا تھا۔ اِن حالات میں یہ مقدمات لکھے گئے، اور مولوی صاحب نے ان کی طرف ایسے خلوص، انہماک اور جذب و شوق کے ساتھ توجہ کی کہ انھیں ایک مستقل فن بنا دیا۔ اِس میں ان کی کوئی شعوری کوشش شامل نہیں تھی۔ کیونکہ بہر حال یہ مقدمے مقصد نہیں، ذریعہ تھے۔ چنانچہ تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے بھی ان کا رتبہ مسلّم ہوگیا اور فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی انھوں نے اپنی جگہ بنالی۔

کہنے کو تو یہ مقدمے ہیں، جن سے صرف کسی مصنّف، مؤلف یا کتاب کے تعارف کی توقع کی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ اعلیٰ درجے کے تحقیقی اور تنقیدی مقالے ہیں، جن میں تاریخی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، لسانی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر بڑی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اس بحث سے ان موضوعات کے تقریباً تمام اہم اور پیچیدہ پہلو روشن ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان میں نئی معلومات ہیں۔ نیا تحقیقی شعور ہے۔ نئی تنقیدی بصیرت ہے۔ اسلوب کی نئی جمالیاتی شان ہے۔

اور ان سب کے مجموعی امتزاج نے اِن مُقدّمات کو اس رنگ و آہنگ سے آشنا کر دیا ہے، جس میں اُن کی فنّی انفرادیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

---

"مُقدّمہ نویسی --- چند زینے اُوپر تنقید کا جُزو اور ضمیمہ شمار کی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ مُقدّمہ مطالب اور مُصنّف کے ما فی الضمیر کو زیادہ وضاحت اور پھیلاؤ کے ساتھ اَدا اور مضمون کے ہر رُخ کو نُمایاں کرتا ہے۔ اِس سے اَدبی وجدان کی صحیح رہ نُمائی ہوتی ہے اور مُطالعہ کنندہ رہِ راست سے بھٹکنے نہیں پاتا۔ مولانا (عبدالحق) نے بعض مَوضوعات کے مُتعلق اَپنے مُقدّموں میں ایسے باریک نکات حل کئے ہیں اور موشگافیاں فرمائی ہیں کہ خود مُصنّف کی پہنچ بھی وہاں تک نہ ہو سکی۔ بعض تصنیفوں کو مُقدّمہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ مقولہ باطل ہو جاتا ہے کہ تصنیف را مُصنّف نیکو کُند بیاں!
مُصنّف کے فرائض مولانا اَپنے گلے ڈال لیتے ہیں اور پھر تشریح و توضیح اور اِصلاح کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ وہ مُقدّمہ نہیں لکھتے، علم و فضل کی مسند پر بیٹھ کر درس دیتے ہیں اور حشو و زوائد کو ٹکسال باہر کرتے جاتے ہیں۔ حالی مرحوم نے اپنے دیوان پر ایک مُحققانہ اور عالمانہ مُقدّمہ لکھ کر اُردو میں مُقدّمہ نگاری کا نقشِ اوّل قایم کیا۔ اس کے بعد ہمارے مولانا نے اس زمین کو آسمان بنا دیا۔ اُن کے ہر مُقدّمے میں چشمِ بینا کو نئی روشنی ملتی ہے اور اُن کا ہر جُملہ ایسا مؤثر اور نپا تُلا ہوتا ہے کہ اُردو متاعِ اِدب کی فضیلت بڑھتی ہی جاتی ہے ــ"

ـــــــ نواب منظور احمد جنگ بہادر

ڈاکٹر احسن فاروقی.

# مُقدمات کی تنقیدی اہمیت

مولوی عبدالحق کے "مقدمات" میں ہمیں نہ صرف ہر قسم کی تحقیق ملتی ہے بلکہ یہاں تحقیق سے تنقید کے لئے اچھا کام لیا گیا ہے۔ چھپے ہوئے مقدمات کی دو جلدوں میں ہر قسم کے موضوعات سے متعلق مقالات ہیں مگر تنقید کے لحاظ سے اہم صرف سات مقدمے ہیں جو "ادبیات" کی سرخی کے ماتحت چھاپے گئے ہیں۔ اردو میں محققانہ تنقید، جس کے بہترین نمائندے مولانا عبدالحق ہیں، ان مقدمات ہی میں نظر آتی ہے یوں تو مولانا کے مضامین بکثرت ہیں اور بہت سی جلدوں میں چھپے ہیں، مگر ان کے تمام تنقیدی مضامین کی نوعیت اور اہم خصوصیات ان سات مقدموں میں نظر آجاتی ہیں۔

شائد مولانا عبدالحق کا سب سے اہم مقدمہ "انتخاب کلام میرؔ" پر ہے۔ یہ ویسی تمہید سے شروع ہوتا ہے جیسی ہمیں لارڈ میکالے کی طرح کے انگریزی نقاد کے مضامین میں ملتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں "میر تقی میرؔ سرتاج شعرائے اردو ہیں ان کا کلام اسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی زبان میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میرؔ کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے موزونیٔ طبع کی وجہ سے یا اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کے لئے شعر کہے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے کمال سے اردو کی فضا کو چمکا دیا اور زبان کو زندہ رکھا شاعری میر صاحب کی زندگی کا جزو تھی گویا فطرت نے انہیں اسی سانچے میں ڈھالا تھا۔ ان کا اصلی اردو زبان پر تا قیامت رہے گا اور ان کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہوگا کیوں کہ اس میں وہ عالمگیر حس ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

اس قسم کی تمہید اردو میں نئی چیز ہے۔ اس کی سب سے اہم صفت یہ ہے کہ یہ صحیح ہے اور اس میں مبالغہ کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔ میرؔ کی صحیح حیثیت کو ہمیشہ کے لئے متعین کر دیتی ہے اور اس سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

اس کے بعد میرؔ کی سوانح شروع ہوتی ہے اور جوں جوں ہم اس سوانح کو پڑھتے جاتے ہیں مولانا کی تحقیق کا سکہ ہمارے دل پر جمتا جاتا ہے۔ ہر ہر قدم پر کوئی نئی بات سامنے لائی جاتی اور اس کی سند دی جاتی ہے اور اس پر بحث کر کے صاف نتائج نکالے جاتے ہیں۔ میرؔ کے وطن، اُن کے خاندان، خان آرزوؔ سے ان کے تعلقات، ان کی پریشانیاں، دہلی میں ان کے حالات، دہلی سے لکھنؤ آنا اور نواب آصف الدولہ سے ربط ضبط، ان تمام معاملات پر صحیح محققانہ معلومات بہم پہنچائے جاتے ہیں۔

سوانح کے بعد میرؔ صاحب کی شہرت اور مقبولیت کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ "اس وقت سے اب تک میرؔ صاحب کے کمال کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور بڑے بڑے شاعروں نے اُنہیں استاد مانا ہے۔" اس کے ثبوت میں بڑے بڑے اُستادوں کے اشعار رقم کئے گئے ہیں، اور اس کے بعد میرؔ صاحب کی شاعری پر تنقید کی گئی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> میرؔ صاحب کی شاعری اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے اُردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ اگر پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر کا رُتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔
>
> میرؔ صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے جو لُطف سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی زبان کی فصاحت اور سادگی، سوز و گداز مضامین، کی جدت اور تاثیر، ایسی خوبیاں ہیں جو اُردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں۔ ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی

صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں جس پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں۔ یہ خاص انداز میرؔ صاحب کا ہے مگر ان کا کلام حسرت و ناکامی، حرمان و مایوسی سے بھرا ہوا ہے۔"

اس کے بعد میرؔ کی اس امتیازی صفت کے اسباب کی کافی طویل اور واضح تشریح کی گئی ہے۔ میرؔ کے بزرگوں کے اثر سے زمانے کے اثر، میرؔ کے مخصوص تجربات وغیرہ سے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ان کا ہر شعر ان کے دردِ دل کی تصویر ہے۔

یہاں تک محسوس ہوتا ہے کہ مولانا پوری پوری کامیابی کے ساتھ تنقید کر رہے ہیں مگر کچھ ہی دیر کے بعد وہ پرانی نکتہ چینی پر اتر آتے معلوم ہوتے ہیں جب کہ وہ کہتے ہیں:

"ان کا کلام دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغے اور خلافِ عادت امور سے پاک ہے۔ بھونڈے اور بے جا تکلف و تصنع اور فضول لفاظی کا نام نہیں۔ وہ قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ، شستہ اور صاف زبان میں ایسے دل کش اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنی چاہتے ہیں وہ دل میں اتر جاتی ہے۔ غرض یہ کہ ان کا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی سہلِ ممتنع ہے۔"

یہاں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا شاعر کی ہستی اور اس کے طرزِ ادا میں جو تعلق ہوتا ہے اس سے ناواقف ہیں۔ جن چیزوں کو وہ عیوب بتاتے ہیں اور میرؔ کی شاعری کو ان سے پاک بتاتے ہیں، وہ خاص مزاج کے لوگوں نے ہنر بھی ثابت کر دکھائے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ بتا دینا کہ میرؔ کے یہاں یہ عیوب نہیں ہیں تنقیدی لحاظ سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ اسی نکتہ چینی کے درجہ پر رہتے ہیں جب کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ "شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار، اس کے کلام کی تاثیر ہے اگر اس معیار پر میر صاحب کے کلام کو جانچا جائے تو ان کا نمبر اردو شعراء میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہے۔" مگر اس درجہ سے آگے بڑھ کر تنقید کے دائرے میں آ جاتے ہیں جب وہ کہتے ہیں "ان کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں۔ زبان سے نکلتے ہی دل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں" پھر میرؔ کے کلام کی غلطیوں کا ذکر پرانے مقولے "پستش بسیار پست و بلندش بسیار بلند" کے ماتحت کیا گیا ہے اور کافی مثالیں دے دی گئی ہیں۔ کچھ لطیفے بھی بیان کئے گئے ہیں اور حالیؔ کی "یادگارِ غالب" کی نقل میں کافی اشعار کی شرح مع تبصرہ

کے بھی پیش کی گئی ہے - یہ تمام حصہ اردو تنقید نگاری میں کسی طرح اضافہ نہیں کرتا۔

ایک مقام پر میرؔ اور انیس کا موازنہ کیا گیا ہے - جو شبلی وغیرہ سے کہیں زیادہ اونچے معیار کی چیز ہے - اس میں ایسے جملے، صحیح موازنہ کی مثال قائم کرتے ہیں جیسے "میر انیس کے ہاں خیال کے مقابلے میں الفاظ کی بہتات ہے اور خیال سے پہلے لفظ پر نظر پڑتی ہے - لیکن میرؔ کے اشعار میں الفاظ، خیال کے ساتھ اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے اور اسے لفظ خیال سے الگ نظر نہیں آتا - میر کے ہاں سکون اور خاموشی ہے اور اس کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں جس کی مثال اس نشتر کی سی ہے جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے اور اس کا اثر اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ دل پر جا کر کھٹکتا ہے - میر انیسؔ رُلاتے ہیں میرؔ خود روتا ہے - یہ آپ بیتی ہے وہ جگ بیتی ہے۔"

اس کے بعد اس مقدّمے کا وہ معرکتہ الآرا حصہ آیا ہے جو میرؔ پر تنقید میں اور اردو تنقید میں بڑا ہی اہم اضافہ ہے - محمد حسین آزادؔ کی "آبِ حیات" میں میرؔ کی بابت کچھ ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ ان کا کردار مسخ ہو کر رہ گیا ہے - مولانا عبد الحق اس کردار کو نہایت صحیح ناقدانہ ہمدردی کے ساتھ پیش کرتے ہیں" کہتے ہیں کہ انسان کا طرزِ بیان اس کی سیرت کا پرتو ہوتا ہے - یہ مقولہ شاعر کے کلام پر اس بھی زیادہ صادق آتا ہے لیکن غالباً کسی شاعر کے کلام پر اس کی طبیعت اور سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا کہ میرؔ کے کلام میں نظر آتا ہے - ان کے اشعار پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ایک ایک لفظ، طرز بیان، ترتیب و بندش، ان کی قلبی واردات و احساسات کا نقشہ کھنچا ہوا ہے - وہ شعر میں اپنا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں اور ان کی جدتِ بیان میں صاف اُن کے تیور نظر آتے ہیں اور کلام و سیرت میں وہی فرق ہے جو قول و فعل میں ہوتا ہے -

میرؔ کی وضع داری نے کمال کی لاج رکھ لی - انہوں نے شاعری کو ذریعہ عزت یا وسیلہ معاش نہیں بنایا - ان کا صبر و استقلال، ان کی قناعت اور بے نیازی اور ان کی غیرت اور وضع داری وہ خوبیاں ہیں جو انسان کو کمال انسانیت پر پہنچاتی اور فرشتوں سے بڑھا دیتی ہیں - وہ اپنے کمال میں مگن تھے اور خود اپنے تئیں اقلیم سخن میں شہنشاہ سمجھتے تھے - اس میں شک نہیں کہ میرؔ کے کمال کی قدر خود انھیں کے زمانے میں ایسی

ہوئی مگر کم کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قدر زیادہ تر اُن کے زبردست کیریکٹر یعنی سیرت کی وجہ سے ہوئی ورنہ کمال کی قدر جیسی کچھ ہوتی ہے وہ معلوم ہے" اسی طرح عمدہ تنقیدی جملے آتے چلے جاتے ہیں اور میرؔ کی عظمت کا نقشہ ہمارے سامنے کھنچ جاتا ہے اسی سلسلے میں میرؔ کی مشہور بد دماغی کا ذکر ہو جاتا ہے مگر یہ صفت اب اس طرح نفرت کے قابل نہیں رہ جاتی جیسا کہ آزاد نے اسے بنا دیا تھا۔ یہ بھی شانِ وضع داری اور شانِ فن کاری کا ایک جزو نظر آتی ہے اور اس لئے احترام کے قابل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرؔ کو اُن کے صحیح رنگ میں پیش کر کے مولانا نے اُردو ادب کی بڑی ہی اہم خدمت کی ہے۔ اردو تنقید میں ایک بہت ہی بڑی غلطی کو صحیح کیا ہے اور کچھ ایسے جذبات کے ساتھ کہ ان کی تنقید ایک نیا باب کھولتی ہے۔

آخر میں مولانا اس سوال پر آتے ہیں کہ "میرؔ کی شاعری کا اثر ان کے ہم عصروں اور مابعد کے شاعروں پر کیا پڑا"؛ اس سوال کے جواب میں بھی وہ اُردو تنقید نگاری میں ایک نیا باب کھولتے ہیں۔ سوشل حالات کے، ادب پر اثر کے سلسلہ میں مولانا شاید پہلے اُردو نقاد ہیں جو رقم طراز ہوتے ہیں اور حسبِ ذیل جملوں میں اس قسم کی تنقید کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں" اصل بات یہ ہے کہ ملک کی شاعری اُس کے تمدن کی تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے، اُس کی جھلک اُس کی نظم و نثر میں آ جاتی ہے۔ اگر ہم اس زمانے کے لکھنؤ کو دیکھیں اور اُس کے تمدن پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اہل لکھنؤ کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس، آداب و اطوار غرض تمام طرز معاشرت میں سراسر تصنع پایا جاتا تھا۔ انہیں سوچ سمجھ کر کسی خاص امتیاز کے پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو عام روش زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی تھی اسی میں اُن کا علم و ادب بھی رنگا ہوا تھا۔ مگر اس زمانے کے لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی اور یہ ان کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں صاف نظر آتی ہے۔ وہ نئی تراشں اور جدت پر مٹے ہوئے تھے اور عوام و خواص میں اس کی بڑی قدر ہوتی تھی اس لئے سب کے سب ادھر ہی ڈھل گئے اور ساری ہمت تکلفات میں صرف کر دی۔ سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی۔ میرؔ اور ان کے ہم عصروں کا اثر زائل ہو گیا اور اُن کے بجائے دوسرے استاد پیدا ہوئے جو اس سوسائٹی کے سپوت اور اس تمدن

کے پروردہ تھے۔ حضرت ناسخ اور ان کے بعد خواجہ وزیر، صبا، اشک اور امانت وغیرہ کے کلام میں سوائے ضلع جگت، لفظی مناسبت اور تلازمہ اور دیگر تکلفات کے کچھ بھی نہیں۔"

مگر اس کے ساتھ ہی وہ جدید دور پر آکر لسانیات کے دائرے میں فوراً چلے جاتے ہیں اس "تذبذب کا ذکر کرتے ہیں جس میں اردو پھنسی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں" ایک فریق عربی پر تلا ہوا ہے اور دوسرا فریق سنسکرت پر، دونوں غلطی پر ہیں" ساتھ ہی ساتھ وہ حالی و سرسید کے زمانے کے لوگوں کی طرح ایک امید بھی دلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جب لوگ اردو زبان کی تاریخ، اس کی ابتدا اور اس کی نشوونما پر غور کریں گے اور زبان کے عمدہ نمونے ان کے پیش نظر ہوں گے تو وہ اس بے راہ روی سے خود بخود باز آجائیں گے جس میں سب سے بڑی تقویت مغربی تعلیم، وہاں کے عمدہ نمونوں اور صحیح تنقیدی اصولوں سے ملے گی اور گو میرؔ کا حقیقی اور اصلی رنگ واپس نہ آئے گا مگر اس کا کلام پھر بھی اسی شوق و ذوق سے پڑھا جائے گا اور جس حسن و سادگی کو ہم بھولے ہوئے ہیں اس کی یاد تازہ کرتا رہے گا اور ہم کو بھٹکنے سے روکتا رہے گا۔ یہ کیا کم احسان ہے؟"

ہمیں یہاں لسانیات سے غرض نہیں۔ اس لئے جس وقت مولانا نے یہ مقدمہ لکھا اُس وقت سے اِس وقت تک جو اردو کی حالت میں تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا ذکر ضروری نہیں۔ ہاں اس وقت جو حالت ہے اور آئندہ جو حالت ہوتی نظر آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا کلیۃً اس خوش فکری اور خوش فہمی پر مبنی ہے جو عہد وکٹوریہ کے انگلستان اور ہندوستان کی خاص صفت تھی بہرحال یہ "مقدمہ" اردو تنقید کو حالی سے اونچا لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر جگہ کامیاب بھی ہے۔

دوسرا مقدمہ "مسدس حالی" پر ہے۔ اس میں اتحاد، تاثر اور ربط میرؔ والے مقدمے سے کہیں زیادہ ہے۔ پورا مقدمہ ایک خاص جذبے کے ماتحت لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے اس تاریخی پس منظر کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے، جس میں حالی پیدا ہوئے۔ غدر کے، ادب پر اثر کو خاص طور پر واضح کیا گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے مقاصد پر نظر ڈالتے ہوئے "مسدس" پر نہایت ہی عمدہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ اردو تنقید نگاری میں آپ اپنی مثال ہے۔ اس کے بعد یہ جملے بطور تنقید کے رقم کئے گئے ہیں۔ یہ ایک سرسری اور ناقص

ساخاکہ اُس بے بدل نظم کا ہے۔ لیکن اس جوش اور گداز و فصاحت کی کیفیت، جو شروع سے آخر تک اس نظم میں پائی جاتی ہے الفاظ میں ادا نہیں ہوسکتی۔ زبان کا مزہ ہم اس سے پہلے عموماً غزلوں یا کبھی کبھی بعض مرثیوں یا مثنویوں میں لیتے تھے لیکن زبان کی حقیقی فصاحت دیکھنی ہو تو اس نظم میں دیکھنی چاہیئے۔ جس میں مختلف قسم کے مضامین و واقعات نہایت بے تکلفی اور روانی سے ادا کئے گئے ہیں۔ اس پر بیان کا تسلسل اور مضامین کی بلندی قابلِ دید ہے۔ نظم میں الفاظ کا صحیح استعمال جس طرح مولانا نے کیا ہے اور زبان کو اخلاق اور حکیمانہ خیالات ادا کرنے کے لئے جس طرح وہ کلام میں لائے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ بہت سے الفاظ جو دربارِ فصاحت میں بار نہیں پا سکتے تھے اور جن کے جوہر ہم پر اب تک نہیں کھلے تھے مولانا نے ان کی قدر کی اور انہیں ایسے ٹھکانے سے بٹھایا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں معمولی سادہ الفاظ جادو سا اثر پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی نے زبان کو وسعت نہیں دی، ایک نئی زبان پیدا کردی۔" اس تنقید پر جو اعتراض ہوسکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ مولانا پرانی ہی نکتہ چینی میں اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں اور زبان کی خوبی سے آگے نہیں بڑھتے۔

تیسرا اور چوتھا مقدمہ سید محمد اثر کے کلام پر ہے۔ ایک مقدمہ "دیوانِ اثر" ہے اور دوسرا مقدمہ اثر کی مثنوی "خواب و خیال" پر ہے۔ یہ دونوں تحقیق کے کارنامے ہیں۔ ایک غیر معروف شاعر کے کلام کو تلاش کر کے صاحبانِ ذوق کو اس کی خوبیاں سے آگاہ کرنا ان دونوں مقدموں کا اہم کام ہے۔ ان کے تنقیدی حصے نہایت معمولی قسم کے ہیں اور بعض جگہ تو کلام کو اس قدر اُونچا چڑھایا گیا ہے کہ تنقید مدح میں تبدیل ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ "خواب و خیال" کی جن الفاظ میں تعریف کی گئی وہ کسی طرح اس مثنوی کے لئے زیبا نہیں۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نقاد سے زیادہ ادب کے مُربّی ہیں اور بجائے خوبیوں اور نقائص کو ایک ساتھ دیکھنے کے خوبیوں کو سراہنا بہتر سمجھتے ہیں چاہے اس معاملے میں وہ حقیقت سے دُور ہی کیوں نہ نکل جائیں۔ یہ دونوں مقدمے ان کی نقادی کی حیثیت سے کمزوری کی مثالیں ہیں۔

"مقدمہ سی پارۂ دل" ایک قسم کا اشتہار ہے۔ اس کو مولانا یوں ختم کرتے ہیں "میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ عقل نے اجازت نہیں دی اور مصلحت نے قلم روک دیا اور کہا

"بس"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کی تنقید مصلحت کیشی کے تابع ہے۔ پھر بھی اُن کے اس اشتہار میں ایک احساسِ ذمہ داری ہے جس حد تک جدید اشتہارات نہیں پہنچ سکتے۔ اس مقدمے میں بھی اُن کی خاص دلچسپی یعنی زبان اور بیان سراہنا نمایاں ہے۔ مضامین کے فن کی طرف مولانا کی نگاہ نہیں جاتی۔ حسن نظامی کا رنگ ہی مرکزِ توجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں "ان کا رنگ سب سے نرالا ہے، خواجہ صاحب کے مضمون درد سے بھرے ہوتے ہیں۔" "جو دردِ دل اور عشق و محبت کے توسل سے وہاں پہنچنا چاہتے ہیں انہیں اسی میں لطف آئے گا۔" اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو اور دلّی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر پڑھو" غرض اس مقدّمے کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی "سی پارۂ دل" کی۔

برخلاف اس کے، "مقدمہ بر خطوطِ عطیہ بیگم" بہت ہی دلچسپ ہے۔ یہاں شبلی ایک خاص رنگ میں نمایاں ہوتے ہیں اور مولانا عبدالحق بھی تنقید کا وہ رنگ جمانے دکھائی دیتے ہیں جس کے وہ بظاہر اہل نہیں۔ وہ خطوط نگاری پر نکتہ چین کی طرح نہیں بلکہ سچے نقاد کی طرح اپنے خیالات رقم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "خانگی خطوں میں اور خاص کران خطوں میں جو اپنے عزیزوں اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشہ لائم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا؟ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وُہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں انسان بچپن کی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں۔ جنہیں نہ انشاء کی صنعت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل و دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے، جس میں ہر حرکت ہر خیال اور ہر تمنّا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔"

یہ صنعتِ خطوط نگاری پر اعلیٰ ترین تنقید کا نمونہ ہے۔ پھر وہ غالب کے خطوں پر

اسی پایہ کی تنقید کرتے ہیں، اور شبلی کے خطوں پر آ کر کہتے ہیں محبت کے دلولے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں کا لطف لینا ہو تو ان رقعات کو پڑھنا چاہیئے۔ یہ وہ جواہر ریزے ہیں جو ہمارے ادیبوں اور انشا پردازوں کے کلام میں مشکل سے ملیں گے اور اگر ہیں بھی تو یا تو فرضی اور بناوٹی یا پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔" اس کے بعد شبلی کی زندگی کی اُس خاص کشمکش کو مولانا نہایت دلچسپ طریقے پر واضح کرتے ہیں جو اپنے اندر ایک ڈرامائی کشمکش کا لطف رکھتی ہے۔ مولانا کا یہ مقدمہ اس کام میں پورا پورا کامیاب ہے کیونکہ اس کو پڑھنے کے بعد خطوں کو پڑھنے کا شوق شدت کے ساتھ ہمارے دل میں اُبھرتا ہے۔ مولانا اس مقدمے کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں" بعض تصانیف ان کی (شبلی کی) ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور انہیں میں یہ خطوط بھی ہیں جو بمنزلہ سدا بہار کے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تکلف اور بناوٹ سے بَری ہیں۔ یہ دلی جذبات اور خیالات کے نقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں بے ریائی اور خلوص کی سچی تصویریں ہیں جن کے ادا کرنے میں ادبی تکلفات اور انشا پردازی کے داؤں پیچوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا یہی وہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، پڑھنے والوں کے دل لُبھائیں گے اور اُن کے شوق کو تازہ رکھیں گے۔" مولانا عبدالحق کے اس مقدّمے کی بابت بھی ضروری ترمیم کے بعد یہی کچھ رائے دی جا سکتی ہے یعنی یہ کہ یہ مقدمہ بھی ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز ہے۔

آخری مقدمہ "باغ و بہار" ہے۔ تحقیقی تنقید میں یہ اپنی مثال نہیں رکھتا ہے۔ اس کے تحقیقی حصے کا استدلال یہ ہے کہ یہ قصہ چہار درویش امیر خسرو سے نہیں بلکہ "نو طرز مرصع" سے ماخوذ ہے۔ مولانا نے پورے معاملے کو صاف اور مختصر طریقہ پر یوں بیان کر دیا ہے:

> فارسی اور نو طرز مرصع کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نو طرز مرصع ہے۔ تعجب اس بات کا ہے کہ میر امن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمہ کا ذکر تو کیا مگر نو طرز مرصع کا ذکر صاف اڑا گئے۔ اب میں تینوں کتابوں سے بعض مقامات کا مقابلہ کر کے دکھاتا ہوں جس سے میرے بیان کی تصدیق ہوگی

اس کے بعد وہ نہایت محققانہ انداز میں مثالیں دیتے ہیں اور نتائج نکالتے ہیں۔ یہ پورا حصہ ادبی تحقیق کے اعلیٰ ترین درجہ پر ہے مگر تنقیدی حصّہ کچھ زیادہ تشفی بخش نہیں۔ اس میں صرف طرزِ ادا کا ذکر ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

> اُردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔ اگرچہ زبان نے بہت کچھ پلٹا کھایا ہے۔ اس وقت اور اس وقت کی زبان میں بہت بڑا بل ہے تاہم باغ وبہار اب بھی ویسی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے جیسے پہلے تھی۔ مُصنّف کو زبان پر بڑی قدرت ہے اور وہ ہر موقع پر اسی کے مناسب ٹھیٹ الفاظ استعمال کرتا ہے اور ہر کیفیت اور واردات کا نقشہ ایسی خوبی کے ساتھ کھینچتا ہے کہ اس کے کمالِ انشا پردازی کی داد دینی پڑتی ہے۔ نہ بے جا طول ہے نہ فضول لفّاظی ہے۔ سادہ زبان لکھنا سخت مشکل ہے۔ سادگی بعض وقت عامیانہ و بے مزہ ہو جاتی ہے۔ سادگی کے ساتھ فصاحت اور لطفِ بیان کو قائم رکھنا بڑا کمال ہے۔ میر امّن اس امتحان میں پورے اترتے ہیں اور یہی وجہ ان کی کتاب کی مقبولیت کی ہے۔"

آگے بڑھ کر بہت سی اور باتوں کا ذکر ہے جو لسانیات سے تعلق رکھتی ہیں اور لسانیاتی اُمور پر ہی مقدّمے کو ختم کیا جاتا ہے۔ "باغ وبہار" کو اگر تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں قوتِ قصہ گوئی کا بہت اچھا مظاہرہ ہوتا ہے۔ مولانا کی نگاہ اس امر کی طرف بالکل نہیں جاتی۔ وہ طرزِ ادا میں محو ہیں اور اس میں بھی پرانے طریقے ہی کی دلچسپی رکھتے ہیں ورنہ "باغ وبہار" کے طرزِ ادا کی بابت سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ قصہ گوئی کے لئے نہایت موزوں طرز ہے۔ اس کی جدید افسانوی ادب کے لئے اہمیت کو واضح کرنا نقاد کا ضروری فرض ہے مگر مولانا اس فرض کو ادا نہیں کرتے پھر بھی یہ اُردو تنقید میں مستقل اضافہ ہے۔ علاوہ بریں مولانا کے مقدّموں میں اگر ایک مقدّمہ ایسا چھانٹا جائے جو ہر طرح اُن کی تنقید نگاری اور ان کی تحقیق کی نمائندگی کرے تو وہ یہی مقدّمہ کرے گا۔

ان سات مقدموں میں چار خاص ہیں۔ انتخابِ کلام میر "مسدسِ حالی" "خطوط عطیہ بیگم" اور "باغ و بہار"۔ علاوہ ان کی تنقیدی اہمیت کے جو ان کی زندگی کی ضامن ہے یہ مقدمے اردو کی بڑی ہی اہم ہستیوں سے متعلق ہیں۔ میر کی اہمیت تمام اردو شاعری میں "مسدس حالی" کی اہمیت جدید اردو شاعری میں شبلی کی اہمیت اردو نثر میں "باغ و بہار" کی اہمیت افسانوی ادب میں کبھی کم نہیں ہوسکتی اور یہ مقدمے ان اہم تصانیف کے ساتھ اتنے گہرے طریقے پر وابستہ ہو گئے ہیں کہ ان کے ساتھ ساتھ ہمیشہ پڑھے جائیں گے اور اپنے پڑھنے والوں کی بصیرت کو بڑھاتے رہیں گے۔

---

"مولوی عبدالحق صاحب کی ادبی خدمات کا میں مدت سے معترف ہوں۔ خصوصاً مقدمہ نگاری میں، سب سے پہلے موصوف کے مقدمات میرے واسطے چراغِ ہدایت ہوئے تھے "

(حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر یار جنگ، ۱۹۴۱ء)

○

"دو تین روز ہوئے مجھے مکتبۂ ابراہیمیہ سے مُقدّمات کا اوّل حصّہ وصول ہوا۔ میں نے آپ کا دیباچہ اور شروانی صاحب کا مُقدّمہ پڑھا۔ آپ صاحبوں نے میری نسبت جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں، میں ہرگز اس کا مستحق نہیں ہوں۔ ایک معمولی مزدور ہوں لیکن آپ نے اپنی عنایت سے معمار بنا دیا ہے۔ یہ میں اِنکساری سے نہیں کہتا بلکہ امر واقعی ہے۔ ایسی حالت میں نہیں کہہ سکتا شکر کروں یا شکایت یہ محض آپ کی کریم النفسی اور مُروّت ہے جو آپ میری نسبت ایسا حُسنِ ظن رکھتے ہیں، ورنہ میں اپنی اور اَپنے مُقدّمات کی حقیقت سے خوب واقف ہوں۔ میرے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ مُقدّمات کبھی اس طرح کتاب کی صورت میں شائع ہوں گے۔ یہ صرف آپ کی قدردانی ہے جس کی بدولت اِنھیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ۔۔۔"

(مکتوبِ حق بنام: مولوی محمد بیگ، مرقومہ: ۱۲ر مارچ ۱۹۳۳ء)

○

آمنہ صدیقی

# مولوی صاحب کے مقدمات

تقریظ، دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ۔ یہ سب الفاظ بڑی حد تک مترادف ہیں، ممکن ہے از روئے لغت ان میں بہت فرق ہو، لیکن از روئے استعمال تو یہ ایک ہی طرح کے سانچے ہیں، جن میں چند پیش پا افتادہ باتوں ــ مصنف کی تعریف اور کتاب کی تعریف ــ کو ڈھال کر کسی بھی کتاب کی ضخامت بڑھائی جا سکتی ہے۔ رسم ہمارے ادب میں ایک عرصے سے چلی آ رہی ہے کہ اکثر مصنفین اپنی کتابوں کا آغاز "مستند" حضرات کے کلماتِ تحسین سے کرتے ہیں اور پھر ان کلمات کے عنوان کے لیے متذکرہ بالا الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ منتخب کر لیتے ہیں۔ اُردو کتابوں کے بیشتر دیباچے، مقدمے یا پیش لفظ دیکھ جائیے، سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ مصنفین کو نہ صرف قارئین پر بلکہ خود اپنی ذات پر بھی اعتماد نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس بے اعتمادی کی فضا کو ختم کرنے کے لیے ایسی اسناد فراہم کرتے ہیں جن میں کتاب اور مصنف دونوں کو ہی لاثانی قرار دیا گیا ہو۔ یہ روایت صحت مند ادبی فضا کے لیے سخت مضر ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور آئے دن ایسی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ جن میں ایک دو دیباچے نہیں بلکہ بیس بیس پچیس پچیس "اسناد" ہوتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دیباچوں (اور اب تو اس قسم کی تحریروں کے لیے اور بھی کئی نئے نئے عنوان وضع کر لیے گئے ہیں مثلاً سخن ہائے گفتنی، حرفے چند، حرفِ اول، پیش رس وغیرہ وغیرہ) کی ضخامت اصل کتاب سے کئی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

غالب پہلا شخص ہے، جس نے اِس رَوِش سے انحراف کیا، اگرچہ اس نے بعض روایتی انداز کی تقریظیں ضرور لکھی ہیں۔ لیکن "آئینِ اکبری"، کو جب سر سید احمد خاں

نے مدون کیا تو اس کے لیے غالب نے جو تقریظ لکھی اُس میں اُنھوں نے کچھ "صاف صاف باتیں" کہہ دیں، جو سرسیدؔ کو اس حد تک ناگوار گزریں کہ انھوں نے اس تقریظ کو شامل کتاب ہی نہ کیا۔ غالب کی یہ "بت شکنی" شاید پسندیدہ نگاہوں سے نہ دیکھی گئی اور شاید اسی لیے پھر کسی نے ایسی جرأت نہ کی۔

کسی کتاب پر مقدمہ یا دیباچہ لکھنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں، قابلِ اعتراض بات تو یہ ہے کہ اس مقدمے یا دیباچے کو مصنف یا کتاب کا اشتہار بنا دیا جاتا ہے۔ مقدمہ نگار اگر متعلقہ کتاب کے موضوع پر خود اپنے خیالات پیش کرے یا بعض ایسے امور کی طرف توجہ دلائے کہ جن تک مصنف کی نظر نہیں گئی تو یقیناً اس کا مقدمہ کام کی چیز بن سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

**انھوں نے اپنے مُقدّموں کو قصیدہ گوئی یا مناقب خوانی کی کھتونی نہیں بنایا۔ اُن کے مُقدمات کی علمی و ادبی حیثیت بعض اوقات اصل کتاب سے بڑھ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے تحقیقی و تنقیدی سرمائے میں اُن کے مُقدّمے ایک مُستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔**

مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا سے ہوتا ہے۔ اُن کا پہلا مقدمہ شاید کتاب "جنگ روس و جاپان" پر تھا جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اُن کا تازہ ترین مقدمہ "جدید اُردو لغات" پر ہے جو رسالہ اُردو (جنوری اپریل ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا ہے۔ گویا مولوی صاحب کی مُقدّمہ نگاری کی داستان پورے ساٹھ برسوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس دوران میں اُنھوں نے تقریباً پچاس[1]

---

[1] مولوی صاحب کے مقدمات کا مجموعہ دو جلدوں میں حیدر آباد دکن سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں تمام مُقدمات شامل نہیں ہیں (آ-ص) ۱۹۶۴ء میں اُردو مرکز لاہور سے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے "مقدماتِ عبدالحق" کا اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔ لیکن یہ بھی مولوی صاحب کے سب مقدمات پر حاوی نہیں (م-ا-ر)

مقدمے لکھے۔

یہ مقدمات اپنے موضوعات کے اعتبار سے گوناگوں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تلاش و تحقیق کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کتاب، مصنف اور موضوع کے بارے میں صرف وہی باتیں کہتے ہیں کہ جو عام نگاہوں سے اُوجھل ہوتی ہیں۔

مولوی صاحب نے ہر طرح کی کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ ادب، تاریخ، سائنس فلسفہ، مذہب غرض کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر اُنھوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ زیادہ مقدمے اُردو کی قدیم کتابوں پر ہیں جو اُنھوں نے خود مرتب کیں۔ مثلاً اُردو شاعروں کے بعض اہم تذکروں (مثلاً نکات الشعرا، گلشنِ ہند، چمنستانِ شعرا، گلِ عجائب، مخزن شعرا وغیرہ) اور قدیم ادب کی بعض نادر کتابوں (مثلاً سب رس، معراج العاشقین باغ وبہار، مثنوی خواب وخیال، دریائے لطافت) پر اُنھوں نے جو مقدمے لکھے وہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس قسم کے مقدموں میں مولوی صاحب کتاب کی اہمیت پر خاص طور سے زور دیتے ہیں۔ اس کے ادبی و علمی معیار کو جانچتے ہیں، اسی نوع کی دوسری کتابوں سے اُس کا موازنہ کرتے ہیں، خوبیوں اور خامیوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ مُصنّف کے حالاتِ زندگی پر بھی وہ خاص توجہ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ بڑی تحقیق سے کام لیتے ہیں، مثال کے طور پر "چمنستانِ شعَرا" (از لچھمی نرائن شفیق) کا مقدمہ ملاحظہ کیجئے۔ اس میں ابتداً مصنّف کے حالاتِ زندگی ہیں، پھر اُس کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ اُس کی تذکرہ نگاری کی خصوصیات پر بحث ہے (اسی میں "چمنستانِ شعرا کا جائزہ بھی شامل ہے) اور پھر اس کے کلام کی خصوصیات اُجاگر کی گئی ہیں۔ گویا "چمنستانِ شعرا" کا یہ مُقدمہ شفیق کی زندگی اور اس کے کارناموں کا ایک محققانہ جائزہ ہے۔ اسی طرح "باغ وبہار" اور "سب رس" کے مقدموں میں اُنھوں نے وجہی اور میرامن کے حالات، اُن کی کتابوں کے ماخذات و مماثلات اور ان کی زبان پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے تحقیق کا ایک اعلیٰ معیار سامنے آتا ہے۔

مولوی صاحب کے مُقدّمات کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے جو اپنی افادیت

کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ یعنی بعض مقدموں میں موضوع کتاب کی پوری تاریخ بیان کر دی جاتی ہے، اور یہ تاریخ، قاری کو اصل کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے، اس سلسلے میں دو مقدمے بڑے معرکے کے ہیں۔ ایک "قواعد اُردو" اور دوسرا "جدید اُردو لغات" کا مقدمہ۔ پہلے مقدمے میں انھوں نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ اُردو زبان کی قواعد کی کتابیں کس زمانے سے لکھی جارہی ہیں اور پھر ہر کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح "جدید اُردو لغات" کے مقدمے میں تمام اُردو لغات کا تاریخی جائزہ لیا ہے، اور ان کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی ہے۔ یہ دونوں مقدمے بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادبی کتابوں پر جو مقدمے مولوی صاحب نے لکھے ہیں ان میں سے بعض نقدِ عالیہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً "انتخاب کلام میر" "مسدس حالی" "خطوطِ شبلی" اور "اُردو تنقید کا ارتقاء" کے مقدمے۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی صاحب کا سب سے اچھا مقدمہ "انتخابِ کلام میر" پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مقدمہ میرؔ سے متعلق بڑی بڑی کتابوں پر بھی بھاری ہے۔ اس میں میرؔ کے حالاتِ زندگی بڑی تحقیق کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ اہم ترین حصّہ وہ ہے جو میرؔ کے شاعرانہ کمالات پر مشتمل ہے۔ یہ حصّہ عملی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے۔" مسدسِ حالی" پر مولوی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں مولانا حالی کے عہد کے سیاسی و سماجی تحرکات، اُن کے شاعرانہ محاسن اور مسدس کا تجزیہ، بڑے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ "اُردو تنقید کا ارتقاء" (از ڈاکٹر عبادت بریلوی) پر جو مقدمہ ہے، وہ اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ مولوی صاحب نے پہلی بار اس میں فنِ تنقید کے متعلق اپنے نظریات پیش کئے ہیں، اور اس فن کی تعریف نہایت عمدہ پیرائے میں کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چند صفحے کا یہ مقدمہ، اصل کتاب سے (جو پانچ سو۵۰۰ صفحات سے زاید پر مشتمل ہے) زیادہ مفید ہے۔

سوانحی اور تاریخی کتابوں پر مولوی صاحب نے جو مقدمات لکھے ہیں۔ ان میں "حیات النذیر" "مشاہیر یونان و روما" "تمدن ہند" "آثار الکرام" اور "ناقابلِ فراموش"

کے مقدمے ہر اعتبار سے ناقابلِ فراموش ہیں۔ "حیات النذیر" کا مقدمہ دِل چسپ بھی ہے، اور فکر انگیز بھی۔ دِل چسپ اِس لحاظ سے کہ اس میں دو ایک جگہ بعض لوگوں پر بہت دلکش پیرائے میں طنز کیا گیا ہے، فکر انگیز یوں ہے کہ اس میں فن سوانح نگاری کے بارے میں بعض بنیادی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ شبلی کے دیباچہ "الفاروق" کے بعد اُردو زبان میں یہ دوسری تحریر ہے کہ جس میں فن سوانح نگاری کی حدود سے بحث کی گئی ہے۔ مقدمہ "مشاہیرِ یونان و روما" کے ابتدائی چند صفحات، مطالعے یا پڑھنے کی عادت کے بارے میں ہیں۔ مولوی صاحب نے ان چند صفحوں میں بڑی خوش اسلوبی سے ملٹن کے اس قول کی تفصیل پیش کی ہے: "عمدہ کتاب حیات ہی نہیں بلکہ ایک لافانی چیز ہے۔" "تمدنِ ہند" کا مقدمہ دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں اس کے مترجم مولوی سیّد علی بلگرامی کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں، اور دوسرے حصے میں تمدنِ ہند "پر بحث کی گئی ہے۔ اس مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مطالعہ صرف ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ سماجی اور سیاسی علوم سے بھی پوری طرح واقف ہیں، قوموں کے عروج و زوال اور ان کی تہذیبوں پر بھی ان کی نظر بہت گہری ہے۔

سائنس اور مذہب سے متعلق جن کتابوں پر مولوی صاحب نے مقدمے لکھے ہیں وہ یہ ہیں: "اعظم الکلام فی ارتقا الاسلام"، "تحقیق الجہاد" "معرکہ مذہب و سائنس اور" پر اسرار کائنات"۔ ان مقدموں سے مولوی صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مذہب اور سائنس پر اُن کی نظر بہت گہری ہے۔ " اعظم الکلام فی ارتقا الاسلام" مولوی چراغ علی کی کتاب ہے۔ جس کا ترجمہ خود مقدمہ نگار نے کیا۔ اس مقدمے کے بھی دو حصے ہیں پہلے میں مصنف کے حالاتِ زندگی قدرے تفصیل سے بیان کئے ہیں، اور دوسرے میں موضوعِ کتاب سے بحث کی ہے۔ مولوی صاحب نے اس حصے میں کتاب کا تعارف اِس انداز سے کرایا ہے کہ مصنف کا مافی الضمیر بڑی خوبی سے واضح ہو جاتا ہے، ضمنی طور پر بعض مذہبی اور معاشرتی مسائل پر بھی بڑی خوش اُسلوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ "پُراسرار کائنات" کا مقدمہ اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں مولوی صاحب نے ترجموں کی ضرورت اور اہمیت

کو واضح کیا ہے۔

"معرکۂ مذہب و سائنس" مولوی صاحب کا طویل ترین مقدمہ ہے۔ یہ تقریباً ایک سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ بجائے خود ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے اُردو میں یہ ایک بالکل نئی چیز ہے، اور مولوی صاحب کو ایک مُفکّر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس مقدمہ میں غور و فکر کی وہ تمام بلندیاں ملتی ہیں جو کسی بھی تصنیف کو حیاتِ دوام بخش سکتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ مولوی صاحب کا بہترین مقدمہ ہے (اس مقدمہ پر تفصیلی بحث ایک دوسرے موقع پر کی جا چکی ہے

مختصر یہ کہ مولوی صاحب کے مقدّمے علم و ادب کی بعض ایسی راہوں سے مُتعارف کراتے ہیں کہ جہاں سے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ ان کی تحقیق بعض ایسے حقائق کو بے نقاب کرتی ہے کہ جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اِن کی تنقید ادب پاروں کی قدر و قیمت اس طرح مُتعیّن کرتی ہے کہ ان کی دیانت داری پر ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی شک نہیں کر سکتا۔ اِن مُقدّمات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مُطالعہ نہایت وسیع ہے اور علم کا کوئی شعبہ اُن کی دسترس سے باہر نہیں مختصر یہ کہ مُقدّماتِ عبدُالحق ہمارے تنقیدی و تحقیقی سرمائے کا لازوال حصّہ ہیں۔

ڈاکٹر محمود الٰہی

# مُقدّماتِ عبدُالحق پر ایک نظر

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ حیات وکائنات کے دوسرے مسائل سے مُنھ موڑ کر صرف اُردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے، اُن میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔

اُردو اُن کی حیات ہے اور اُردو ہی اُن کا سرمایۂ حیات ہے!

ہر کٹھن وقت پر اُردو کی آبرو اُنھوں نے بچائی ہے اور ہر سخت منزل پر اُردو دوستوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ اُنھوں نے ادبی ہنگاموں میں اپنی ذات کو نہیں اُلجھایا۔ اُن کے سامنے مختلف تحریکوں نے سر اُٹھایا۔ اور اُنھوں نے سرپرستی بھی سب کی کی۔ لیکن صرف اس حد تک جو زبان وادب کی تعمیر وتزئین کے لیے مفید ثابت ہو۔ اُنھوں نے ہمیشہ ٹھوس خدمت کی اور ہر تحریک سے ٹھوس خدمت کا مطالبہ کیا!

ڈاکٹر صاحب کی شہرت عام طور پر اُن کے مُقدّموں کی وجہ سے ہے اور نقّادوں کے ایک گروہ نے تو اُنھیں ایک پیشہ ور مُقدّمہ نگار کے علاوہ اور کچھ ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس رائے زنی کے پیچھے تنقید نگاروں کی وُہ انتہا پسندی کام کر رہی ہے جو مشرق ومغرب کے ادب کو ایک ہی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے، جسے مشرق کی ہر تعبیر میں اک صورت خرابی کی نظر آتی ہے اور جسے اسلاف کی ہر روایت ایک گناہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو اعلےٰ درجے کی تنقیدی صلاحیت رکھنے کے باوجود اُردو ادب کو اس کے پس منظر، مُحرّکات اور عوامل سے الگ کر کے پرکھتے ہیں۔

مُقدّماتِ عبدُالحق تقریظ نگاری کے نمونے نہیں۔ ان سے کسی ادیب یا شاعر کی غیر ضروری تشہیر مقصود نہیں۔ یہ ستائش کی تمنّا اور صلے کی پروا سے بے نیاز

ہو کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں تنقید و تحقیق کے عناصر کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ تنقید، تحقیق کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔

تحقیق سے ایک مصنف یا شاعر کا ہر گوشہ سامنے آجاتا ہے، وہ راستے بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ جن پر وہ تھوڑی دور بھی چلا ہے۔ اُس کی تخلیقات ایک بڑی حد تک الحاق و اضافہ اور اقتباس و اشتباہ کے الزام سے بری ہو جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں قوتِ تنقید اُس مصنف یا شاعر کا درجہ متعین کرنے میں غلطی نہیں کرتی۔ نقاد اس مواد پر فتویٰ دیتا ہے جو اُس کے سامنے رہتا ہے۔ محقق صحیح مواد نقاد کے سامنے رکھتا ہے!

ڈاکٹر صاحب کے مقدموں سے اُن کی بے پناہ علمیت اور وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ہر مصنف کی تہ تک پہنچ کر دم لیتے ہیں اور پھر تصنیف کے اہم نکات و رموز پر بحث کرتے ہیں۔ بحث میں وہ سرسری یا سطحی بات نہیں کہتے۔ اُن کے بحث کا انداز جذباتی بھی نہیں ہوتا۔ اُن کا طریقۂ استدلال اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ جس مصنف پر وہ، اظہارِ خیال کر رہے ہیں اُس کا بغور مطالعہ کیا جائے، اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جائے۔ وہ اپنی رائے کے اظہار کے بعد دوسروں کی رائے کا انتظار کرتے ہیں۔ اور شاید اسی سبب سے کبھی کبھی اُن پر فیصلے کی عدم قطعیت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن الزام لگانے والے یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ یہی عدم قطعیت قاری کے ذہن کو بالیدگی و توانائی بخشتی ہے۔

> وہ اپنی ناقدانہ نگاہ سے دوسروں کے تنقیدی شعور کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اُن نقادوں کی صف میں نہیں جو مصنف کی شخصیت نمایاں کرنے کے بجائے اپنی شخصیت نمایاں کریں۔ وہ تنقید سے تسلط و تغلب نہیں، افہام و تفہیم کا کام لیتے ہیں اور تنقید کو اس کے علاوہ کچھ اور ہونا بھی نہیں چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب کے مقدمات وقتی اُبال یا جذباتی ہیجان کا نتیجہ نہیں کہ اس کی افادیت پر زوال آجائے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و قیمت بڑھتی جائے گی۔

اگر یہ مقدمے نہ ہوتے تو کلاسیکل لٹریچر کے تحفظ و احترام کا اور پھر اُسے ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کا جذبہ اتنا عام نہ ہوتا جتنا اب ہے۔ ان مقدموں نے اگر ایک طرف اُردو زبان و ادب کی اہم کڑیوں میں روح دوڑا دی ہے تو دوسری طرف خود ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

مولوی محمد بیگ مرحوم

# مقدّماتِ عبدالحق

(سے متعلق ایک اہم دستاویز)

مولوی عبدالحق صاحب موصوف نے متعدد مشہور مصنّفین و مولفین کی کتابوں پر مقدّمات لکھتے ہیں۔ یہ مقدّمات مختلف اعتبارات سے بہت ہی قابلِ قدر اور دلچسپ ہیں خصوصاً انتقادی اصولوں کا کافی سرمایہ ان میں موجود ہے۔ مجھے چند کتابوں میں مقدّمات پڑھنے کے بعد خیال پیدا ہوا کہ ایسے مقدمات کو ایک جگہ کر کے شائع کیا جائے تو نہ صرف ایک علمی خدمت انجام پائے گی بلکہ زبان اردو میں طرزِ مقدمہ نویسی اور انتقادی اصولوں کو معلوم کرنے کا قیمتی مواد بھی فراہم ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے ان کتابوں میں سے، جن پر مقدّمات لکھے گئے تھے، مقدمات کی نقلیں لینے کا کام شروع کر دیا۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کن کن کتابوں پر مقدّمات لکھے گئے ہیں، میں نے مولوی صاحب موصوف سے مراسلت بھی کی۔ سلسلۂ بیان میں مولوی صاحب کے خطوط میں سے ایک "اہم" خط دلچسپی سے بھی خالی نہ ہوگا:

اورنگ آباد (دکن)، ۶ خورداد ۱۳۳۵ف

شفیق و مکرمی زاد لطفہ

عنایت نامہ اور اس کے ساتھ چار مقدموں کی نقل پہنچی جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے چاہا تھا اور کئی عنوان سے عرض بھی کیا تھا کہ آپ معرکۂ مذہب و سائنس کو اس مجموعے میں داخل نہ فرمائیں لیکن آپ نہ مانے۔ تعجب ہے کہ یہ مقدّمہ آپ کو پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ میرے نوٹ تھے جو میں نے مقدمے کے لیے تیار کئے تھے۔ ظفر علی خاں صاحب کو آپ جانتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں جلد بازی ہے۔ وہ آئے اور لے کر چل دیئے۔ اس کے بعد دفعتۂ ان کا یہاں سے جانا ہوا۔ میں نے بہت کہا کہ اسے واپس کر دو تو میں اصل مقدمہ جو لکھنا چاہتا ہوں لکھ دوں گا مگر انھوں نے کاغذات واپس نہ کئے اور یہ خیال کیا کہ شاید میں نہ لکھوں یا کاغذات تلف کر دوں اور آخر یہی چھپ گئے۔ مجھے یہ مقدمہ اس لئے بھی پسند نہیں کہ اگر

ہیں اب لکھتا تو وہ کچھ اور ہوتا۔ یہ وجوہ تھے کہ میں چاہتا تھا کہ یہ مُقدمہ اس مجموعے میں شائع نہ ہو۔ مگر اب آپ کو روک بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ شائع ہو چکا ہے لیکن اگر کبھی مجھے ان مُقدمات کے چھاپنے کی توفیق ہوتی تو میں اسے کبھی شامل نہ کرتا۔ بہر حال اب آپ کی جو رائے ہو۔ میں دیکھ کر بھیج دیتا ہوں۔

مقدمۂ کلامِ میرؔ کو میں از سرِ نو لکھنے والا ہوں۔ اس میں کچھ تغیر و تبدّل کی ضرورت ہے۔

اس زمانے میں مَیں نے ایک اور مُقدّمہ لکھا ہے جو فرہنگِ اصطلاحات علمیہ پر ہے۔ یہ کتاب انجمن کے طرف سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ مَیں چاہتا تھا کوئی اور صاحب لکھ دیتے۔ ایک صاحب نے وعدہ بھی کیا تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا اور وعدہ وفا نہ ہوا جب دو روز رہ گئے تو ناچار میں نے خود لکھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ اس کتاب کی کچھ جلدیں جشن جوبلی علی گڑھ میں لے جاؤں۔ فوراً لکھا اور چھپوایا۔ راتوں رات کچھ کتابوں کی جلدیں بنوائیں اور جوبلی میں ساتھ لے گیا۔ آپ فرمائیں تو کتاب بھیج دوں۔ اسے ملاحظہ فرمایئے اگر مناسب خیال فرمائیں تو شریک کر دیجئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مولانا شروانی کے عزمِ حج کی اطلاع سے مجھے بھی کھٹکا ہوا تھا کہ اب مُقدمے[1] کا خدا حافظ لیکن ان کے خط سے جس کی نقل آپ نے بھیجی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور لکھیں گے لیکن یہ بھی آپ سے کہے دیتا ہوں کہ وہ بہت دیر لگائیں گے۔

تعجب ہے کہ مُقدّمہ تمدن ہند آپ کو اب تک نہیں ملا۔ اڈیٹر ''الناظر'' کے پاس ضرور ہوگا۔ ان کے پاس اپنے رسالے کی تمام جلدیں مکمل موجود ہیں وہ چند روز کے لئے مستعار دے سکتے ہیں یا نقل کروا کر بھیج سکتے ہیں۔ میں ہاشمی صاحب کو لکھتا ہوں کہ وہ پھر لکھیں اور تاکید کر کے منگوا لیں۔

آپ عطیہ بیگم کے خطوط سے مُتردّد نہ ہوں۔ اس سے مولانا شبلی کی کچھ مَنقصت نہیں ہوتی۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ وُہ زرے خُشک مُلّا یا مولوی ہی نہ تھے بلکہ لطیف

---

[1] مجموعہ مُقدّمات پر کسی مشہور شخصیت سے مقدمہ لکھوانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی (صدر یار جنگ، سابق صدر الصدور حیدر آباد دکن کی خدمت میں استدعا کی گئی۔ جسے انھوں نے منظور فرمایا۔ پانچ چھ سال کی کوششوں کے بعد یہ کتاب (مُقدّمات عبدالحق، ۱۹۳۳ء میں) مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

انسانی جذبات بھی رکھتے تھے۔ وہ شاعر تھے اور عاشق مزاج بھی تھے اور یہ انسان کے لئے عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ اس سے اُن کی وقعت اور بڑھنی چاہیئے۔ لوگوں کو سمجھنے اور بدگمانی کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ رائیں فوری ہوتی ہیں۔ صحیح فیصلہ زمانے کے ہاتھ ہے۔

ملاقات کے متعلق ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اعظم الکلام اور تمدن ہند کے مُقدموں میں ایک حصہ مُصنّفین کے ذاتی حالات کا ہے۔ یہ حصہ زیادہ قابل قدر ہے کیونکہ ان دونوں کے حالات اس نہج سے کہیں نہیں ملیں گے اور ان کے کاموں کو سمجھنے کے لئے ان کا ہونا ضروری ہے۔ بعض صاحبوں نے ان حالات کی بہت قدر کی تھی کیونکہ وہ اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ان مُصنّفین کی سیرت کے پڑھنے والوں کو صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نامناسب نہ خیال کریں تو یہ حصہ بھی ضرور شریک کر دیجئے ورنہ جو آپ کی رائے ہو، مجھے کوئی اصرار نہیں۔ اس کتاب کی ترتیب وغیرہ آپ کی رائے اور ذوق پر موقوف ہے۔

نیاز مند

عبدالحق

---

"مولانا حالؔی سے اکثر ہم خیال ہوتے ہوتے بھی ڈاکٹر عبدالحق کی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔"

ڈاکٹر اعجاز حسین

"مُلک کے پورے طول و عرض میں، جس میں اُردو زبان کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں سے بڑھی ہوئی ہے، اس کی خدمت کرنے والوں کی تعداد، اگر مولوی عبدالحق نہ ہوتے تو صفر ہوتی۔ اُنہوں نے سادہ نگاری کو ترقی دی، نقد و تبصرے کی نئی راہ نکالی، اُردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھا دی ادب اور تاریخِ ادب پر تحقیقی مضمون لکھے۔ اُردو کے قواعد کو نئے سرے سے مُرتب کیا، اُردو لُغت اُردو تذکرے۔ اُردو کے پُرانے دیوان اور اُردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں اور انجمن ترقیٔ اُردو کو ہر حیثیت سے وہ ترقی دی کہ آج وہ مُلک کا ایک زندہ ادارہ ہے ——"

—— سیدؔ سلیمان ندوی

# تنقیدات

○

"مولوی عبدالحق اپنے عہد کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔ اُردو میں تنقید و تبصرے پہلے بھی تھے لیکن جب اُنھوں نے قلم اٹھایا تو بلا شبہ اس کی زمین کو رشکِ آسماں بنا دیا۔ ... وہ زیرِ تبصرہ کتاب کا اس طرح جائزہ لیتے ہیں کہ اس کا کوئی قابلِ ذکر پہلو اُن کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ جاتا — اور پھر وہ چند صفحوں میں کتاب کے متعلق ساری ضروری معلومات اور اس کی خوبیاں اور خامیاں ایسے منجھے ہوئے انداز اور سلجھے ہوئے پیرائے میں قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں کہ اُسے کتاب کے بارے میں کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے ... (مولوی عبدالحق کی) تنقیدیں اور تبصرے اُن کی حقیقت پسندی اور صداقت شعاری کا آئینہ ہیں اور ان سے نہ صرف اُن کے علمی مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ اُن کی عظیم شخصیت اور ان کے بلند کردار کی "مطابقِ اصل" تصویریں بھی ہیں۔"

——— حکیم اسرار احمد کریوی

مُتین الرحمٰن مرتضیٰ

# اُردو تنقید اور عبدُالحق

## تنقید

تنقید کیا ہے؟ اس کا عمل کیا ہے!؟ ان بنیادی سوالات کے جواب میں صراحت و وضاحت کے لیے مختلف اقوال، متعدد نظریات اور بہت سی اختلافی آرا پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن چوں کہ موضوعِ بحث "تنقید" نہیں ہے۔ اس لیے اجمالاً عرض ہے کہ تنقید شب کو تاریک اور دن کو روشن بتاتی ہے۔ تنقید کی ایک بُنیادی قدر دیانت و انصاف ہے تنقید خوب و زشت، کذب و صدق، پست و بلند اور ادنا و اعلا میں امتیاز کرتی ہے۔ تنقید وضاحت و صراحت ہے، تحلیل و تجزیہ ہے اور کچھ قدروں کا تعین ہے[۱] تنقید محض محاسن بینی ہے اور نہ معائب جوئی بلکہ تنقید فنّی محاسن اور معائب کی دیانت دارانہ نشان دہی کا نام ہے اور نہ ہی تنقید خوب و زشت کا کوئی ایسا صریح حکم ہے، جو ناظر کی قوتِ فیصلہ کو مُعطّل کر دے۔ تنقید فن کار کو بے راہ روی اور عامیانہ پن سے محفوظ کر کے فن میں تنوّع اور تفرّد کی تحریک کرتی ہے۔ گویا تنقید ادب کی اتالیق ہے۔ کمالِ تنقید کے لیے ولولۂ تحقیق، عمیق مشاہدہ اور وسعتِ مطالعہ از حد ضروری ہے۔ تاکہ ذہن پختہ، فکر و نظر بالیدہ اور مذاق سنجیدہ ہو سکے یا ایلیٹ کے الفاظ میں "نقاد کا ذہن آفاقی" ہو سکے۔ یہ خیال درست نہیں کہ بگڑا کہ شاعر مرثیہ گو" کے مصداق بگڑا ادیب ناقد ہوتا ہے ڈسرائیلی (Disraeli) کا خیال دُرست ہے کہ "نقاد وُہ نہیں جو فنِ ادب میں

---

[۱] تنقید کیا ہے؟ آل احمد سرور صفحہ ۲۰۲

ناکام ہو بلکہ وہ ناظر اور طالب علم کا رہنما، فلسفی اور دوست ہوتا ہے۔" تنقید کو تخلیقی سرگرمی خیال نہ کرنا بھی قرینِ حقیقت نہیں۔ ہڈسن ٹھیک کہتا ہے کہ " راست تنقید بھی چوں کہ اپنا مواد اور جذبہ، حیات سے حاصل کرتی ہے چناں چہ وہ بھی اپنے رنگ میں تخلیقی ہے تنقیدی شعور بھی تخلیقی شعور کے ساتھ ہی ساتھ جاگتا ہے اس لیے کہ فن کار اپنی تخلیق کو معراجِ کمال تک پہنچانے کے لیے اس میں گرمیٔ حسن پھونکنا چاہتا ہے۔ گرمیٔ حسن پھونکنے سے پیشتر حسن کا کوئی معیارِ قدر متعین کرنا پڑتا ہے اور حسن کے کسی قدری معیار کے تعین کے لیے تنقیدی شعور کی بیداری ناگزیر ہے۔ اس طرح متخیلہ تخلیق کے خارجی صورت اختیار کرنے سے پیشتر ہی تنقیدی شعور کی بیداری عمل میں آجاتی ہے۔ تنقیدی شعور کی اعانت ہی سے تخلیقی شعور کا مہیا کیا ہوا مواد فن کار کے فن کی صورت میں منصۂ شہود پر آتا ہے۔ یعنی قوتِ متخیلہ کی پیش کش قوتِ متفکرہ کی مناسب تراش خراش کے بعد خارجی صورت اختیار کرتی ہے۔ فن کار کی قوتِ متخیلہ اس کا تخلیقی شعور ہے اور قوتِ متفکرہ اس کا تنقیدی شعور بعض اوقات قوتِ متفکرہ کی دست بُرد قوتِ متخیلہ کی پیش کش کے خارجاً ظہور پذیر ہو جانے کے باوصف بعد تک جاری رہتی ہے۔ فی الاصل تنقید کا مادہ جبلّی ہے جو قدرت کی جانب سے دیگر مقتضیاتِ بشری کے ساتھ فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے اور جس کی کارفرمائی تمام افعالِ انسانی میں کم و بیش ہوتی ہے[۱] یہی فطری تقاضہ ادب پر اثر انداز ہو کر ادب میں ایک علاحدہ شعبہ اور ایک مستقل فن کو ظہور میں لایا۔

## اُردو ادب اور تنقید

ہر زبان کے شعر و ادب میں تنقید کا وجود بھی اتنا ہی قدیم ہے، جتنا کہ بجائے خود شعر و ادب کا جیسا کہ ماقبل کی تحیص سے واضح ہے، لیکن یہ بات خاصی دل چسپ ہے کہ اُردو ادب کے تدریجی ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے حالیؔ سے باقاعدہ شعبۂ تنقید کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور معاً یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کیا حالیؔ سے پیشتر

---

[۱] "تنقیدی سرمایہ" عبدالشکور صفحہ ۵

تنقید نے اُردو ادب میں جنم ہی نہ لیا تھا۔ اس سوال کا مستقل رائے کی صورت اختیار کرلینا۔ بجائے خود ایک غلط فہمی ہوگا۔ جیسا کہ اوپر کہیں تحریر کیا جا چکا ہے ہر ادیب و شاعر کے ذہن میں ادبی تخلیق کو زیورِ فن سے مزّین کرنے کیلئے خوب و ناخوب کا کوئی نہ کوئی معیارِ امتیاز ضرور قائم رہتا ہے۔ کیوں کہ ادیب کے ذہن کی تنقید کے شعور سے بیگانگی کی صورت میں ادب العالیہ کی تخلیق ہی ممکن نہیں چناں چہ ایلیٹ لکھتا ہے کہ "جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو اکثر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے" پس یہ بات باور نہیں کی جاسکتی کہ اُردو ادب تنقید کی عدم موجودگی کے باوجود حالیؔ تک ارتقائی منازل طے کرتا رہا ہو۔ اُردو ادب میں حالیؔ سے پیشتر باقاعدہ شعبۂ تنقید کی ناپیدگی کی چند وجوہات ہیں :

(۱) حالیؔ سے قبل کے دور میں شعرا اور نثر نگاروں کے لیے اپنی تخلیقات پیش کرنے کا بڑا ذریعہ مشاعرے اور جلسے (درباری مجالس) تھے۔ اوّل تو دربار مشاعروں اور مجلسوں میں تنقید کا موقعہ بہت کم میسّر آتا ہے۔ اگر تنقیدی نظریات کے اظہار کا موقعہ ملتا بھی تھا تو ان تمام تنقیدی خیالات کا اظہار جستہ جستہ زبانی ہی ہوتا تھا۔ ان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا اہتمام یوں نہ ہوتا تھا کہ تنقید ان مشاعروں اور مجلسوں کا مقصود بالذات نہ ہوتی تھی۔ پھر طباعت و اشاعت کے لیے آج کی سی سہولتیں نہ تھیں کہ ان تنقیدی نظریات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا اہتمام کیا جا سکتا۔ نہ ایسے وسائل مہیّا تھے کہ تنقیدی رُجحانات کی اشاعت اور وسعت ہو سکتی۔

(۲) ایک وجہ شعبۂ تنقید کی ناپیدگی کی یہ بھی ہے کہ ہندوستان کا دورِ قدیم عقیدت کیشی کا دور تھا اور اسی عقیدت کیشی کے باعث کسی کے سامنے یارائے دم زدن نہ تھا۔ ایسی صورت میں تنقیدی ادب کی پیداوار ضرور کم ہونی چاہیئے [۱]

(۳) ہمارے ہاں تنقید کی حیثیت ہمیشہ ثانوی تسلیم کی گئی۔ تنقید کو کبھی تخلیق کا درجہ نہ دیا گیا [۲]

---

[۱] "تنقیدی سرمایہ" عبدالشکور صفحہ ۸۔ [۲] "تنقید کیا ہے؟" آل احمد سرور صفحہ ۱۹۳-۱۹۴

دراصل اُردو شاعری میں مختلف نوعیت کے مضامین اور موضوعات کے ادا کرنے کے لیے مختلف اصنافِ سخن کی تدوین اور ان کے لیے مناسب اسالیب کی تخصیص ابتدا ہی سے ہوگئی تھی۔ اس لیے کہ اُردو شاعری عربی و فارسی کی شاعری کے نقشِ قدم پر رواں تھی چناں چہ ان زبانوں کی "تنظیم و تقسیم" کو اُردو شاعری نے اپنے اوائل ہی میں پوری طرح اپنا لیا تھا۔ اُردو نثر کی بنا بہت بعد کو پڑی۔ نثر میں موضوعات کا تنوّع اُس وقت ظہور میں آتا ہے، جب وہ اپنی علمی افادیت منوالیتی ہے۔ نثری اصناف اور ان کے لیے حسبِ اقتضا اسالیب کی تخصیص کی ضرورت بھی اُسی وقت لاحق ہوتی ہے جب وہ علمی صورت اختیار کرتی ہے۔ چناں چہ جس طرح فارسی اور عربی کی شاعری نے اُردو شاعری کو متاثر کیا بعینہٖ مغرب کے نثری ادب نے اُردو نثر کو علمی وسعت اور گہرائی سے متمتع کر کے اس میں اپنے مزاج اور ہیئتِ ترکیبی کی مطابقت سے اصنافِ نثری اور مخصوص اسالیب کی بساط بچھا دی۔ یہ عمل انیسویں صدی کے آواخر سے شروع ہو کر بیسویں صدی میں مکمل ہوا۔ چناں چہ حامد حسن قادری "داستانِ تاریخ اُردو" میں لکھتے ہیں:

"عصرِ حاضر میں مغربی تعلیم سے اُردو کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا اور زبان و ادب کی اصل خدمت ہوئی وہ یہ کہ فلسفہ و سائنس، تاریخ و سیرت، ادب و انشا، تبصرہ و تنقید، ناول و افسانہ وغیرہ مختلف موضوعات کے لیے الگ الگ مناسب و موزوں اسالیب مخصوص ہوگئے۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی یا خال خال تھی۔"

چناں چہ جس طرح اُردو نے معرضِ وجود میں آجانے کے برسوں بعد ضبطِ تحریر میں آنے کا شرف حاصل کیا۔ بالکل اسی طرح اُردو تنقید کو یہ شرف حالی نے بخشا۔ حالی سے پیشتر اُردو کا تنقیدی سرمایہ سب کا سب ہمارے سامنے نہیں اس لیے بھی ہمیں اس کی قلّت کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے محققین نے تنقید کی موجودہ وضع کو پیش نظر رکھ کر حالی سے پہلے اُردو ادب میں تنقیدی سرمائے کی جستجو کی حالاں کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اُردو ادب میں تنقید نے ایک علاحدہ شعبہ اور مخصوص اسلوب حالی کے عہد سے حاصل کیا اور پھر اُس زمانے کا معیارِ تنقید بھی جُدا تھا۔ اُس زمانے میں ادبی

تنقید کا بڑا مقصد ادب کا متروکات اور غیر فصیح الفاظ کے نقطۂ نظر سے تجزیہ اور فارسی کے رتبۂ کمال تک پہنچنے کی سعی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب قدیم ادب میں مفصل اور مبسوط تنقید کی جستجو کی جاتی ہے، تو مایوسی ہوتی ہے [1] اور پھر ہمارے محققین نے شاید اس امکان پر غور نہیں کیا کہ تنقیدی خیالات کا اظہار شعر و سخن میں بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک اُردو ادب کا بہت سا تنقیدی سرمایہ معرضِ علم میں نہیں آسکا۔ مثلاً غالبؔ لکھتے ہیں ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل  کچھ اَور چاہیئے وسعت مرے بیان کیلئے

کیا یہ تنقید نہیں ؛ غالبؔ ہی کے دور میں اس تنقید کے وزن کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ بعد کو اس تنقید نے غزل کی کائنات ہی بدل ڈالی۔ غالبؔ نے بذاتِ خود نئے تجربات کئے اَور عملاً "تنگنائے غزل" کو وسعت دی۔ اسی طرح انیسؔ، دبیرؔ اور میر حسنؔ کے بر اشعار قابلِ توجہ ہیں:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

انیسؔ

شُکرِ خُدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں
ہر مرثیہ میں مؤجدِ طرزِ جدید ہوں

دبیرؔ

نوا سنجیوں نے تری اے انیسؔ
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

انیسؔ

سبک ہو رہی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

انیسؔ

---

[1] "شعرائے اُردو کے تذکرے" ڈاکٹر سیّد عبداللہ صفحہ ۱۰۵

نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان
نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیان

میر حسن

آج کے تنقیدی ادب میں نیا مضمون، طرز جدید، شگفتگیٔ بیان و تحریر توازن و عدم توازنِ زبان اور نیا اسلوب، قسم کے متعدد الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں کیا جدید تنقید کی یہ سب اصطلاحات ان ہی اشعار سے ماخوذ نہیں — ؟ بہت سے حضرات کو ان اشعار کی تنقیدی حیثیت تسلیم کرنے میں تامل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اشعار میں تنقید اُن جدید اصول اور اقدار کی متحمل نہیں جو آج ہمارے پیش نظر ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ ان میں ہمیں تنقید کی مفصل جزئیات نہیں ملتیں لیکن تنقیدی اشارے اور کنارے ضرور موجود ہیں، جو کسی شاعر کی خودنمائی کے جذبے سے مغلوب ہو کر اپنی اصل صورت کھو بیٹھے، کہیں خودستائی کے شوق نے انھیں مبالغے اور تعلّی میں گم کر دیا، کہیں رشک و حسد کی تحریک نے انھیں طعن و تشنیع کے لبادے میں ملبوس کر دیا اور کہیں جوشِ کلام نے انھیں مسخ کر ڈالا۔ حاصلِ تلخیص یہ کہ حالّی سے پیشتر اُردو ادب میں گو تنقید نے کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کیا تھا تاہم ضمنی طور پر تنقیدی اجزا ہمارے ادب میں ہمیشہ موجود رہے ہیں لیکن چوں کہ یہ تنقیدی اَجزا منتشر اور پریشاں تھے۔ بدیں وجہ ہمارے نقادّوں کی نگاہ انھیں محیط نہ کر سکی اور یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ حالّی سے پہلے ہمارے ہاں تنقید تھی ہی نہیں۔ حالّی سے پہلے اُردو ادب میں تنقید ضرور تھی لیکن فنّی نہیں!

ہمارے ہاں تنقید نے اوّل اوّل تذکروں میں ضبطِ تحریر کا شرف پایا پھر جب تذکرہ نویسی تاریخ ادب کی منزل کو پہنچی تو تنقید مفصّل ہو کر بجائے خود ایک علاحدہ شعبہ قرار پا گئی۔ قدیم تذکروں میں تنقیدی مواد کے نقطۂ نظر سے قابلِ ذکر یہ ہیں:

(۱) نکات الشعرا:۔ (مؤلفہ میر تقی میرؔ) اس تذکرے میں خلافِ اُمید تنقیدی مواد اچھا خاصا ہے۔ یہ پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں تنقید کے علاوہ شخصیتوں کا تجزیہ بھی اخلاقی نقطۂ نظر سے کافی سختی سے کیا

گیا ہے۔ بعض جگہ لہجہ تلخ اور طنزیہ ہے جس سے تنقید بھی غیر متوازن ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"میر صاحب کی تنقید پر سب سے بڑا اعتراض
یہ ہے کہ اُن کی تنقید کسی ہمدرد ڈاکٹر کے عملِ جراحی
سے مُشابہ نہیں بلکہ بعض اوقات ان کی حیثیت
قاتلانہ حملے کی ہو جاتی ہے۔"[1]

(۲) "تذکرۂ ھندی" (مؤلفہ غلام ہمدانی مُصحفی) مُصحفی کے تذکروں کی زبان کی زبان غنیمت ہے۔ اِن کے ہاں تنقیدی مواد اگرچہ کم ہے لیکن ان کی آرا وزن دار معلومات پائدار اور اُن کے تبصرے قابلِ لحاظ ہیں بالخصوص انشؔا کے متعلق انھوں نے کافی صحت کے ساتھ لکھا ہے۔ سوؔدا کے بارے میں اُن کی رائے بہت وقیع اور درست ہے۔

(۳) "گلشنِ ھند" (مؤلفہ لطفؔ) یہ اُردو زبان میں تحریر کیا گیا۔ اُنیسویں صدی کے تاریخی واقعات کافی صحت سے تحریر کئے گئے ہیں۔ لیکن بعض اکابرین پر ناروا اور مہمل اعتراضات ہیں جس کی وجہ محض مذہبی خیالات کا جوش اور جذبات کا اُبال تھا۔

(۴) گلشنِ بیخار (مؤلفہ شیفتہ) حالؔی سے پیشتر کا سب سے اہم تذکرہ "گلشنِ بیخار" ہے۔ شیفتہ کو بعض ناقدین اُردو کا پہلا نقّاد قرار دیتے ہیں وہ متوازن ذہن اور مستقل مزاج رکھتے تھے۔ مبالغہ اور تعلّی ناپسند کرتے تھے آخری زمانے کے بہترین ناقدینِ ادب میں شمار ہوتے ہیں۔ شیفتہ ناقد بھی اچھے ہیں اور صائب الرائے بھی ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر ان کی اشرافی ذہنیت اور اُسلوب پرستی، اُن کی کمزوری بھی نظر آتی ہے۔ شیفتہ نے بڑی تحقیق اور جانفشانی کے بعد یہ تذکرہ مُرتّب کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بہت زیادہ اہم اور مستند ہے۔ شیفتہ کے ہاں تنقید کافی جاندار اور وقیع ہے۔

لیکن ایک بات جو خاصی دلچسپ ہے قابلِ غور ہے کہ ان محولہ تذکروں میں جو

---

[1] شعرائے اردو کے تذکرے، صفحہ ۱۰۵

اِبتدائی اُردو تنقیدی سرمایہ ہیں صرف "گلشنِ ہند" اُردو زبان میں ہے۔ ان تذکروں کے علاوہ ہمارا بہت سا تنقیدی سرمایہ بیاضوں، دیباچوں اور تقریظوں میں بھی محفوظ ہے۔ جس جائزہ لینے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ شیفتہ کے بعد حالی کا ذکر کرنے سے پیشتر آزاد اور "آبِ حیات" کا ذکر ناگزیر ہے۔ آزاد کی اس مشہور تصنیف پر جتنی تنقید ہوئی اُتنی شاید اُردو کی کسی دوسری تصنیف پر نہیں ہوئی۔ قریب قریب ہر نقاد نے "آبِ حیات" کے متعلق ایک آدھ سخت جملہ لکھنا اپنا فرض سمجھا ہے۔ آزاد پر اس کڑی تنقید کی وجہ بھی اپنی جگہ معقول ہے۔ "آبِ حیات" میں جو کوتاہیاں ہیں اُن سے زیادہ کوتاہیوں کی نظیر "آبِ حیات" سے پیشتر کی تصنیفات میں مِل سکتی ہے لیکن وہ اِس لیے قابلِ درگزر ہیں کہ اُن کا زمانۂ تصنیف "آبِ حیات" کی تصنیف کے زمانے میں تنقیدی اُصولوں اور روایتوں کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اگرچہ اصولوں میں ابھی کمال قطعیت اور جامعیت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ آزاد نے ان ضابطوں سے بے نیازی اختیار کی۔ انشا پردازی کی عظمت کا طلسم باندھ کر تحقیق کے سلسلے میں اپنی تہی دامانی، عجلت اور سہل پسندی پر پردہ ڈالا لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود "آبِ حیات" کی اہمیت و افادیت مُسلّم ہے۔

نقد و نظر کے جو انداز بے تدریجاً ذہنوں میں مُرتّب ہو گئے تھے لیکن اب تک تنظیم نہیں پا سکے تھے اُنھیں سب سے پہلے حالی نے شعر و ادب کے متعلق اپنا ایک جامع نظریہ قائم کرتے ہوئے، نقد و نظر کے بُنیادی اصول متعیّن کر کے مُنضبط کیا۔ حالی کی بصیرت و مہارت آج تک اُردو تنقید کو اپنی اہمیّت اور افادیت سے بے نیاز نہ کر سکی۔ وُہ بلا شبہ بزمِ اُردو تنقید کے میرِ مجلس ہیں۔ حالی نے محض تنقید

کے چند ضابطے ہی وضع نہیں کئے بلکہ اُن کی تنقیدات بھی بجائے خود اُردو تنقید میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ اُن کی تنقید غیر جذباتی، وقیع اور مُنصفانہ ہوتی ہے۔

تنقید میں وسیع تحقیق کا عنصر شامل کرنے کا سہرا شبلؔی کے سر ہے، لیکن شبلؔی کی تنقیدات کی عظمت کو خود اُن کی شخصیت پرستی کی کمزوری نے ضرر پہنچایا۔ مگر تحقیق کو تنقید کے لیے مُستلزم کر دینا ہی شبلؔی کا کچھ کم اہم کارنامہ نہیں تحقیق و تلاش کے میدان میں حالؔی بھی شبلؔی کے درجے کو نہیں پہنچتے، جس کی طرف خود شبلؔی نے بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔[۱]

اُردو تنقید اور عبدالحق

شیفتہؔ نے تنقید کا جو تخم فراہم کیا تھا حالؔی نے اُسے سرزمینِ ادب میں گہری کرید اور سخت کاوش سے بویا۔ شبلؔی نے اِس کی ابتدائی نشوونما اور بالیدگی کے زمانے میں تحقیق و تلاش کی مُقوی غذا مہیاؔ کی۔ شبلؔی کے بعد عبدالحق نے اِس نوخیز پودے کو قریب قریب نصف صدی میں خونِ جگر سے سینچ کر، بہارِ شباب بخشی۔ آج عبدالحق اپنے دور کے ناقدین کے امام ہیں وُہ بِلاشبہ اِس اعزازِ جلیلہ کے مُستحق ہیں۔ انھوں نے اپنا سارا شباب اور عرصۂ پیری شانہ ٔ تنقید و تحقیق سے اُردو ادب کے گیسو سنوارنے میں گزارا ہے۔

---

[۱] ”حیاتِ شبلؔی صفحہ ۸۰۲

مولانا عبدالحق بہت بڑے زبان دان اور ماہرِ لسانیات تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن بہت سے دوسرے اچھے انشاپردازوں کی طرح اُن کے نزدیک اُردو میں فصاحت وبلاغت کا معیار فارسی اور عربی کی نادر تراکیب کا کثرت سے استعمال نہیں بلکہ اُن کے نزدیک زبان کا ستھراپن، سُلجھاؤ اور سلاست زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے حسبِ مناسبت خواہ عربی و فارسی سے استفادہ کیا جائے۔ خواہ سنسکرت و برج بھاشا یا دیگر زبان سے۔ اُن کی تحریروں سے اِس اُمر کی بھی صداقت ثابت ہوتی ہے کہ وُہ روزانہ استعمال میں آنے والی زبان اور تحریر میں آنے والی علمی زبان کی ہر ممکن قربت کے متمنّی ہیں تاکہ ہر طبقے میں علمی ذوق ترویج پا سکے اور علمی زبان کسی خاص طبقے کے لیے مخصوص ہو کر نہ رہ جائے۔ چناں چہ بجائے خود اُن کی تحریر سادہ، تکلّف سے بے نیاز، صاف ستھری اور موثر ہوتی ہے۔ انشاپردازی کے جوہر اور قوّت کی نمود و نمائش گنجلک تراکیب اور تکلّفِ بیاں کا اُلجھاؤ اُن کی تحریروں میں نظر نہیں آتا۔ اُن کی تحریر میں واقعیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں، موزوں، مناسب اور عام فہم لفظوں پر مشتمل ایک مختصر سے جملے کی کشتی میں سجا کر قاری کے حضور میں پیش کر دیتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت پیدا کرنے کی دُھن میں نادر تراکیب، غیر مانوس الفاظ، تکلّفِ بیاں، اشاریت اور علامت کے ایسے غلافوں میں چھپا کر اصل حقیقت کو گم نہیں کرتے۔ چناں چہ شاعرانہ سحر طرازیوں کے دل دادہ اکثر ان کی تحریروں کو دیکھ کر مایوس ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ زبان کی فصاحت کو کوئی اہمیّت نہیں دیتے۔ تنقید کرتے وقت وہ لسانی خوبیوں اور لغزشوں کی پوری طرح گرفت کرتے ہیں۔ میر اثر کے بارے میں لکھتے خیال ہیں:

"میر اثر کا کلام بہت ہی پاک وصاف اور فصیح ہے اور درد اثر کی چاشنی رکھتا ہے اور مثنوی تو سلاست و فصاحت کی کان ہے ..... مثنوی کی زبان سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے کے محاوروں کے بے تکلّف استعمال میں مثنوی "خواب وخیال" کا مقابلہ کر سکتی ہے ....."

وہ اپنی تحریر میں بے جا لفاظی کی گنجائش قطعی نہیں رکھتے اس لیے کہ وہ صرف ٹھوس اور کام کی باتیں کرنا جانتے ہیں۔ بے جا اور غیر ضروری باتیں کرنا جانتے ہی نہیں چناں چہ اسی لیے اُن کی تنقید میں جہاں زبان و بیان اور طرزِ نگارش کی خوبیوں اور خامیوں پر گرفت ہوتی ہے وہاں نفسِ مضمون اور مواد کا تجزیہ بھی ملتا ہے۔ ہے۔ اور مولانا نہایت معقولیت سے دونوں پہلوؤں کو زیرِ تنقید لاتے ہیں اور ہر ممکن توازن کا لحاظ رکھتے ہیں مثلاً میر کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہیں:

"اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوا ہے۔ الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکہ دیتی ہے۔ اُن پر سے بے خبر گزر جاتے ہیں......"

مولانا عبدالحق کی تنقید مُنصفانہ، وسیع اور جامع ہوتی ہے۔ اُن کے مزاج میں تحمّل، اعتدال، متانت اور شفقت ہے اور یہی اُن کی تنقید کی شان ہے یہ متانت، تحمّل، شفقت اور حقیقت پسندی اُنھوں نے حالی کی معرفت شیفتہ سے پائی۔ چنانچہ اُن کے متعلق عام طور پر ناقدین کی رائے یہی ہے کہ وہ شیفتہ اور حالی سے متاثر ہیں۔

اسکاٹ جیمس کے خیال کے مطابق چونکہ نقاد کا درجہ خالق کا سا ہوتا ہے۔ اس لیے ایک بڑے نقاد کے لیے انصاف پسندی، متانت اور اصابتِ رائے کی صلاحیتوں کے علاوہ مطالعے کی وسعت بھی ضروری ہے۔ مولانا عبدالحق جیّد عالم ہیں، اور وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تنقید میں بصیرت کی گہرائی اور گرفت کی صلابت ملتی ہے۔ مولانا عبدالحق تنقید نگاری کی اہمیت بخوبی سمجھتے ہیں چنانچہ

وہ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو خوب غور و فکر اور گہرے مطالعے کے بعد پورے اعتقاد اور جماؤ سے تنقید نگاری کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ عدم وثوق اور شک و اشتباہ کی کیفیت میں وہ تنقید سے گریز کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی تنقید جاندار ٹھوس اور حقیقت پسندانہ ہوتی ہے۔ اور جامعیت کے وصف سے بکمال متصف ہوتی ہے۔

مولانا عبدالحق کی تنقید میں تحقیق و تلاش کی تگ و تاز کا اظہار بالعموم ہوتا ہے۔ تحقیق کو تنقید سے پورے التزام کے ساتھ شبلیؔ نے وابستہ کیا اور شبلیؔ کے بعد اس اقدام کی صحیح قدر و قیمت کا بھرپور اندازہ شاید ڈاکٹر عبدالحق ہی نے کیا ہے چنانچہ تنقید نگاری کے میدان میں انھوں نے صرف حالیؔ ہی سے اکتساب نہیں کیا بلکہ شبلیؔ سے بھی بہت کچھ پایا۔ تنقید نگاری کے سلسلے میں انھیں کلیتہً مکتبِ حالیؔ سے مُنسلک کر دینا قرینِ حقیقت نہیں حالیؔ کی تنقید کی قدر و قیمت سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حالیؔ کے ہاں فکر و نظر کی گہرائی تو ہے، مگر تحقیق و تلاش کی گیرائی نہیں۔ شبلیؔ کا یہ خیال دُرست ہے کہ حالیؔ کنوئیں کی مانند ہیں جو محدود ہوتا ہے، لیکن گہرائی رکھتا ہے، اور خود شبلی نہر یا دریا کی مانند ہیں جس کی گہرائی اس کی

وسعت کی بہ نسبت بہت معمولی اور حقیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے کنوئیں کی گہرائی اور دریا کی وسعت کو ہر دو بزرگوں سے کچھ اس طرح اصل سے بڑھ کر اپنایا کہ وُہ بحرِ ذخّار کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جو کنوئیں سے کہیں زیادہ گہرائی اور دریا سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

رچرڈسن کا کہنا ہے" جو کام ایک ڈاکٹر جسم کے لیے کرتا ہے۔ نقّاد وہی کام ادب کے لیے کرتا ہے"۔ رچرڈسن کا یہ قول بالکل مولانا عبدالحق کے حسبِ حال ہے۔ ان کی تنقید میں قصّاب کی سی بے رحمی نہیں بلکہ ایک ہمدرد جرّاح اور ڈاکٹر کے لہجے کی سی ملائمت اور شفقت ملتی ہے۔ وُہ تنقید کو خودہ گیری، عیب جوئی یا جزو سے کُل پر خوب وناخوب کا کوئی مُطلق حکم لگانا ہی خیال نہیں کرتے اور نہ ہی تحسین کو تنقید قرار دیتے ہیں بلکہ وہ تنقید کو ایک فن جان کر حیات کی مستحکم قدروں کا پورا پورا احساس رکھتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ زیرِ تنقید تخلیق کے خالق ادیب یا شاعر کے گرد و پیش کی روایات کا مُطالعہ کرتے ہیں اور اس کے مشاہدات و تجربات کی گہرائی میں پہنچ کر ایک مضبوط اور مُدلّل رائے قائم کرتے ہیں۔ میرؔ کے متعلق اُن کی رائے قابلِ مُلاحظہ ہے :

" میرؔ صاحب کے کلام میں سب خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی اُن کا کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اُس کے پڑھنے سے دِل پر چوٹ سی لگتی ہے ......"

محولہ سطور کے مُطالعے سے علم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے یہ جملہ سُپردِ قلم کرنے سے پیشتر داخلی اور خارجی کیفیات کا مکمل مطالعہ کیا اور پھر ان خارجی و داخلی مُحرکات کا تجزیہ نہایت مُستحکم تنقید کی صورت میں پیش کر دیا۔

مولانا عبدالحق کی تنقیدات دیکھ کر اس امر پر یقین اور زیادہ کامل ہو جاتا ہے کہ تنقید بھی تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔ وُہ زیرِ تنقید مصنّف کی ذہنی کیفیات و واردات کا بھرپور شعور حاصل کر کے اُس کے فکر و نظر کی نبض کی ہر حرکت کا مفہوم جان لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ چناں چہ بعض اوقات اس کوشش میں مضمون زیرِ تنقید پر قدرت اور تبحّر کے اعتبار سے وہ مصنّف زیرِ تنقید سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ نواب صدر یار جنگ نے ایک جگہ لکھا ہے:

"مولوی صاحب موضوع پر اُس وقت قلم اُٹھاتے ہیں جب کہ اس پر پورا عبور حاصل کر لیتے ہیں نہ صرف کتاب پر بلکہ مصنّف پر، اور موضوع کتاب پر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس کتاب پر مُقدّمہ لکھا ہے اُس پر، اُس کے مطالب پر ایسی مُحققانہ بحث کی ہے کہ بعض اوقات مقدمہ کتاب سے بہتر فیصلۂ موضوع کر گیا ہے۔"

مولانا عبدالحق کی تنقید کی ایک امتیازی شان اُن کی صلابت رائے، خلوص و صداقت کمال توازن اور معقولیت ہے۔ وُہ تنقید کو تنقیص نہیں سمجھتے اور نہ ہی تحسین کو تنقید خیال کرتے ہیں وُہ پورے صبر و تحمّل اور غور و فکر سے ایک متوازن

رائے قائم کرتے ہیں۔ اُن کی رائے کا توازن نہایت مستحکم پائدار اور قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ اور ان کی رائے کا یہی توازن فی الاصل اُن کی ناقدانہ عظمت کی بُنیاد ہے۔ قدیم تذکروں کے متعلق اُن کا یہ تنقیدی نقطۂ نظر کتنا صحت مند مُتوازن اور مُناسب ہے:

"ہمارے شعرا کے تذکرے گو جدید اصول کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں تاہم ضمنی طور پر اُن میں بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو ایک محقق اور ادیب کی نظروں میں جواہر ریزوں سے کم نہیں اُن سے شاعروں کے ضروری حالات اور اُن کا ماحول ہمارے سامنے آجاتا ہے۔"

حالؔی کی ناقدانہ شخصیت کی نشوونما میں سرسیّد اور شیفتہ کا اثر مساوی ہے ـــ شیفتہ سے حالؔی نے مشرقیت حاصل کی اور سرسیّد کی معرفت انھوں نے مغربی افکار سے استفادہ کیا۔ شبلؔی کی کٹّر "مُشرقیت" میں بھی سرسیّد کی مغربیت نے خوش گوار اعتدال پیدا کیا۔ چنانچہ شبلؔی اور حالؔی نے تنقید کی جو قدریں اور روائتیں قائم کی تھیں

وہ مشرق و مغرب کا خوش گوار،

مفید اور متوازن امتزاج تھا ان ہی ممتزج روائتوں اور قدروں کو مولانا عبدالحق نے پوری طرح اپنایا ـــ ظاہر ہے کہ اِن کے نقد و نظر کے بنیادی اصول وہی ہیں، جو حالؔی اور شبلی نے وضع کیے تھے۔ ان کی تمام تنقیدات اسی امر کا مظہر ہیں لیکن کلیم الدین احمد نہ جانے کیوں اس امر کا احساس نہیں رکھتے اور اپنی کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" میں اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ مولانا اصولِ تنقید سے بحث نہیں کرتے (یعنی اپنے اِصولِ نقد کی وضاحت نہیں کرتے)، عبدالشکور نے "تنقیدی سرمایہ" میں اس کا معقول جواب دیا ہے:

"یہ اعتراض جس قدر دِل چسپ ہے اُسی قدر تبسم آفریں معلوم ہوتا ہے۔ ناقد کا فرض تنقید کرنا ہے۔ تنقید کے اُصول مُرتّب کرنا اور اُن کو شائع کرانا ایک ضمنی فرض ہے۔ مغرب میں ناقدین پر بہت سے دے ہوئی ہے، لیکن کسی ناقد کی اس فروگزاشت پر شاید ہی کبھی اعتراض کیا گیا ہو"

خود عبدالشکور صاحب نے آگے چل کر جو اعتراض کیا ہے وُہ بھی غور طلب ہے:

مولوی صاحب کی تنقیدات کو پڑھ کر البتہ ایک آدھ نقص ضرور محسوس ہونے ہونے لگتا ہے وُہ یہ کہ اُن کا انگریزی تنقید کا مُطالعہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد بہت بہت کم جاری رہا ۱۹۱۸ء کے بعد یورپ کے ادب میں، خصوصاً روسی ادب میں مختلف النوع تحریکات کارفرما ہوئیں اور جن کے اثرات بہت تیزی کے ساتھ اُردو ادب اور تنقید تک پہنچتے رہے ان تحریکات کے اثر سے مولوی صاحب قدرے کم واقف ہیں۔ چُنانچہ اُن کی حالیہ

تنقیدات کو دیکھ کر بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۱۸ء سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں؛"

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مولانا عبدالحق کے نقد و نظر کی بنیادی قدریں وہی ہیں جن کے نقوش حالیؔ اور شبلیؔ نے مُرتّب کیے تھے۔ چناں چہ اُن کی تنقید کا خمیر ان ہی روایات سے اُٹھتا ہے جن میں "مشرقیت" جُزوِ ممتاز ہے۔ کلیم الدین نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وُہ بہت مناسب اور دُرست ہے کہ مولوی صاحب کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے۔ وہ روایت پسند ہیں۔ انگریزی روایات سے بیگانگی اختیار کرنا اپنی زبان اور ادب حق میں باعثِ ضرر سمجھتے ہیں۔ انگریزی ادب سے استفادہ عبدالحق ضروری خیال کرتے ہیں، لیکن بقدرِ ضرورت اِس شدّت سے نہیں کہ اپنے اندازِ فکر کا گلا گھونٹ کر اپنی انفرادیت کو ختم کر دیا جائے۔ انگریزی یا دوسری کسی بھی زبان کا مزاج قطعی طور پر ہماری زبان کا سا نہیں ہو سکتا۔

ہر زبان کے ادب کی کچھ مخصوص روایات ہوتی ہیں چنانچہ مغربی ادب میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرآت بجنسہ ہمارے ہاں جگہہ نہیں پا سکتے۔ ہمارے ہاں کے تقاضے مختلف ہیں۔ ۱۸ء کے بعد سے روسی ادب اور مارکسی نظریات نے بہت کچھ اشتعال، جانب داری اوبغاوت کے جذبات کو ابھارا ہے۔ روسی ادب کے مقلدین نے شدت پسندی اختیار کر لی ہے، توازن کھو بیٹھے ہیں اور اپنی روایات سے جادبے جا تنافر محمود خیال کرتے ہیں۔ ان کی اپنی فکری صلاحیتیں بتدریج غیر محسوس طور پر مفلوج ہو رہی ہیں، اور فکری ونظری انحصار بڑھ رہا ہے۔ فکری ونظری انحصار ادب کی توانائی کے انحطاط کا باعث ہوا کرتا ہے

مولانا عبدالحق روایت پسند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو ادب میں کسی دوسرے ادب کی اشتہاریت کے رجحان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ شاید اسی وجہ سے بہت سے ناقدین کو ان میں رجعت پسندی اور قدامت کے آثار ملتے ہیں۔ عبدالشکور بھی کچھ اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر عبادت کی یہ رائے بہت وقیع اور صائب ہے:-

"ڈاکٹر عبدالحق اُردو زبان اور ادب کے سب سے بڑے محقق ہیں اور محققین نے اُردو تنقید میں جس تنقیدی روایت کے سلسلے کو قائم اور باقی رکھا ہے

اُس میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ حالیؔ نے جس تنقیدی روایت کی بنیاد رکھی تھی اس کو پوری طرح ڈاکٹر عبدالحقؔ نے اپنایا ہے۔ حالیؔ کی طرح اُنھوں نے قدیم روایات کی اہمیت شدّت سے محسوس کی ہے اور اُن کو سامنے رکھ کر ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے ایسی تنقیدی روایات کو برتنے کی طرف اپنا رُجحان بھی ظاہر کیا ہے، جو تہذیب، ادب اور تنقید کے گہرے شعور ہی کے نتیجے میں پیدا ہوتا۔ اِس طرح گویا تنقید کے لیے تجربات کا خیال بھی رکھا ہے،، اور اِس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے ادب اور اس کے مختلف مسائل کو سمجھنے میں وُہ تمام باتیں پیشِ نظر رکھی ہیں جن کو نئی تنقید ضروری قرار دیتی ہے۔ اِن کی تحریروں میں جگہ جگہ اِس حقیقت کا احساس ہوتا ہے۔“

مولانا عبدالحقؔ رجعت پسند نہیں ہیں بلکہ روایت پسند ہیں۔ اُنھوں نے قدیم اُدبی روایات اور جدید تنقیدی رُجحانات میں کامیاب توازن قائم کیا ہے، اور اس طرح اُردو تنقید کو جامعیت کے وصف سے تہی ہونے سے محفوظ کیا۔

اور یہی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ ترکی کی محبِ وطن، ادیب اور راہنما خاتون خالدہ ادیب اُن کے متعلق لکھتی ہیں:

”سن رسیدہ علما میں جو اُدبی تحقیقات اور اُردو زبان پر جدید معروضی اُصول کے مُطابق ناقدانہ تصنیف کرنے میں غیر معمولی جامعیت رکھتے ہیں، مولانا عبدالحقؔ ہیں۔“

الغرض مولانا عبدالحق کی اُردو تنقید کے لیے خدمات ناقابلِ فراموش اور نہایت گراں قدر ہیں۔ اُردو تنقید کی طفولیت کے عہد میں حالیؔ نے اُسے آدابِ نشست دیئے شبلیؔ نے قوّتِ ایستادگی عنایت کی اور عبدالحق نے اندازِ خرام بخشا۔

عبدالحق کی تنقیدات نے فنِ تنقید کو ایک اہم اور ممتاز مقام بخشا۔ یہ مولانا عبدالحق ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم تنقید کے ذوق کو پھلتا دیکھ رہے ہیں، اور یہ بچّی کہ جو حالیؔ کے زمانے تک بیٹھنے کی استطاعت نہ رکھتی تھی آج پورے کمال کے ساتھ بھاگ رہی ہے، دوڑ رہی ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ آج ہر نقاد پر بے واسطہ یا بالواسطہ

ان کا اثر ہے، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے پورے خلوص سے اُردو تنقید کی پرورش کی ہے اور اس پرورش میں ہر ممکن احتیاط کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ مولانا عبدالحق "بدنام" "رجعت پسندوں اور "نام نہاد" ترقی پسندوں کا مشترک قیمتی سرمایہ ہیں۔

---

"(مولوی عبدالحق) اُردو ادب کے ایک بہت بڑے نقّاد ہیں۔ اُنھوں نے نظریاتی اور عملی تنقید کے شاندار نمونے پیش کیے ہیں ...... بابائے اُردو کی تنقید، اُن کے وسیع مطالعے، اُن کے تاریخی، تہذیبی شعور، اُن کے انسانی نقطۂ نظر، اُن کے رچے ہوئے جمالیاتی احساس اور نکھرے ہوئے ادبی ذوق کا عطر ہے۔ اُن کے یہاں تجزیے کا عنصر نسبتاً کم ہے لیکن جچی تلی بے لاگ رائیں کچھ اس طرح ظاہر کی گئی ہیں کہ دل میں اُتر جاتی ہیں اور پڑھنے والا اُن کو اپنے مزاج کا جُز بنا لینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے"

——— ڈاکٹر عبادت بریلوی

O

"مولوی عبدالحق سرسیّد کے دل دادہ اور حالؔی کے بڑے مداح ہیں۔ حالؔی کی نثر میں بلا کی متانت، سادگی اور زور ہے۔ یہ خصوصیات مولوی عبدالحق کی نثر میں بھی موجود ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ مولوی عبدالحق حالی کے تربیت یافتہ "ایڈیشن" اور نقشِ ثانی ہیں جس کو نقشِ اوّل پر ہر آئینہ برتری حاصل ہے لیکن جوشِ تخلیق میں حالی اُن سے پار ہیں۔ حالی کا انکسار "اردو کے بابا" میں نہیں لیکن وُہ حالی سے زیادہ پُر عزم اور با عمل انسان ہیں۔ حالؔی کی ملائمت بھی اُن میں نہیں۔ "دُھن کے پکّے" دونوں ہیں لیکن دونوں کے طریق کار میں بڑا فرق ہے۔ حالی کی سرشت میں ملائمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے عبدالحق، یک سر حالی تو نہ بن سکے، وُہ خود سر حالی ہیں ــــ"

ـــــــــــــ ابو ظفر عبدُالواحد

ڈاکٹر سلام سندیلوی

# مولوی عبدالحق پر حالی کا اثر

اُردو کے عناصرِ خمسہ کا احسان ہم پر صرف یہی نہیں ہے کہ اُنھوں نے ہمارے اُردو ادب کو مذہبیات و اخلاقیات، انشا پردازی، طنز و ظرافت، سیرت نگاری، تنقید نگاری اور تاریخ و تحقیق کی دولت سے مالا مال کر دیا، بلکہ ہم ان قابلِ قدر ہستیوں کے اِس لیے بھی مرہونِ منت ہیں کہ اُنھوں نے اپنی ہمہ گیر شخصیت کے اثر سے اپنے مُقلدین اور معتقدین کی بھی مختلف جماعتیں پیدا کر دیں جنھوں نے اُردو ادب میں کارہائے نمایاں کئے اور اس طرح سے ادبی خدمت کر کے اُردو کو بھی زندہ رکھا اور خود بھی زندہ رہے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین آزاد کی شگفتہ نگاری اور رنگین بیانی سے مہدی آفادی بڑی حد تک متاثر ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ اُنھوں نے آزاد کو دیگر انشا پردازوں کے مقابلہ میں "آفتابِ اُردو" تسلیم کیا۔ اور جہاں تک انشا پردازی کا تعلق ہے، اُنھوں نے آزاد ہی کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنے کی کوشش کی۔ اسی طرح نذیر احمد کا اثر مرزا فرحت اللہ بیگ پر پڑا۔ اُنھوں نے نذیر احمد کی ظرافت سے اپنی تحریر میں زعفران سے پھول کھلانے کی کوشش کی ہے۔ حالی ایک طرف تو سر سیدؒ کی سادہ بیانی سے متاثر ہوئے، دوسری طرف اُنھوں نے مولوی عبدالحق کو اپنی سادہ بیانی سے متاثر کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تنقید کے بازار میں آج بھی حالی ہی کا سکّہ چل رہا ہے۔ شبلی کی بھی تحریر کا اثر دوسرے ادیبوں پر پڑا۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی تحریروں پر شبلی کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے۔

ہم کو اس جگہ مختلف اماموں اور مقلدوں کی تحریر سے بحث نہیں کرنا ہے۔ بلکہ یہاں ہمارا تعلق صرف حالی اور مولوی عبدالحق سے ہے۔ ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مولوی عبدالحق حالی سے کیوں متاثر ہوئے اور کس حد تک متاثر ہوئے۔ پہلے سوال کا جواب تلاش کرنا ذرا مشکل ہے کیونکہ صحیح طور پر اُن اسباب کا دریافت کرنا کہ جن کی

بنا پر مولوی عبدالحق حالی سے اثر پذیر ہوئے، ذرا اہم کام ہے۔ تاہم دونوں ادیبوں کے طبائع کا نفسیاتی تجزیہ کچھ نہ کچھ ہماری مدد کر سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی ادیب کسی دوسرے ادیب سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ اوّل تو دونوں کی مزاجی کیفیت میں کچھ نہ کچھ مناسبت ہو گی۔ دوسرے دونوں کا ماحول کچھ نہ کچھ یکساں ہو گا۔ اس لئے متاثر ہونے والے کے مزاج اور ماحول کا تجزیہ ضروری ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اگر ہم مولوی عبدالحق کے مزاج اور ماحول کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو ہم کسی نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے جب ادبی فضا میں آنکھ کھولی اُس وقت سر سید، آزاد، ذکاءاللہ نذیر احمد، حالی اور شبلی ادب کے آسمان پر ضوفشانی کر رہے تھے۔ سر سید ادیب سے زیادہ مُصلح تھے۔ اس لیے مولوی عبدالحق کو سر سید بہ حیثیت ادیب کے زیادہ متاثر نہ کر سکے مگر مولوی عبدالحق اُن کو ایک بہت بڑا مُصلح قوم تسلیم کرتے ہیں۔ ذکاءاللہ اور نذیر احمد کی شخصیت میں زیادہ جاذبیت نہ تھی، اس لیے عبدالحق کا ادھر زیادہ رجحان نہ ہو سکا۔ مولوی آزاد کی ادبی شخصیت میں دلکشی تھی مگر پائیداری نہ تھی، اس لیے مولوی عبدالحق کی آنکھوں میں اُن کی ذات بھی چکا چوندھ پیدا نہ کر سکی۔ مگر حالی اور شبلی اس وقت آسمانِ ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے تھے۔ جن کے مقابلہ میں دیگر مُصنفین ماند پڑ گئے تھے۔ لہٰذا مولوی عبدالحق کو ادبی رہنمائی کیلئے حالی اور شبلی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا، اور ان دونوں میں سے قرعۂ فال حالی کے نام پر پڑا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حالی اپنے دور ہی میں بہ حیثیت ادیب کے کافی مشہور ہو چکے تھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ صرف حالی کی شہرت سے متاثر ہو کر مولوی عبدالحق اُن کی طرف جھکے ہوں۔ لیکن اگر صرف جھکاؤ اور رجحان کی حد تک بات ہوتی تو یہ سوال یہیں ختم ہو جاتا، مگر بات تو گرویدگی اور شیفتگی کی حد تک پہنچی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مولوی عبدالحق نے اپنی ذات میں حالی کو جذب کر لیا ہے، اور یہ جذب کی کیفیت تب ہی پیدا ہو سکتی ہے جب بنیادی طور پر دونوں میں اتحاد ہو، اور دونوں کے مزاج اور ماحول میں یکسانیت ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حالی اور عبدالحق کے مزاج میں چند متضاد باتیں بھی پائی جاتی ہیں، مگر مجموعی طور پر دونوں میں اختلاف کم ہے۔ اتحاد زیادہ ہے۔ مثلاً یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حالی نہایت مُنکسر المزاج، سادہ طبیعت

اور نیک سرشت تھے۔ مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں حالی کی سیرت کے بارے میں لکھا ہے :

"مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِ دل۔ اور یہی شان ان کے کلام میں بھی ہے۔" (چند ہم عصر صہ ۱۲۵)

حالی کی سادگی ہم کو عبدالحق میں بھی نظر آتی ہے۔ مولوی عبدالحق بھی نہایت سادہ مزاج، صاف باطن اور بلند اخلاق۔ انسان ہیں۔ لہٰذا فطری طور پر حق کو حالی کی طرف جھکنا چاہیئے۔ حالی کے مقابلہ میں شبلی کے مزاج میں انکسار کم تھا۔ اس وجہ سے شبلی کی طرف اُن کے رُجحان کا ہونا ممکن نہیں تھا۔ . . . . . . . . . .

شبلی کے مزاج میں بڑی حد تک انانیت کو دخل تھا۔ شبلی کی طبیعت کا خاصہ یہ تھا کہ وہ بہت کم اپنے ہم عصروں کی تعریف کرتے تھے۔ یہ اُن کی انانیت کی بیّن دلیل ہے۔ چنانچہ جب شبلی "الکلام" لکھتے ہیں تو سرسیدؔ کا ذکر تک نہیں کرتے ہیں۔ آزاد کو وہ "تحقیق کے میدان کا مرد" نہیں مانتے ہیں اور سخندانِ فارس کو شعرالعجم سے کہیں زیادہ پست سمجھتے ہیں۔ حالی کی "حیاتِ جاوید" کو وہ "مدلّل مدّاحی" تصور کرتے ہیں اور یہ کتاب ان کو "کذب افتراء کا آئینہ" نظر آتی ہے۔ اسی طرح سے وہ براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران" کو "نہایت عامیانہ اور سوقیانہ" بتاتے ہیں۔ ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شبلی کے مزاج میں خود پرستی کے ساتھ ساتھ کچھ غرور اور تکبّر بھی تھا، اور کسی دوسرے ادیب کی شخصیت اُن کی نظر میں نہیں جچتی تھی۔ مگر حالی میں غرور کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ حالی دوسرے ادیبوں کی تصانیف کی قدر کرتے تھے، اور یہ بات اُنھوں نے بڑی حد تک سرسیدؔ سے سیکھی تھی۔ سرسیدؔ بھی ہمیشہ اپنے معاصرین کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ سرسیدؔ کی اس فراخ دلی کا اثر حالی پر پڑا۔ چنانچہ حالی بھی اپنے معاصرین کی تعریف کرتے تھے۔ حالی نے "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" کی جی کھول کر داد دی، اور آزاد کو جدید شاعری کا بانی تسلیم کیا۔ "سیرۃ النعمان" پر تبصرہ کرکے اُنھوں نے شبلی کی "روشن دماغی" کی تعریف کی۔ شبلی کے "دستۂ گل" کی غزلوں کو "شرابِ دو آتشہ" تصوّر کیا۔ اس طرح سے حالی نے وسیع النظری اور فراخ دِلی کا ثبوت دیا۔

معاصرین کے علاوہ حالی نئے لکھنے والوں کی بھی ہمت افزائی کرتے تھے۔ مولوی

عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں حالی کی اس خصوصیت پر مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدر دانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔"

(چند ہم عصر صفحہ ۱۵۷)

حالی کی یہی فراخ دلی ہم کو مولوی عبدالحق میں بھی ملتی ہے۔ انانیت مولوی عبدالحق میں بھی نہیں ہے نہایت کشادہ دل واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کی تعریف بھی کی ہے، اور ان کے کمالات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کا ثبوت ہم کو ان متعدد تبصروں میں مل سکتا ہے جو انھوں نے اپنے ہم عصروں کی تصانیف پر کئے ہیں۔ چنانچہ مہدی افادی کی "افادات مہدی"!............ جوش کی آیات ونغمات، مولوی نورالحسن نیر کی "نوراللغات"، شوق سندیلوی کی "اصلاح سخن"، اور ن۔م۔ راشد کی "ماورا"، پر انھوں نے تبصرے کیئے ہیں اور جہاں کہیں ان کو خوبیاں نظر آئی ہیں، ان کی تعریف کی ہے اور مصنف کو مبارک باد پیش کی ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں انھوں نے خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مگر خوبیاں کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ حالی کی طرح عبدالحق بھی نئے سیکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے نقوش کے "شخصیات نمبر" میں مولوی عبدالحق کی اس خصوصیت کو واضح کیا ہے:

"انھوں نے کسی نئے لکھنے والے کا مضمون پڑھا۔ انھیں اچھا معلوم ہوا فوراً اس مضمون کا خط اس کو لکھ دیا کہ تم نے نہایت اعلیٰ درجہ کا مضمون لکھا ہے۔ مجھے تمہارے انداز پر رشک آتا ہے۔"

(نقوش۔ شخصیات نمبر۔ جنوری ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۲۹)

مولوی عبدالحق نے حالی کی سیرت کی دوسری خوبی درد دل بتائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی مسلمانوں کے سچے ہمدرد تھے۔ اس بات میں وہ مکمل طور سے سرسید کے مقلد تھے۔ سرسید نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی،

سرسید کی طرح حالیؔ نے بھی مسلمانوں کی بے لوث خدمت کی۔ اس میں ذاتی مفاد کی جھلک بھی نہ تھی۔ حالیؔ نے کبھی قومی خدمت کے سلسلہ میں نام و نمود کی خواہش نہیں کی۔ اگرچہ شبلی بھی مسلمانوں کے سچّے بہی خواہ تھے مگر وُہ خدمتِ قوم کے ساتھ ساتھ شہرت اور جاہ وحشمت کے بھی طلبگار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے علی گڑھ کی رہائش ترک کر دی اور ندوہ میں قیام کیا۔ کیونکہ سرسیدؔ کے سامنے اُن کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ مگر حالیؔ میں یہ بات نہ تھی۔ حالیؔ نے کبھی شہرت حاصل کرنے کے لیے قومی خدمت نہیں کی۔ یہی بات ہم کو مولوی عبدالحق میں بھی ملتی ہے۔ مولوی عبدالحق بھی مسلمانوں کے سچّے اور بے لوث خادم ہیں۔ اُنھوں نے نہ جانے کتنوں کو مُلازمتیں دلوائیں۔ وظیفے مقرر کرائے۔ غریب طلبار کی تعلیم کا انتظام کیا۔ بیواؤں اور یتیموں کی مالی مدد کی اور یہ سب کچھ نام و نمود کے لیے نہیں کیا، بلکہ قومی ہمدردی میں کیا۔ اِس نقطۂ نظر سے بھی عبدالحق شبلؔی کی بہ نسبت حالی سے قریب ہیں۔

مولوی عبدالحق ایک اور معاملہ میں حالیؔ سے ملتے جلتے ہیں۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے "تنقید کیا ہے"، میں لکھا ہے کہ "حالیؔ نے اُردو ادب کی دُنیا بدل دی۔ مگر شبلی نے ہندوستان کے مُسلمانوں کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالا۔" اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حالیؔ نے تمام تر توجہ اُردو کے نکھارنے اور سنوارنے میں صرف کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ مُسلمانوں کی بھی خدمت کرتے رہے۔ لیکن شبلی کی تمام تر توجہ مسلمانوں کو ایک نئی راہ پر لگانے کی طرف مبذول تھی۔ وُہ چاہتے تھے کہ مُسلمان ہندوستان کے بدلتے ہوئے رُجحانات اور آزادی کے نئے جذبات سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ ان کے خیالات کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑا۔ چنانچہ مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر اقبال شبلی کے خیالات کی پرچھائیاں ہیں۔ اس طرح سے شبلی نے مُسلمانوں کو ایک حیاتِ نو سے ہم آغوش کر دیا۔ مگر حالیؔ نے اُردو ادب کو ایک نئی زندگی بخشی۔ خصوصاً غزل کے بوسیدہ جسم میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس پیرِ فرتوت کو عروسِ نو کا حُسن و شباب عطا کیا۔ اگر ہم غور کریں تو مولوی عبدالحق مُسلمانوں کے پُرخلوص اور سچّے خادم ہیں مگر مذہب سے زیادہ اُن کو ادب سے دلچسپی ہے، اور بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

"اُردو اُن کی دُنیا ہے، اُردو اُن کی زندگی ہے۔ اُردو اُن کا نصب العین ہے، اور اُن کا نظریۂ حیات ہے۔" یہی سبب ہے کہ اُن کو بابائے اُردو

کہا جاتا ہے"۔

مندرجہ بالا سطور میں حالی اور عبدالحق کی مزاجی کیفیات کی یکسانیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مزاجی یکسانیت کے علاوہ حالی اور عبدالحق کا ماحول بھی یکساں رہا ہے۔ دراصل عبدالحق بھی علی گڑھ کی پیداوار ہیں، اور سرسیّد کی تحریک کی ایک کڑی ہیں۔ عبدالحق نے ۱۸۹۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا، جب وہ علی گڑھ کے طالب علم تھے، اُس وقت سرسیّد کا آخری زمانہ تھا کیونکہ سرسیّد کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ اگرچہ سرسیّد اور عبدالحق کا زیادہ عرصہ تک ساتھ نہیں رہا، تاہم اُن کو سرسیّد سے ملنے جلنے، اُن کے پاس اُٹھنے بیٹھنے اور اُن سے گفتگو کرنے کا کافی موقع ملا ہے۔ عبدالحق نے "چند ہم عصر" میں سرسیّد پر ایک طویل مضمون لکھا ہے اور مختلف زاویۂ نظر سے سرسیّد کی حیات پر روشنی ڈالی ہے اور اس طرح سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ عبدالحق کو سرسیّد سے زیادہ اُن کے بیٹے سیّد محمود کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا، اور اس طرح وہ سیّد محمود کے کمالات کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکے جس کا ذکر اُنھوں نے "چند ہم عصر" میں سید محمود پر ایک مضمون لکھ کر کیا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے "چند ہم عصر" میں سرسیّد راس مسعود پر بھی ایک مضمون لکھا ہے اور اُن کی خوبیوں اور خدمتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سرسیّد کی تحریک اور اُن کے خاندان سے کافی اُنسیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہر اُس شخص سے خلوص رکھتے ہیں، جو سرسیّد تحریک کا معتقد ہے۔ نواب محسن الملک سرسیّد کے دستِ راست تھے اور اُن سے کافی عقیدت رکھتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے نواب محسن الملک پر بھی "چند ہم عصر" میں ایک مضمون لکھا ہے اور اُن کی قومی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ سرسیّد کی تحریک کے خاص حامی حالی بھی تھے۔ اسی لیے مولوی عبدالحق نے حالی پر بھی ایک مضمون "چند ہم عصر" میں سپردِ قلم فرمایا ہے۔ مولانا حالی سے بھی عبدالحق کی ملاقات علی گڑھ ہی میں ہوئی تھی جب وہ وہاں کے طالب علم تھے۔ حالی کی شخصیت سے عبدالحق کافی متاثر ہوئے چنانچہ اُن کے متعلق وہ "مکتوباتِ حالی" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"دُنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا ہم ادب واحترام

کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم اُن اولوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں ادبا کامل حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کی حیرت انگیز جدوجہد، قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہونچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکیوں کو مٹایا۔ محبت ہم اُن سے کرتے ہیں، جن کی پاک سیرت، خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ ان کے پاس سے جو اُٹھا کچھ لیکر اُٹھا اور اُن کے پاس جو گیا کچھ بن کر آیا۔ مولانا حالی اُن پاک نفوس میں سے ہیں جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں، اور اُن سے محبت بھی"

(ادبی تبصرے ص ۶۳)

اِس میں کوئی شک نہیں کہ عبدالحق حالؔی کا ادب بھی کرتے ہیں اور حالؔی سے محبت بھی کرتے ہیں اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جاہے کوئی حالؔی سے مستفید ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر عبدالحق جب حالی کے پاس سے اُٹھے تو کچھ لے کر اُٹھے اور اُن کے پاس جب گئے تو کچھ بن کر آئے۔ لہٰذا عبدالحق کی شخصیت کی تعمیر میں حالؔی کا زبردست ہاتھ ہے۔

عبدالحق حالی کے بلند کردار سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کو حالؔی کے عزیزداروں اور ہم وطنوں سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ "چند ہم عصر" میں خواجہ غلام الثقلین اور مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی سے متعلق بھی اُنھوں نے مضامین لکھے ہیں۔ لیکن اس مجموعہ میں کوئی مضمون شبلی یا اُن کے متعلقین کے بارے میں نہیں شامل ہے یہی نہیں بلکہ بقول مہدی افادی عبدالحق کے لیے "یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالؔی کی پاسداری میں شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں۔" اِس کا سبب یہی ہے کہ مولوی عبدالحق حالؔی سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ اسی عقیدت کے جوش میں وہ شبلی پر چوٹ کرنے سے بھی نہیں چوکتے "ادبی تبصرے" میں ایک جگہ اُنھوں نے کھُلم کھُلا حالؔی کو شبلی پر ترجیح دی ہے "الناظر کے انعامی مضمون" میں فرماتے ہیں:

"مولانا شبلؔی مرحوم کا بھی یہی حال تھا۔ وہ دوسروں کے مقلد ہیں اور سب سے بڑے مقلد مولانا حالؔی کے خاص کر سوانح نویسی اور ادبی تنقید اُنھوں نے حالؔی ہی سے سیکھی ہے۔ اور زبان میں آزادؔ، حالؔی اور نذیر احمد سے خوشہ چینی کی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ وُہ اپنی نثر میں کوئی خصوصیت پیدا نہ کر سکے۔" ادبی تبصرے صفحہ ۸۱

عبدالحق کے اِن جُملوں سے اُن کا جوشِ عقیدت ٹپکتا ہے۔ اسی لیے اُن کو شبلی کی نثر میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شبلی کی نثر میں ایک خصوصیت ہے اور وہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔

اس تمام بحث سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حالی کے مزاج و ماحول اور عبدالحق کے مزاج و ماحول میں کافی یکسانیت ہے۔ اسی لیے عبدالحق حالی کے ادبی نظریات سے بھی کافی متاثر ہوئے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حالی کے تنقیدی اُصولوں کو اپنانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ طرزِ نگارش میں بھی انھوں نے حالی کی پیروی کی۔ اِس سلسلے میں پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ عبدالحق نے حالی کے تنقیدی اُصولوں کو کہاں تک اپنایا ہے اور کس حد تک انھوں نے حالی کو اپنا امام گردانا ہے۔ دراصل عبدالحق حالی کو ایک اعلیٰ پایہ کا نقاد تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ "روحِ تنقید" پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ حالی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مُطالعہ گہرا اور نظر دور بین ہو۔ جو صرف ذوقِ ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے اُدبیات کا شناور بھی ہو جس نے ایک مُدت کے مُطالعہ اور غور و فکر کے بعد اُن امور کے مُتعلق خاص رائے قائم کی ہے اور وُہ اِس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اور دوسروں کے دل نشین کر سکتا ہے۔ ہماری زبان میں یہ کام صرف مولانا حالی مرحوم نے کیا ہے۔ فن کی حیثیت سے وُہ اس کے بانی ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کے ادبی نقاد ہیں۔ اور جن کی تحریریں ہمیشہ بڑی وقعت اور قدر سے دیکھی جائیں گی" (تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۷۰)

چونکہ عبدالحق حالی کی تنقید نگاری کے معترف ہیں، اسی لیے وہ ان کے مقلد بھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بعض اوقات "حق" کی آواز حالی کی آواز معلوم ہونے لگتی ہے۔ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں اچھے شعر کی مختلف خوبیاں بیان کی ہیں۔ مثلاً حالی، ایک اچھے شعر میں سادگی اصلیت اور جوش کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ شاعری میں جھوٹ اور مُبالغہ کو معیوب سمجھتے ہیں۔ وُہ شعر میں مُناسب الفاظ کا انتخاب اور اس کی ترتیب پر زور دیتے ہیں۔ وُہ روز مرّہ کی پابندی بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے اگر

محاورہ عمدہ طور سے باندھا جائے تو پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے۔
عبدالحق میر کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت تقریباً انہیں باتوں کو مدِنظر رکھتے ہیں۔
عبدالحق کی تنقید میں حالی کی آوازِ بازگشت ملاحظہ فرمایئے۔

"میر کی شاعری اپنی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے اُردو زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے ...... ان کی زبان کی فصاحت اور سادگی، سوز و گداز، مضامین کی جدّت اور تاثیر یہ سب ایسی خوبیاں ہیں جو اُردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں۔"

مقدمات عبدالحق حصّہ دوم صہ ۱۳

حالی کا یہ بھی خیال ہے کہ غزل میں اخلاقی مضامین کو داخل کرنے سے اس صنف کے حسن میں کمی نہیں آتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں گرمی نہیں پیدا ہوتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور درد جدائی اور کاہش انتظار اور رشکِ اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر پیرایہ میں بیان کرنا نہایت مشکل ہے، اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو، اور بچہ جو چونچال نہ ہو۔ دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے معاصرین کے لیے سوز و گداز کا اس قدر مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک نبٹ نہیں سکتا۔"

(مقدمہ شعر و شاعری صہ ۱۴۸)

اسی اخلاقی تصوّر کو مدِنظر رکھ کر عبدالحق میر کے اخلاقی اشعار پر تبصرہ کرتے ہیں:

"لیکن کبھی کبھی وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی، صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں، جس پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں۔ یہ خاص انداز میر صاحب کا ہے"

(مقدمات عبدالحق حصّہ دوم صہ ۱۳)

حالی نے تخییل کو شاعری کے لیے لازمی قرار دیا ہے مگر انھوں نے یہ بھی مشورہ

دیا ہے کہ تخیل کو قوتِ ممیزہ کا محکوم رکھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اُن کی مندرجہ ذیل سطور بہت اہم ہیں:

"جس طرح انسان بھوک کی شدت میں جب معمولی غذا نہیں پاتا تو مجبوراً بناسپتی سے اپنا دوزخ بھر کر صحت کو خراب کر لیتا اور اکثر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب قوتِ متخیلہ کو اس کی معتاد غذا نہیں ملتی تو وہ غیر معتاد غذا پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ خیالات دور از کار جن میں اصلیت کا نام و نشان نہیں ہوتا تراش کر بہ تکلف اُن کو شعر کا لباس پہناتی ہے۔"

(مقدمۂ شعر و شاعری ص ۶۵)

مولوی عبدالحق بھی اس کے قائل ہیں کہ قوتِ متخیلہ کو قوتِ ممیزہ کے قابو میں ہونا چاہیئے اسی بنا پر وہ میر کے کلام کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

"اُن کا کلام دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغے، اور عادت امور سے پاک ہے بھونڈے اور بے جا تکلف و تصنع اور فضول لفاظی کا نام نہیں۔"

(مقدماتِ عبدالحق حصہ دوم ص ۱۶)

حالی کلام میں تاثیر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ سعدی کے اشعار کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں "ان کا کلام اثر سے خالی نہیں اور اسی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ ان کے دل سے نکلا ہے"

(مقدمۂ شعر و شاعری ص ۱۳۴، ۱۳۵)

مولوی عبدالحق بھی کلام میں تاثیر کے قائل ہیں۔ چنانچہ میر کے کلام کی نسبت فرماتے ہیں:

"شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اس کلام کی تاثیر ہے۔ اگر اس معیار پر میر صاحب کے کلام کو جانچا جائے تو ان کا رتبہ اُردو شعرا میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہے"

(مقدماتِ عبدالحق حصہ دوم ص ۱۷)

حالی نے نیچرل شاعری پر زور دیا ہے۔ نیچرل شاعری کے بارے میں حالی کا خیال یہ ہے:

"نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے مطابق ہو۔ لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے ...... یعنی "نیچر کے موافق

ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جیسی کہ ہمیشہ دُنیا میں ہوا کرتی ہیں، یا ہونی چاہئیں۔" (مقدمۂ شعر و شاعری صہ ۱۰۵)

مولوی عبدالحق نے مُسدّس حالیؔ پر بھی مقدمہ لکھا ہے اور اس پر بھی حالیؔ کے نظریات کی روشنی میں تبصرہ کیا ہے، چنانچہ ان کی رائے ہے کہ مُسدّس کے بندوں میں "جو سادگی، خلوص، جوش اور صداقت ہے، اُس کا کہیں جواب نہیں۔" آگے چل کر اسی نظم کی تعریف میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"لیکن زبان کی حقیقی فصاحت دیکھنی ہو تو اس نظم میں دیکھنی چاہیئے جس میں مختلف قسم کے مضامین و واقعات نہایت بے تکلفی اور روانی کے ساتھ ادا کئے گئے ہیں۔ اس پر بیان کا تسلسل اور مضامین کی بلندی قابلِ دید ہے۔ نظم میں الفاظ کا صحیح استعمال جس طرح مولانا نے کیا ہے اور زبان کو اخلاقی اور حکیمانہ خیالات ادا کرنے کے لیے جس طرح وہ کام میں لائے ہیں وہ انھیں کا حصّہ ہے۔"

(مقدّماتِ عبدالحق حصّہ دوم صہ ۵۹)

یہ سارے خیالات حالیؔ کے ہیں۔ جو حق کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔۔

حالیؔ نے عرب کے شعرا کے کلام کی تعریف کی ہے اور ان کی شاعرانہ ہمت و جراٗت کی داد دی ہے، اور مختلف مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ عرب کے شعرا اپنی خودداری کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔ عبدالحق کو یہ خوبیاں حالیؔ کی شاعری میں بھی نظر آتی ہیں چنانچہ اُن کا قول ہے کہ "اُس کے کلام میں عرب شاعروں کا سا فخر، آزادی اور مردانہ پن پایا جاتا ہے۔"

مولوی عبدالحق نے دیوانِ اثر پر بھی مقدمہ میں بھی حالیؔ کی گونج موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

"دیوان مختصر ہے، کچھ غزلیں ہیں، کچھ قطعے اور رباعیاں اور کچھ مختلف مطلعے، مگر نہایت ہی پاک اور ستھرا کلام ہے۔ نہ فارسی ترکیبیں ہیں۔ نہ تعقید و اغلاق ہے۔ اور نہ بعید از کار تشبیہات و استعارات سے کچھ کام لیا ہے اور نہ تخیل کی بلند پروازی ہے چھوٹی چھوٹی بحریں اور سادہ سادہ لفظ ہیں، اتنے سادہ کہ ان سے بڑھ کر سادہ مل نہیں سکتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سادگی اور سلاست پر خوبی یہ ہے کہ اثر سے خالی نہیں۔ ان کی زبان دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

اُردو کے کسی شاعر کو ایسی سلیس زبان نصیب نہیں ہوئی۔"
(مقدمات عبدالحق حصّہ دوم ص۶۴، ۶۵)

مولوی عبدالحق نے اثرؔ کی مثنوی "خواب و خیال" پر بھی تبصرہ فرمایا ہے اور اس کی زبان اور سلاست کی داد مندرجہ ذیل الفاظ میں دی ہے:

"شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی، روزمرّہ کی صفائی، قافیوں کی نشست، اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی خواب و خیال کا مقابلہ کر سکتی ہے۔" (مقدمات عبدالحق حصّہ دوم ص۲۷)

عبدالحق کا یہ تبصرہ بھی حالی کے مقررہ اصولوں سے آگے نہیں بڑھتا ہے۔ اور زبان روزمرہ، محاورہ، قافیہ، بندش اور چستی کی حد بندیوں سے باہر نہیں نکلتا ہے۔ یہی حال عبدالحق کے اس تبصرے کا ہے جو انھوں نے نواب واجد علی شاہ کی مثنوی "حُزنِ اختر" پر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"نظم سیدھی سادی ہے اور ان تکلّفات سے بری ہے جو اس وقت لکھنؤ کی شاعری میں عام طور سے پائے جاتے تھے۔ اپنے دلی جذبات اور حالات کو بے تکلّف بیان کر دیا ہے" (ادبی تبصرے ص۳۴)

غرض یہ کہ عبدالحق نے تنقید نگاری کے لیے تقریباً انھیں اصولوں سے کام لیا ہے، جو حالیؔ نے مقرر کیے ہیں اِس معاملہ میں وہ حالی کی ڈگر سے بالکل نہیں ہٹے ہیں۔ بلکہ اِسی پر آنکھ بند کر کے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ بعض اوقات اپنی رائے دینے کے بجائے حالیؔ کے اقتباسات پیش کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حالیؔ کی رائے سے سرِمو انحراف کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ انتخاب کلام میرؔ پر مقدمہ لکھتے ہوئے انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ "یہ خوبیاں میر کے منتخب کلام میں پائی جاتی ہیں ورنہ ان کا ضخیم کلیات "رطب و یابس سے بھرا پڑا ہے"۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ تقریباً ہر شاعر کے کلام میں کچھ نہ کچھ اِس قِسم کا رطب و یابس ملتا ہے، اور اپنے بیان کی تائید میں انھوں نے حالیؔ کی رائے کو پیش کیا ہے، اور کہا ہے:

"اس پر مولانا کی عام رائے نقل کر دینا جو انھوں نے شعرا کی نسبت لِکھی ہے لطف

سے خالی نہ ہوگا۔ "

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے ـــــ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کو پیش کیا تو کہا "اس آخری شعر پر مولانا حالیؔ نے اپنے مقدمہ دیوان میں ایک نہایت ہی پُر لطف لطیفہ لکھا ہے جس سے نہ صرف اِس شعر کی خوبی بلکہ میرؔ صاحب کے کلام کی خصوصیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔" اس کے بعد حالیؔ کی عبارت نقل کردی ہے۔ اسی مقدمہ میں عبدالحق نے ایک جگہ اور بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اُنھوں نے میرؔ کی مثنویوں کی تعریف کی ہے اور ان کی خوبیوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں، اور اپنی بات کو پُرزور بنانے کے لیے حالی سے مدد لی ہے اس لیے کہا کہ "میر کی مثنویوں کے متعلق مولانا حالیؔ کی رائے بہت سنجی اور جچی تلی ہے" اِس کے بعد حالیؔ کا طویل اقتباس پیش کر دیا ہے۔

عبدالحق نے حالیؔ سے ایک بات اور سیکھی ہے۔ حالیؔ نے پہلی بار اُردو میں سماج اور شاعری کے گہرے تعلق کو واضح کیا ہے۔ اُنھوں نے اِس بات کو ثابت کر دیا کہ شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اور "شاعری سوسائٹی کی تابع ہوتی ہے۔" اِس سلسلہ میں اُنھوں نے شفائیؔ صفاہانی اور عبید زکانی کی مثالیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ اُن پر ماحول کس حد تک اثر انداز ہوا۔ اُنھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ "قومی سلطنتوں میں شعرا کی قدر مفید ہوتی ہے۔" مگر "شخصی حکومت میں شاعر کی آزادی سے اس کو نقصان پہونچتا ہے۔" غرض یہ کہ حالی نے مختلف مثالوں اور طریقوں سے یہ ذہن نشین کرا دیا کہ شاعر اپنے ماحول سے گریز نہیں کر سکتا۔ شاعر اور ماحول کے گہرے رابطہ کا سبق عبدالحق کو حالیؔ سے ملا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب اُنھوں نے میر اور حالیؔ پر تبصرہ کیا تو تفصیل کے ساتھ اُن کی حیات اور اُن کے ماحول پر بھی روشنی ڈالی اور اس طرح شاعری اور سماج کے تعلق کو واضح کیا۔

حالیؔ کا اثر عبدالحق پر ایک دوسرے رُخ سے بھی پڑا ہے۔ حالیؔ اگرچہ انگریزی کافی نہیں جانتے تھے، مگر انگریزی ادب کی افادیت اور اہمیت سے واقف تھے۔ اسی لیے اُنھوں نے اِس بات کو ضروری سمجھا کہ اُردو ادب کے دامن کو انگریزی کے خیالات اور انگریزی کتب کے ترجموں سے وسیع کرنا چاہیئے چنانچہ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی فرماتے ہیں:

" فارسی میں کم، عربی میں زیادہ، اور انگریزی میں بہت زیادہ نہ صرف نظم، بلکہ نثر میں، نظم سے زیادہ ہر قسم کے بلند، لطیف اور پاکیزہ خیالات کا ذخیرہ موجود ہے۔ پس ہمارے ہم وطنوں میں جو لوگ ایسا دماغ رکھتے ہیں کہ غیر زبانوں سے نئے خیالات اخذ کر کے ان میں عمدہ تصرفات کر سکتے ہیں وہ اپنے مبلغ فکر کے موافق تصرف کر کے جن کی قوتِ متخیلہ ان سے کم درجہ کی ہے وہ انھیں خیالات کو بعینہا اپنی زبان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ترجمہ کر کے اُردو شاعری کو سرمایہ دار بنائیں۔"

(مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۵۹، ۱۶۰)

عبدالحق بھی دیگر زبانوں کے ادب اور خاص طور پر سے انگریزی ادب کے خیالات کو بذریعہ ترجمہ اُردو میں منتقل کرنے کی موافقت میں ہیں۔ چنانچہ محمد عمر اور نور الٰہی کے ڈراما " روح سیاست" پر جو انگریزی سے ترجمہ ہے، تبصرہ کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اس طرح سے اظہار کرتے ہیں :

" مگر ہمارے مُلک کی حالت اس وقت ایسی ہے کہ اسے اعلیٰ تصانیف کے ترجمے کی شدید ضرورت ہے تاکہ اہل ملک کے سامنے بہترین نمونے موجود ہوں۔ ان میں ذوق سلیم پیدا ہو، اور عمدہ تصانیف کی ترغیب و تحریک ہو ایک مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی تصنیف سے، ایک اعلیٰ درجہ کی تصنیف کا ترجمہ بدرجہا بہتر ہے۔"

(ادبی تبصرے ص ۳۰۲)

حالی کی ایک اور خصوصیت عبدالحق میں پائی جاتی ہے۔ حالی تنقید نگاری کے سلسلہ میں اپنی رائے کا اظہار بہت آزادی اور دلیری کے ساتھ کرتے ہیں۔ انھوں نے جس ہمت اور جراُت کے ساتھ اُردو شاعری کی خرابیوں کو واضح کیا ہے، اور خاص طور سے لکھنوی شاعری کے تصنع پر حملہ کیا ہے یہ انھیں کا کام تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مخالفین کی پروا نہیں کی بلکہ بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس طرح سے انھوں نے مختلف تصانیف پر تبصرہ کرتے وقت بھی اپنی رائے کا بلا کسی جھجھک کے اظہار کر دیا، اور خامی کی طرف بھی نرم لہجہ میں اشارہ کر دیا۔ مثلاً آبِ حیات کی ایک خامی کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں :

"اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مُستند سمجھا جاتا تھا جیسے طبقۂ پنجم میں مومنؔ، یا میر نظام الدین ممنونؔ۔ لیکن اس کا یہ عُذر ہو سکتا ہے کہ مُصنّف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دَور کا کوئی مُستند شاعر فروگزاشت نہیں۔

(ریویو آبِ حیات مطبوعہ اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۱ء بہ حوالۂ داستانِ تاریخ اُردو مولفہ حامد حسن قادری)

حالیؔ نے آبِ حیات کی خامی کی طرف اشارہ کر دیا ہے، مگر نیک نیتی کے ساتھ۔ اس میں نہ کوئی رشک کا پہلو ہے نہ حسد کا، اور نہ مخالف کو زیر کرنے کا۔ بلکہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ آزادیٔ رائے کے حامی ہیں۔ اسی آزادیٔ رائے کا اظہار ہم کو عبدالحق کے تبصروں میں بھی ملتا ہے بلکہ وُہ اس معاملہ میں حالیؔ سے بھی کچھ بڑھ گئے ہیں۔ کیونکہ بعض اوقات اُن کا لب و لہجہ تُند ہو جاتا ہے۔ "اُردو تنقید" میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے عبدالحق کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اُن کی تنقید "مصلحت کیشی کے تابع" ہوتی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا یہ خیال عبدالحق کے مُندرجہ ذیل جُملہ پر مبنی ہے جو اُنھوں نے خواجہ حسن نظامی کے مضامین کے مجموعہ "سی پارۂ دِل" کے بارے میں لِکھا ہے:

"مَیں نے کچھ اور بھی کہنا چاہا کہ عقل نے اجازت نہ دی اور مصلحت نے قلم روک دیا اور کہا بس۔" (ادبی تبصرے صہ ۹۵)

ڈاکٹر احسن فاروقی نے اس جملہ سے جو نتیجہ اخذ فرمایا ہے میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے یہ جملہ محض تحریری دلکشی پیدا کرنے کے لیے لِکھ دیا ہے۔ یہاں پر مَولوی صاحب کے سنجیدہ قلم نے کچھ شوخی دکھائی ہے۔ ورنہ دراصل اُن کو جو کچھ کہنا تھا، وہ اِس سے قبل سطروں میں کہہ گئے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ "آج کل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کے لیے خواہ مخواہ لوگ عربی فارسی کی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بیچاری اُردو کی گردن پر ڈال دیتے ہیں۔"

یہ جملہ اپنی جگہ پر خود ہی ایک زبردست وار ہے۔ اس سے زیادہ مولوی صاحب کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ اس کے آگے جو کچھ کہا جائیگا۔ وُہ پھکڑپن ہوگا، اور پھکڑپن مولوی عبدالحق

کی فطرت میں داخل نہیں ہے۔ وہ نہایت سنجیدہ بُردبار اور متین قسم کے انسان ہیں۔ اسی لیے وہ سنجیدگی کے ساتھ ادب پر تبصرہ کرتے ہیں، اور یہ تبصرہ بالکل بے لاگ ہوتا ہے۔ وہ تبصرہ کرتے وقت بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت اُن کے مختلف تبصروں کے مطالعہ سے ہم کو مل سکتا ہے۔ مثلاً "وہ اُردو شہ پارے" مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس کتاب میں بھی وہی خامی پائی جاتی ہے جو مولف کی ہر کتاب میں نظر آتی ہے یعنی عجلت بعض نوجوان انشا پردازوں کو مصنّف بننے کی اس قدر عجلت ہوتی ہے کہ اُن کے کاموں میں ایسی قابلِ افسوس خامیاں رہ جاتی ہیں جو صرف محنت اور غور کرنے ہی سے رفع ہو سکتی ہیں"

(تنقیداتِ عبدالحق ص۲۷)

اُنھوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ "جس کلام کا انتخاب کیا گیا ہے، اُس کے پڑھنے میں محنت اور غور نہیں کیا گیا، اور جیسا غلط سلط لکھا ہوا تھا، ویسا ہی نقل کر دیا گیا ہے"۔ اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اکثر الفاظ کے معنی غلط دیئے ہیں، اور محض قیاس سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "بعض بعض باتیں اس کتاب میں عجب ملتی ہیں جس سے ہمارا یہ شبہ قوی ہو جاتا ہے کہ قابلِ مولف جن کتابوں کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں، اُن کا مطالعہ یا اُنھوں نے بالکل نہیں کیا ہے، یا کیا ہے۔ تو محض سرسری"۔ اِسی طرح سے "زبانِ اُردو پر سرسری نظر" کے عنوان سے اُنھوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایک لکچر پر تبصرہ کیا ہے، اور رشید صاحب کی کافی مُخالفت کی ہے۔ اس موقع پر بھی مُولوی عبدالحق کی ادبی جرأت مُلاحظہ فرمایئے:

"صدیقی صاحب مُردوں سے بہت بے باک ہیں لیکن زندوں سے ڈرتے ہیں۔ اُنھوں نے ہر زندہ انشا پرداز کی جو ذرا بھی شہرت رکھتا ہے یا مقبول ہے، خوب تعریف کی ہے۔ اور اگر کہیں کسی کے متعلق ہلکا سا دبی زبان سے کوئی جملہ کہہ بھی دیا تو جھٹ اس کی پیٹھ بھی ٹھونک دی ہے تاکہ وہ چیں بہ جبین نہ ہو جائے"

(تنقیداتِ عبدالحق ص۱۱۱)

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی "آیات و نغمات" کے بارے میں نہایت

بے باکانہ اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

"جوش و خروش اور انقلاب کے نعروں سے اُن کا کلام گونج رہا ہے لیکن انقلاب کیا ہے ؟ نظامِ جدید سے کیا مطلب ہے ؟ اِس سے اُنھیں بحث نہیں۔ اُنھیں تو.... غارت گری سے مطلب ہے، اس میں تغیّر تو ہے۔ اُن کی حالت ایک تماشائی کی سی ہے جس پر بیتتی ہے اور اپنے اصولوں کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہے اور خوشی خوشی ہر طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے، اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے۔ جوش کے کلام کو پڑھ کر لُطف و سرور ہوتا ہے، لیکن اس میں بلندیٔ فکر اور تاثیر نہیں۔"

(ادبی تبصرے ص۳۰)

اِن تبصروں سے مصلحت کیشی تو بالکل ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آزادی اور بے باکی ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور، رشید احمد صدیقی اور جوش جیسی نامور ہستیوں کے خلاف جو آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے، وہ ایک سچا اور آزاد نقاد کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کو "بُت پرست" نہیں بلکہ "بُت شکن" کا لقب زیب دیتا ہے۔

اِن سارے بیانات اور اقتباسات سے یہ بات بڑی حد تک واضح ہوگئی ہے کہ عبدالحق تنقید نگاری میں حالی کی پیروی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے جو تنقیدی اُصول منضبط کئے ہیں وہ اب بھی بہت ٹھوس، اٹل اور جامع ہیں، مگر وہ تنقید نگاری جو حالی کے زمانہ میں بہت ہی کم سن تھی اب کافی بالغ ہوگئی ہے اور اب اس کے خدوخال میں کافی تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ مولوی عبدالحق کی نظروں سے غالباً یہ تبدیلیاں پوشیدہ ہیں، اور وہ اَب بھی اس کو بہت کم سن اور الھڑ سمجھتے ہیں، جتنی وہ حالی کے زمانہ میں تھی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کو انگریزی ادب پر عبور حاصل نہیں ہے، اور موجودہ دور میں مغربی ادب کی روشنی میں اُردو تنقید مختلف منزلوں کو طے کر رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ :

عبدالحق کی تنقید موجودہ عہد کی اُردو تنقید کے دوش بدوش نہیں چلتی ہے بلکہ پیچھے رہ جاتی ہے، اور حالی کی منزل پر پہونچ کر سستانے لگتی ہے۔ مولوی عبدالحق کسی شاعر کے کلام پر یا کسی ادیب کی نثر پر تبصرہ کرتے ہیں۔ زبان کی سادگی اور سلاست، محاورہ کی بندش اور چستی، روزمرّہ کی سادگی اور صفائی، بیان کی وضاحت اور بلاغت اور اسی قسم کے حالی کے دیگر اُصولوں سے

آگے نہیں بڑھتے ہیں۔ وہ اصولِ فن سے کبھی بحث نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کی روشنی میں کسی ادب پارہ کو جانچتے ہیں۔ ادب اور سماج میں جس قدر گہرا تعلق ہے، وہ بھی ان پر بخوبی واضح نہیں ہے وہ اسباب وعلل سے بہت کم بحث کرتے ہیں، اسی لیے ان کی تنقید میں زیادہ گہرائی اور گیرائی ہم کو نہیں ملتی ہے۔ وہ موجودہ عہد کی ادبی تحریکوں سے بھی بہت کم دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق کم وبیش مغربی ادب سے ہے۔ اسی طرح سے وہ تنقید کے نئے اصولوں کی روشنی میں کسی فن کار کے ادب کو بہت کم جانچتے ہیں۔ اسی لیے ان کی تنقید زیادہ تر تشریحی تنقید ہوتی ہے وہ استقرائی تنقید، تاریخی تنقید، جمالیاتی تنقید اور نفسیاتی تنقید کے اہم اُصولوں سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ اسی لیے اُن کی تنقید کا دائرہ بہت محدود ہے لیکن اس محدود دائرہ میں انھوں نے جو تنقید کی ہے وہ اپنی جگہ پر بہت ٹھوس اور بھاری بھر کم ہے۔ دراصل عبدالحق نے حالی کے فنِ تنقید کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے مگر اس کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ یا کلیم الدین احمد کے الفاظ میں "نقاد کی حیثیت سے وہ حالی کے دوش بدوش نہیں چلتے ہیں بلکہ مودبانہ طور پر سعادت مند شاگرد کی طرح پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔"

عبدالحق اگرچہ کوئی سوانح نگار نہیں ہیں اور نہ انھوں نے کسی کی سوانح حیات باقاعدہ لکھی ہے مگر انھوں نے "چند ہم عصر" میں کچھ سوانحی خاکے ضرور پیش کئے ہیں۔ ان سوانحی خاکوں میں بھی حالی کی سوانح نگاری کی خصوصیت نمایاں ہیں۔ حالی کی سوانح نگاری کی چند خصوصیت ہیں۔ مثلاً ان کی سوانح عمریاں تاریخی حیثیت سے قابلِ اعتبار ہیں۔ "حیاتِ سعدی" انھوں نے کافی چھان بین کر کے لکھی ہے۔ اس لیے وہ مستند ہے۔ "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید" میں چشم دید حالات لکھے ہیں، اس لئے ان کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔ انفرادی حیثیت سے بھی ان کی سوانحی عمریاں اہم ہیں۔ اُن کی سوانح عمریوں کے ہیرو بلند کردار اور اعلیٰ مرتبت ہوتے ہیں اور یہ سوانح نگاری کا ایک ضروری اُصول ہے کہ ہیرو کو اپنے عہد میں ممتاز ہونا چاہیئے، مگر حالی نے اپنے ہیرو کی تعریف میں مُبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ صداقت اور صحت کے ساتھ اس کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اس کو "مُدلّل مدّاحی" سمجھ بیٹھے یا اس کو وہ "کذب وافترا کا آئینہ" نظر آئے۔ اس کے علاوہ حالی کی سوانح عمریاں ادبی نقطہ نظر سے بھی دلکش اور جاذب نظر ہیں، اور ان میں سارے ادبی محاسن موجود ہیں سائنسی نقطہ نظر سے اُن کی سوانح عمریوں میں غنیمت اور قطعیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ

حالی کی سوانح عمریوں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ بالکل غیر شخصی ہیں۔ اپنے ہیرو کی تعریف کرتے وقت حالی نے اپنی ذات کو الگ رکھا ہے، اور وہ ہیرو کے معاملات میں خود مخل نہیں ہوتے ہیں۔

عبدالحق کے سوانحی خاکوں میں بھی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ یہ خاکے تاریخی، انفرادی، ادبی اور سائنسی نقطۂ نظر سے کافی کامیاب ہیں۔ ان میں صحیح واقعات درج کیے گئے ہیں۔ ان کے ہیرو خاص صفات کے مالک ہیں۔ ان خاکوں میں ادبی شان بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان خاکوں میں سائنس جیسی عینیت اور قطعیت بھی موجود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خاکوں میں چند ایسے حضرات کا ذکر ہے جن سے ہم زیادہ واقف نہیں ہیں۔ مثلاً حکیم امتیاز الدین نور خاں، نام دیو، اور در دیش پروفیسر وغیرہ مگر ان میں کچھ خوبیاں ایسی ضرور ہیں جو اپنے اندر کشش رکھتی ہیں۔ اس لیے مولوی عبدالحق نے ان پر قلم اٹھانا مناسب سمجھا ہے۔ اِن خصوصیات کے علاوہ یہ خاکے بھی بڑی حد تک غیر شخصی ہیں مولوی عبدالحق نے بھی ہیرو کے واقعات کے سلسلے میں اپنی ذات کو زیادہ تر الگ رکھا ہے۔ لیکن جہاں چشم دید واقعات یا ذاتی تعلقات انھوں نے دکھائے ہیں، وہاں اپنا ذکر ضرور کر دیا ہے اور یہ بات اُن کے لیے ناگزیر تھی۔ کیونکہ کوئی شخص اُسی کے بارے میں بہتر طور پر لکھ سکتا ہے جس سے وہ بذاتِ خود واقف ہو۔ اسی لیے سرسیّد، راس محمود، حالی، اور خواجہ غلام الثقلین کے بارے میں اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ معتبر بھی ہے اور مستند بھی اور ساتھ ہی دلچسپ بھی۔ لیکن ان لوگوں کے ساتھ انھوں نے خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ اسلوب کے لحاظ سے بھی حالی اور عبدالحق بہت قریب ہیں۔ درحقیقت سادہ اور زور دار نثر کی بنیاد سرسیّد نے ڈالی اور حالی نے سرسیّد کی پیروی کی۔ حالی کے اسلوب اور طرزِ نگارش کا اثر عبدالحق پر پڑا۔ لہٰذا عبدالحق کے اندازِ بیان میں تقریباً وہی خصوصیات ہیں، جو حالی کے اندازِ بیان میں ہیں۔ مثلاً عبدالحق کی نثر میں بھی حالی ہی جیسی سادگی اور سلاست، روانی اور صفائی۔

ملتی ہے۔ اسی لیے اُن کا اندازِ بیان عام فہم ہوتا ہے۔ وُہ عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ استعمال نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں ہندی کے الفاظ نہایت بے تکلفی کے ساتھ آجاتے ہیں، جو لطف دے جاتے ہیں۔" زبانِ اُردو پر سرسری نظر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں" جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے اُس میں بگڑنے کے بھی لچھن ہوتے ہیں۔" اس طرح عبدالحق کے یہاں روزمرّہ کے الفاظ بہت ملتے ہیں، مگر ایک خاص بات یہاں قابلِ ذکر یہ ہے کہ حالی کی طرح عبدالحق انگریزی الفاظ کا استعمال نہیں کرتے۔ حالی نے انگریزی الفاظ کچھ ضرورت کی بنا پر اور کچھ شوق کے تقاضہ پر جا بجا استعمال کئے ہیں۔ کیونکہ انگریزی نئی نئی اُردو کی محفل میں آئی تھی۔ اس لیے اس کے الفاظ کو عام کرنے اور اس کے ذریعہ سے مغربی خیالات کو اُردو میں مُنتقل کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت بھی تھی۔ مگر اَب چونکہ اُردو دان طبقہ انگریزی الفاظ اور ان کے مفہوم سے کافی واقف ہو گیا ہے، اس لیے انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ ضروری بھی نہیں رہا ہے۔

حالی کی پیروی میں عبدالحق نے مُختلف مقامات پر محاورات کا بھی استعمال کیا ہے۔ مگر یہ استعمال بالکل فطری انداز میں ہے۔ اس لیے محاوروں کے استعمال میں تکلّف اور تصنّع نہیں پیدا ہونے پایا ہے۔ غرض یہ کہ عبدالحق نے اپنے مطالب کو نہایت صاف، سلیس، بامحاورہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔

عبدالحق کی نثر میں یہاں حالی ہی کی جیسی متانت اور سنجیدگی کی فضا بھی ملتی ہے وُہ طنز و ظرافت سے بہت کام لیتے ہیں، مگر بعض مواقع پر اُن کے قلم نے ظرافت کے پھول برسائے ہیں، اور کہیں کہیں طنز کے بھی تیر چلائے ہیں۔ مثلاً "نشہ پارے" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔" نورس کو اُردو کی کتاب کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی گیتان جلی کو اُردو کی کتاب کہے۔" اِسی طرح "ایک تذکرہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے، لکھتے ہیں۔"جب شاعری کا دائرہ اس قدر محدود اور تنگ کر دیا جائے تو پھر آدمی بجائے شاعری کے بڑھئی کا کام کیوں نہ کرے۔" اِن جملوں میں طنز و ظرافت کے چھینٹے موجود ہیں مگر اس قسم کی مثالیں اُن کے یہاں کم ملتی ہیں۔

عبدالحق کی نثر میں رنگینی اور شگفتگی بھی کم ملتی ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ وُہ پہلے

محقق ہیں اور بعد میں نقاد۔ اُن کی نثر میں عقلیت کو زیادہ دخل ہے۔ وہ عقل کی روشنی میں مختلف دلائل و براہین کے ذریعہ مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تحلیل و تجزیہ کے کام میں رنگینی اور شگفتگی مدد نہ کر سکے گی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کی نثر بالکل خشک ہوتی ہے۔ اس ریگستان میں کہیں کہیں نخلستان بھی نظر آجاتے ہیں۔ مثلاً میر کے حالات میں ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ دلی کے اقبال کی شام تھی جس کی سحر اب تک طلوع نہیں ہوئی" یا نواب واجد علی شاہ کے حالات کے سلسلے میں لکھتے ہیں "سچ یہ ہے کہ لکھنؤ کا جسم تو اودھ میں تھا مگر اس کی جان مٹیا برج میں تھی۔" اس قسم کے مختلف ٹکڑے عبدالحق کی نثر کو خشکی سے بچا لیتے ہیں۔

عبدالحق کی نثر میں عام طور سے جذبہ کی بھی کمی پائی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی نثر پر فکر غالب رہتی ہے۔ اُن کا اندازِ بیان زیادہ تر مفکرانہ ہوتا ہے اسی لیے اس میں کشش اور جاذبیت کم ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مولوی عبدالحق انشاپرداز نہیں بلکہ بڑی حد تک سر سیدؔ اور حالی کی طرح پیغامبر ہیں۔ اُن کا مقصد دوسروں تک اپنی بات کو پہنچانا ہوتا ہے اور یہ کام وہ سیدھے سادے الفاظ میں کر جاتے ہیں۔ اسی لیے اُن کی نثر میں گرمی اور حرارت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ حرارت اور گرمی بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ سیدؔ محمود کی وفات پر مولوی عبدالحق نے حیدرآباد کے جلسۂ تعزیت میں تقریر کی اور سر سیدؔ اور سیدؔ محمود کو اِن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

> "لیکن اب علی گڑھ کی عظمت دو چند بلکہ صد چند بڑھ گئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک بدنصیب قوم کے دو بے بہا لعل مدفون ہیں۔ ان میں سے ایک باپ ہے جس نے کسان کی طرح شب و روز محنت کی اور خون پسینہ ایک کر کے اپنی قوت اور کندھے کے زور سے اپنی قوم کو پستی اور ذلت سے نکال کر اُبھارا۔ دوسرا بیٹا ہے جو آسمانِ لیاقت پر شہابِ ثاقب کی طرح چمک کر زمین میں غائب ہو گیا۔ یہاں سیاح اور مسافر دور سے آئیں گے اور دو آنسو بہا جائیں گے۔" (چند ہم عصر ص ۲۷)

مگر اس قسم کی نثر کے نمونے عام طور سے اُن کے یہاں کم ملیں گے۔ اُن کا اندازِ بیان

زیادہ تر وضاحتی ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میں تشبیہات و استعارات کا بھی کم استعمال ہوتا ہے۔ اُن کا مزاج حالی ہی کی طرح بڑی حد تک سائنسی ہے۔ اس لیے اُن کے لب و لہجہ میں عینیت اور قطعیت ہوتی ہے۔ وُہ اپنے نظریات کو صحیح اور جچے تُلے الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔ وُہ عبارت آرائی اور رنگینیٔ بیان سے کام نہیں لیتے ہیں۔ اسی لیے بعض شاعرانہ مزاج کے لوگ شکایت کرتے ہیں کہ اُن کی نثر میں ایک قِسم کا روکھا پن اور خشکی پائی جاتی ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔ اُن کی سادگی میں ایک قِسم کا حُسن ہوتا ہے۔ اس حُسن کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں عبدالحق کی نثر کے بارے میں ایک بات اور عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُن کا قلم حالی کی طرح ہر موقع پر ایک ہی طرح جُنبش کرتا ہے۔ وُہ میرؔ اور حالی، سر سیّد اور سیّد محمود کے واقعات کو ایک ہی لَے میں پیش کرتے ہیں اور کہیں بھی آواز میں زیر و بم پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اِسی لیے اُن کے یہاں ایک قِسم کی یکسانیت اور پھر ہمواریت آ گئی ہے۔ اِس یکسانیت اور ہمواریت کو مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بھی محسوس کیا ہے۔ اُنھوں نے "چند ہم عصر" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کے مختلف حصّوں میں تفاوت پایا جاتا اور نشیب و فراز دونوں کی مثالیں کثرت سے ملتیں، لیکن حیرت ہے کہ ایسا نہیں ہے اور طرزِ اُسلوب کی یکسانی اور یک رنگی بڑی حد تک قائم ہے۔ مولوی صاحب عموماً سادہ نویس و سنجیدہ نویس ہیں گویا حالی کے مُتنّیٰ ہیں۔"

عبدالحق حالی کے مُتنّیٰ صرف طرزِ تحریر ہی میں نہیں ہیں بلکہ اندازِ تنقید میں بھی ہیں، مگر حالی کا مُتنّیٰ ہونا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے بھی ذہانت، قابلیت اور فہم و فراست کی ضرورت ہے اور یہ خوبیاں مولوی عبدالحق میں موجود ہیں۔

---

ڈاکٹر سیدہ جعفر

# عبدالحق کے تنقیدی تصوّرات

مولوی عبدالحق کے تنقیدی تصورات اُن کی تحریروں میں بہت صاف اور واضح نظر آتے ہیں وہ مغربی اور مشرقی اُصولِ نقد سے واقفیت رکھتے ہیں اور اُنہوں نے اپنے تنقیدی مضامین، اپنے خطبات اور مقدمات میں اِن دونوں سے مدد لی ہے اور انہیں بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ عبدالحق کو اس کا بھرپور شعور ہے کہ مشرقی ادب کو مغربی اصول تنقید سے جانچا تو جا سکتا ہے لیکن ہر ادب اور زبان کا ایک خاص لسانی کردار اور ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے، جس کی طرف نقاد کو بہرحال متوجہ رہنا چاہیئے اور اس سے بے اعتنائی، نقاد کو گمراہ بھی کر سکتی ہے۔

وہ ہر مغربی نظریۂ ادب کو اُردو کے لیے ناگزیر نہیں سمجھتے۔ اُن کا خیال ہے کہ اُردو ادب کی کچھ اپنی ذاتی خصوصیات اور انفرادی قدریں بھی ہیں، جنہیں مغربی کارناموں کے معیار سے جانچنا ہماری خام ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے مغربی اُصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بھی اُس اندازِ تنقید کو اختیار کیا ہے جسے تاریخی طریقۂ تنقید کہا جا سکتا ہے۔ اس تنقید میں کارنامے کے ماحول کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے اور اُن تمام سماجی اور تاریخی محرکات اور عوامل اور اس سارے پس منظر کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جس میں اس مخصوص ادبی تخلیق نے جنم لیا ہے۔

مثال کے طور پر "باغ و بہار" ہمارے دور میں نہیں لکھی جا سکتی تھی اسے انیسویں صدی کے آغاز ہی میں لکھا جانا چاہیئے تھا، اور اس کو جانچنے کے معیار اسی کے ماحول سے اخذ کئے جا سکتے ہیں نہ کہ "گئودان" کے دور سے۔ اسی طرح "ضربِ کلیم" لکھنؤ کے عروج کے

عہد میں نہیں لکھی جا سکتی تھی، اسے اس زمانے کے ادب کی کسوٹی پر پرکھنا ہماری بھول ہے، اور عبدالحق کبھی اس کا شکار نہیں ہوتے۔ ادبی اکتسابات زمانے اور مقام کے پابند ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے جانچنے کے معیار بھی عصری اور مقامی خصوصیات کے حامل ہونے چاہئیں۔ عبدالحق کی تنقیدوں میں ہر جگہ اسی احساس کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اُن کی اسی خصوصیت کے متعلق لکھا تھا:

"ان کی تنقید مشرقی فضاء میں سانس لیتی ہے اور وہ مشرقی ادب کو محدود مقامی مشرقی معیار سے جانچنے اور کھرے کھوٹے میں امتیاز کرتے ہیں۔"

عبدالحق نے مشرقی اصطلاحات اور مشرقی اصول تنقید سے اپنے استفادہ کرنے کا بڑا اچھا جواز پیش کیا ہے "اُردو تنقید کا ارتقاء" کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں:

"مشرقی کلام کی تنقید میں کیوں نہ مشرقی اصطلاحات اور معانی و بیان کے الفاظ سے کام لیں۔ یہ ہمارے ادب میں شروع سے مستعمل ہیں اور ان کا مفہوم متعین ہے۔ پڑھنے والے ان الفاظ اور اصطلاحات کا مفہوم بلا تامل سمجھ لیتے ہیں۔"

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تنقید میں ترقی پرور رجحانات سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کی بحث اصطلاحات سے ہے۔

انہوں نے اپنی تحریروں میں نئے ادبی میلانات کا خیر مقدم کیا ہے۔ عبدالحق کو اس کا بھی احساس ہے کہ نئے دور کا ادب پرانے سانچوں میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ نئے حالات میں ادب کو نیا روپ دھارنا ہے۔ اس لیے اس کی جانچ پڑتال کے پیمانے اور اس کے حسن و قبح کی کسوٹیوں میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے۔

عبدالحق نے اپنے تنقیدی مضامین میں ادب کے نئے نئے تجربات، جدید اسالیب اور نئے نئے پیکروں کی کھلے دل سے داد دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ادب میں نئے تجربات اور نئے انداز سموئے نہ جائیں گے تو اس میں ٹھہراؤ اور سکوت پیدا ہو جائے گا۔

ادب اور زبان کو وہ ایک حرکی قوت اور ایک نامیاتی حقیقت سمجھتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"ہمارے اصول، عقائد اور خیالات کیسے ہی اعلیٰ اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ

ہمیں کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں، اگر زمانے کے اِقتضاء کے مطابق اُن میں جدت اور تازگی پیدا نہیں کی جائے گی تو ایک روز بند پانی کی طرح اِن میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے جراثیم پیدا ہو جائیں گے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔"

عبدالحق نے ن۔م راشد کے مجموعۂ نظم "ماوراء" پر تنقید کرتے ہوئے، اپنے ایک مضمون میں نظمِ آزاد، ادب میں ہیئت کے جو نئے انداز کا اضافہ کر رہی ہے، اُس کو مستحسن قرار دیا ہے۔ ن۔م راشد، اپنی نظموں میں جو نئے نئے الفاظ ڈھالتے ہیں اور جو مرکبات تراشتے ہیں، اُن پر عبدالحق نے اظہارِ پسندیدگی کیا ہے اور اس شعر کی بھی تعریف کی ہے:

اُڑ کے پہنچوں میں وہاں روح کے طیارے ہیں
سرعتِ نور ہیں یا آنکھ کے پلکارے ہیں

اِسی مقدّمے میں نئے اَدبی پیکروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نئے اسلوب اور اظہار کے نئے ڈھنگ کوئی جرم نہیں لیکن نئے ڈھنگ کیوں نامعقول ہوتے ہیں؟ اِس لیے نہیں کہ وہ نئے ہیں بلکہ اس لیے کہ اُن کے برتنے والے میں خامی ہے۔ اگر شاعر کے خیالات میں جدّت، تازگی اور گہرائی ہے اور ان کا اظہار، حسن اور سلیقے سے کر سکتا ہے تو نئے اسلوب ایک دِن ضرور مقبول ہوں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادب میں نیا اور پرانا کوئی چیز نہیں۔"

وہ اپنی جدّت پسندی کے باوجود، اس خیال کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں کہ ادب کو ماضی کی تمام روایتوں سے ناتا توڑ لینا چاہیئے۔ اُن کا خیال ہے کہ ادب اگر اپنے قدیم سرمائے سے بالکل قطع تعلق کرلے تو وہ اپنی ترقی کی راہ میں ایک اوّلین منزل تک پہنچ نہ سکے گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہے، سراسر رجعت سے آلودہ ہے صحیح نہیں۔ محض اِس بناء پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں، گزشتہ سے اپنا تعلق قطع نہیں کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے۔ ہم گزشتہ کے وارث ہیں۔"

عبدالحق کی تحریریں پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا نظریۂ تنقید بہت

وسیع، ہمہ گیر اور رنگارنگ تصورات سے مرکب ہے۔ انہوں نے اپنی تنقیدوں کو کسی ایک اصول کا پابند نہیں بنایا۔ عبدالحق کے پاس بہت سے تنقیدی مکاتیب خیال کے اثرات کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ اُن کی تنقیدیں سائنٹیفک اسکول کی بھی نمایندگی کرتی ہیں۔ ان میں تاثراتی تنقید کا پرتو بھی جھلکتا ہے اور تقابلی انداز بھی پایا جاتا ہے۔

وُہ میتھو آرنلڈ کی طرح ادب اور زندگی میں ایک اٹوٹ رشتہ دیکھتے ہیں اور انکی دانست میں نقاد اسی وقت کسی ادب پارے کا بخوبی تجزیہ کر سکتا ہے جب ادیب کا سماجی ماحول، اُس کے نجی واقعات اور ذاتی حالات، نقاد کے پیش نظر ہوں، اور اسی وقت وہ ان بنیادوں کا کھوج لگا سکتا ہے، جس پر فنکار کے ادبی مزاج، اُس کی شخصیت اور اس فنی تصورات کی تعمیر ہوئی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں "شعرالہند" پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات، اُس کی طبیعت، اُس کے خصائل اور عادات پر غور کی نظر ڈالیں، اور اس کے بعد اس کے عہد کے واقعات و حالات اور تغیرات و انقلاب کا ذکر کم سے کم اِس حد تک ضرور کریں جہاں تک کہ ان کا تعلق شاعر اور اس کی شاعری سے ہو"

یہ بھی درست ہے کہ اِس اُصول کی اندھا دھند پیروی سے بعض وقت وہ صورتیں بھی پیش آسکتی ہیں جنہیں "مصنّف کو پڑھ ڈالنے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عبدالحق نے اپنی تنقیدوں میں سائنٹفک تنقید کے اِس نکتے کو ملحوظ رکھا ہے۔

اُن کی تنقیدوں کا انداز تجزیاتی بھی ہے۔ وُہ شاعر یا ادیب کی کسی خصوصیت کو یوں ہی تسلیم نہیں کر لیتے بلکہ اس پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے، اس کے عناصر کا پتہ لگاتے اور اسے کریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میر کی شاعری میں جو نشتریت، جو درد مندی اور گداختگی ہے، اُس کا تجزیہ اس طرح کیا ہے:

"میر کا کلام حسرت و ناکامی و مایوسی سے بھرا ہوا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میر صاحب بہت بڑے درویش کے بیٹے تھے، اُن کے بچپن کا تمام زمانہ درویشوں کی صحبت میں گزرا۔ خود والد نے ........ تلقین کی تو وہ بھی درویشانہ اور صوفیانہ اور خاص کر عشق اختیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔..... اس پر لڑکپن میں یتیم ہو گئے۔ ایک تو

یتیمی کا صدمہ، دوسرے عزیز و اقارب کی طوطا چشمی، زمانے کی بے مروّتی، بے سرو سامانی، یہ ایسی حالتیں نہ تھیں کہ ان کے دِل پر اثر نہ کرتیں۔ پھر وہ بھی ایسے زمانے میں جب مسلمانوں کے اقبال کا ستارا گہنا رہا تھا...... ان حسرت انگیز اور زہرہ گداز واقعات اور انقلابات کو دیکھا جو چند خاندانوں اور شہروں کا نہیں، ملکوں اور قوموں کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔"

تنقید میں تجزیے کو بڑی اہمیت ہے۔ اگر نقاد محض سطحی اُمور سے کھیلتا رہے اور سامنے کی باتوں کو دُھرایا کرے اور زیرِ بحث فن پارے پر سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر جائے تو پھر وُہ اپنی تنقید کو ژرف نگاہی، گہرائی اور سدا بہار عظمت کا کوئی اچھوتا نمونہ نہیں بنا سکے گا۔ نقاد ایک خاص معنی میں ادب کے سمندر کا غوّاص ہوتا ہے۔ دوسروں کی نظر نقاب میں اُلجھ کے رہ جاتی ہے۔ نقاد کی نگاہ نقاب کو اُلٹ کر اصل خدوخال کا نظارہ کر سکتی ہے، اور یہ باریک بینی، یہ پہنائی اور گہرائی میں ڈوب جانے کا انداز تنقید کو بلندی، تقویت، اور گرمی بخشتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ن۔ م راشد کے کلام، اُن کے ذہن اور ان کی نفسیات کا بڑے رچے ہوئے انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"زندگی سب کے لیے معمہ ہے۔ اس کے اسرار عقل سے نہیں کھلتے، اس لیے راشد صاحب جھنجھلاتے ہیں اور اخلاق اور معاشرت، گناہ، ثواب، عقل و فکر کے تمام اُصولوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن لاچار ہیں، کچھ بس نہیں چلتا۔"

عبدالحق نے اپنے تنقیدی مضامین میں تقابلی طریقۂ تنقید سے بھی مدد لی ہے۔ لیکن اس کی مثالیں اُن کی تحریروں میں بہت کثرت کے ساتھ نہیں ملتیں بلکہ وہ ضرورتاً تقابلی طریقے سے کام لیتے ہیں۔

"مقدمہ باغ و بہار" اور "دیوانِ اثر" میں تقابلی تنقید کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ "باغ و بہار" میں انہوں نے میرامن کے "قصہ چہار درویش" اور تحسین کے "نوطرز مرصع" کے اسالیب، قصے کی اُٹھان اور واقعات کی ترتیب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے دونوں تصانیف کی مشترکہ خصوصیات اور ساتھ ہی ان کی انفرادیت کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالحق کے بعض مضامین محض تقابلی تنقید کے مظہر ہوتے ہیں۔ اسکاٹ جیمس نے اس قسم کی تنقید کو بھی اَدب کے لیے مفید قرار دیا ہے۔

مولوی عبدالحق کے تنقیدی نظریات پر سائنٹفک تنقید کی بھی پرچھائیں پڑتی ہیں

یعنی وہ ادب کو سماجی حالات اور گرد و پیش کے مادی وسائل اور تمدّنی مظاہر کی پیداوار سمجھتے ہیں، جیسا کہ خود انھوں نے "انتخابِ کلامِ میر" میں لکھا ہے۔ لیکن تنقید کی اس روش سے وہ کبھی کبھی دور بھی جا پڑتے ہیں۔ ان کی بعض تنقیدیں تاثراتی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں وہ تجزیہ کرنے کے بجائے اپنی تحریروں میں محض اُن تاثرات کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو اُس خاص ادبی تخلیق نے اُن کے دل و دماغ پر ثبت کیے ہیں، اور یہ بات اُن کی تنقید کے تاثراتی رُجحان پر دلالت کرتی ہے۔ مثلاً "مقدمہ بر خطوطِ عطیہ بیگم" میں لکھتے ہیں:

"یہ سب رُقعے اُردو زبان کا زیور ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے الفاظ اور جملے مصری کی ڈلیاں اور آبِ حیات کے گھونٹ ہیں۔ یہ سچے موتی ہیں، جن کی آب، دلوں کو لبھاتی اور دماغوں کو تازہ کرتی ہے۔"

عبدالحق نے جو تنقیدی مضامین لکھے ہیں، وہ ان کی تحقیقی کاوشوں کے بھی ثمرات ہوئے ہیں۔ تحقیق اُن کے ادبی مزاج کا سب سے اہم عنصر ہے جو جگہ جگہ نمایاں ہوتا رہتا ہے یہ کہیں تنقید کے پردے میں اور کہیں تحقیق کے روپ میں نظر آتا ہے۔ ادب میں اکثر تحقیق اور تنقید دوش بدوش چلتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کا یہ خیال زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا کہ "یہ دونوں دماغِ انسانی کی دو مختلف تحریکیں ہیں"۔ تحقیق اور تنقید کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ کر دینا بعض وقت مشکل ہو جاتا ہے۔ عبدالحق کے مضامین تحقیق اور تنقید کا خوشگوار امتزاج ہوتے ہیں۔ عبدالحق محقق ہیں اس لیے جب تک وہ کسی ادبی اکتساب کے تمام پہلوؤں کو تحقیق کی روشنی میں جانچ نہیں لیتے، اُس وقت تک فنّی خصوصیات اور اُصولی نظریات کو اُس پر منطبق کر کے عملی تنقید کی طرف قدم نہیں بڑھاتے۔

عبدالحق، حالی کے تنقیدی مسلک سے کافی قریب دکھائی دیتے ہیں۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں حالی نے شعر کے لیے سادگی، اصلیت اور جوش کو ضروری قرار دیا تھا۔ عبدالحق نے بھی اپنی تحریروں میں عملی تنقید کے دوران میں اِن اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے اور وہ ان کی اہمیت اور افادیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ "سادہ" اور "نیچرل" شعر کی اُنھوں نے وہی تعریف کی ہے جو حالی نے "مقدمہ" میں بیان کی تھی۔ واقعیت، تخیل، بلاغت اور

فصاحت کو بھی عبدالحق نے کم و بیش اُسی انداز میں پیش کیا ہے، لیکن انہیں اس کا بھی پورا پورا احساس ہے کہ اب حالات کی رفتار کے اعتبار سے ادب کے مسائل اور محرکات بدل چکے ہیں اس لیے حالی کے بنائے ہوئے اُصول، تنقید میں حرفِ آخر نہیں۔ حالی نے جن تنقیدی اصولوں کو اہمیت دی تھی، اُنھیں ذہن میں رکھتے ہوئے تنقید کے نئے معیاروں سے بھی کام لینا ہوگا چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"تنقید کی ابتداء مولوی حالی نے کی اور اب اس فن پر مختلف لکھنے والے پیدا ہوگئے ہیں۔ حال کے انقلابات اور تغیرات سے ہمارا ادب بھی دوچار ہوا ہے اور اس میں طرح طرح کی جدتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان کے جانچنے کے لیے پرانے اصول کام نہیں آسکتے۔ ان نئی چیزوں کے پرکھنے کے لیے، ہمیں نئے اُصولوں سے کام لینا پڑے گا"

احساس کی شدت، تنقیدی شعور کی پختگی اور ادبی ذوق کے رچاؤ نے عبدالحق کی تنقیدوں کو قابلِ قدر بنا دیا ہے۔

---

"ناقد کی حیثیت سے عبدالحق صاحب نے انفرادی نظر، غیر جانب داری اور جُراتِ اظہار کا ہمیشہ ثبوت دیا ہے۔ ... اُن کی تنقید میں اقدار کی چھان پھٹک تو نہیں ملتی لیکن مُسلّمہ قدروں کے برتاؤ میں مولوی صاحب بڑی ذہانت اور متانت کو راہ دیتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے اور مُشکل کام ہے۔ میرے خیال میں حالی کے ساتھ ساتھ عبدالحق نے بھی اُردو تنقید کی فضا، سمت اور مزاج و میلان بدلنے میں بڑی مدد کی ہے۔"

_____ ڈاکٹر اختر اورینوی

"مستقبل کا مورخ جب بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اردو کے لسانیاتی، تحقیقی اور تنقیدی سرمائے کا جائزہ لے گا تو اسے (مولوی عبدالحق) کے مہتمم بالشان کارناموں کی صحیح عظمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ تاریخِ زبان کے بارے میں آپ کے اکتشافات، قواعدِ زبان کی تدوین اور لغتِ اردو کی تالیف، مطالعۂ لسانیات کی راہ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں اور......... ان میں سے ہر ایک کام اپنی وسعت، وزن اور اہمیت کے اعتبار سے محققین کی ایک منظم جماعت کی مسلسل کاوش اور عرق ریزی کا طالب تھا جسے آپ نے اپنی ان تھک کوششوں سے تکمیل تک پہنچا کر حیرت انگیز وسعتِ نظر، قوّتِ عمل اور عزم و استقلال کا زندۂ جاوید نمونہ پیش کیا ہے۔ قدیم ادب کے شاہکاروں، شعراء کے دواوین و انتخابات اور بیش قیمت مسوّدوں اور تذکروں کو آپ نے جس دقّتِ نظر اور حسنِ ذوق کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی بدولت اردو کو ترتیب و تدوینِ کتب کا ایسا بلند معیار مل گیا ہے جس سے وہ پہلے آشنا نہ تھی۔ اس طرح آپ نے بے شمار نوادر کو دستبردِ روزگار سے محفوظ کر کے مستقبل کے لئے تحقیق کی نئی راہیں کھول دی ہیں ـــ"

ـــــــــــ پروفیسر حمیدہ احمد خاں

# خُطبات

"مولوی عبدالحق کے خطبات کا لبِ لباب یہ ہے کہ قومی زبان زندگی اور تہذیب کا ایک لازمی جزو ہے۔ وہ زبان کی تاریخ اور زبان کی قومی و ثقافتی اہمیت پر بار بار زور دیتے ہیں اور ہر مرتبہ اپنا "کیس" باندازِ تازہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کا ہر خطبہ کسی اعلیٰ عدالت میں کسی فصیح و خوش بیان وکیل کا تیار کیا ہوا عرضی دعویٰ یا جواب دعویٰ معلوم ہوتا ہے ––"

—— ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

# خُطباتِ عبدُالحق کی خصُوصیّات

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کے خُطبات اور تقاریر کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک عظیم شخصیت بے نقاب نظر آتی ہے۔ ایک ایسی عظیم شخصیت جس نے ماضی کو سمجھا ہے، حال کو دیکھا ہے اور مُستقبل پر غور کیا ہے۔ جس میں تہذیبی اور ثقافتی مسائل کا ایسا گہرا شعور ہے جو موجودہ دَور میں کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتا۔ جس میں ادب و شعر کا ایسا رچا ہوا مذاق ہے جس کی مثال کہیں اور مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ جس نے زبان اور کلچر کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح غور کیا ہے جس کا پتہ کہیں اور نہیں چلتا۔ جس میں علم و ادب کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کی ایسی لگن ہے جو کسی دوسرے کے یہاں دکھائی نہیں دیتی جس نے ادبی تحقیق و تنقید کا وُہ اعلیٰ معیار پیش کیا ہے جو کوئی اور پیش نہ کر سکا اور اس شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رفعت اور بلندی ہے: ایک مضبوطی اور استواری ہے۔ ایک وسعت اور کشادہ دلی ہے۔، ایک عقلیت اور روشن دماغی ہے، ایک گہرائی اور گیرائی ہے، ایک حلم اور برُدباری ہے۔ ایک لیے دیئے رہنے والا انداز ہے۔ اس شخصیت کی یہ بنیادی خصوصیات ان خطبات اور تقاریر میں بھی بے نقاب ہیں، اور اس اعتبار سے ان کی اہمیّت مسلّم ہے۔

یہ خطبات زیادہ تر زبان اور لسان کے موضوعات سے متعلق ہیں۔ ان میں اُردو زبان کی تاریخ، اس کی ابتدا کے متعلق نظریات، اس کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت، اس کے ماضی، حال اور مستقبل کی کیفیت، برّعظیم کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس کی برتری اور عظمت ——— یہ اور اُردو زبان سے متعلّق اسی طرح کے اور اَن گنت مسائل پر ان میں مفصّل اور سیرِ حاصل بحث کی گئی ہے ——— ان موضوعات پر بحث کرتے

ہوئے بابائے اُردو کا زاویۂ نظر تحقیقی اور تنقیدی رہا ہے۔ اُردو زبان سے انہیں والہانہ وابستگی اور بے پایاں محبت ہے۔ وہ اسے دوسری زبانوں کے مقابلے میں بلند و برتر دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُردو زبان کے بارے میں ان خطبات اور تقاریر میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جس کی بنیادیں عقل و شعور پر استوار نہ ہوں برخلاف اس کے اس سلسلے میں جو خیال بھی اُنہوں نے پیش کیا ہے، جس نظریے کی وضاحت بھی کی ہے، اُن سب میں ایک منطقی انداز پایا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں پیش کی ہوئی ہر بات، ہر خیال اور ہر نظریے میں ایک وزن ہوتا ہے، پھر چوں کہ ان میں خلوص کی فراوانی ہوتی ہے، اس لیے ان کے پیش کیے ہوئے تمام خیالات و نظریات دِل میں اُتر جاتے ہیں۔ اِن کا اثر عالم گیر ہوتا ہے۔ وُہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں زبان و لسان کے مَوضوعات سے دل چسپی لینے کی ایک فضا عام ہو جاتی ہے۔

اِن خطبات اور تقاریر کی یہ سب سے نمایاں خصوصیت ہے کہ ان کے ذریعے اپنی زبان سے دِل چسپی لینے کی فضا قائم ہوئی ہے۔ ہماری قوم میں اپنی زبان سے دِلچسپی لینے، اس کو ترقی دینے اور پروان چڑھانے کا کوئی شعور نہیں تھا اور اب بھی اس بات کا جیسا شعور ہونا چاہیئے نہیں ہے۔ لیکن جو بھی تھوڑا بہت شعور ہماری قوم کے اَفراد میں اپنی زبان کے "مِنت پذیرِ شانہ، گیسوؤں" کے سنوارنے کا آج نظر آتا ہے، وُہ سب بابائے اُردو کی ذات اور ان کے خطبات و تقاریر کا نتیجہ ہے۔ سر سیّد ہمارے پہلے رہنما تھے جنھوں نے زبان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، مُلکی اور ملّی اہمیت کو محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد اُن کے بعض رُفقا نے اس کی طرف توجّہ کی۔ لیکن اُن کے سامنے کام کرنے کے لیے دوسرے میدان بھی تھے، اس لیے وُہ اس کام کی طرف پوری توجّہ نہ کر سکے۔ اَلبتّہ آگے چل کر مَولوی عبدالحق صاحب نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کام کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ اس کے ہر پہلو پر غور کیا۔ ہر مسئلے کو سلجھایا۔ اس کو ترقی دینے کے منصوبے بنائے۔ اس کی صحیح اہمیت کو متعیّن کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا۔ چنانچہ اِس کی اہمیت اور ضرورت کا صحیح احساس قوم کے افراد میں بڑی حد تک عام ہوا، اور اس طرح زبان کے مسائل سے دل چسپی لینے کی ایک فضا قائم ہوئی۔ اِس فضا نے قومی زندگی اور اس کے مدّ و جذر پر گہرا اثر ڈالا۔

زبان کے بارے میں ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ وُہ کسی قوم کی تہذیبی و ثقافتی زندگی

ہیں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اثر رہن سہن اور آدابِ معاشرت پر گہرا اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔ زندگی کے بہت سے مسائل اِس کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اِس حقیقت کو پوری طرح محسوس کیا۔ وُہ اِس حقیقت کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے خطبات اور تقاریر میں زبان کے مسائل زندگی سے علاحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وُہ انہیں زندگی کے تاریخی اور معاشرتی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ اس لیے زبان کے مسائل کی نوعیت اُن کے یہاں تہذیبی و ثقافتی اور قومی و ملّی ہو جاتی ہے یہ زاویۂ نظر اُن کے میدان کو بہت وسیع کر دیتا ہے۔ اِس میں عظمت اور بلندی، رفعت اور برتری کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ کام قومی کام کا ایک جُز بن جاتا ہے۔ اور اس کی اہمیّت سیاسی نوعیت کے کاموں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے خُطبات و تقاریر سے اِس کام کو انجام دے کر قوم کو ایک بلندی سے ہم کنار کیا ہے۔ اس میں ٹھوس کام کرنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئی ہیں۔ کیوں کہ زندگی کی ثقافتی و تہذیبی اہمیت کے اَسرار و رموز کو اس نے سمجھ لیا ہے، اور وُہ زندگی کے ہر پہلو کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھنے لگی ہے۔ بہ صورت مولوی عبدالحق صاحب اور ان کے کام سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اُردو زبان کو اپنے سفرِ ارتقا میں بڑی کٹھن اور دشوار گزار منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ زبان بدلتے ہوئے حالات کے ہاتھوں پیدا ہوئی۔ ایک زمانے تک اُسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اِس لیے اس کی طرف کسی نے بھی خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ اُن دنوں فارسی زبان کا دَور دورہ تھا، اور فارسی کے مقابلے میں اِس نئی زبان کو بھلا کوئی کِس طرح خاطر میں لاتا۔ لیکن زبان ایک ایسا جادُو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ اُردو زبان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی، لیکن چوں کہ وہ عوام کی زبان تھی، اور تاریخی تقاضوں نے اس کو جنم دیا تھا، اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ وُہ دلوں میں گھر کرنے لگی اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب عوام و خواص دونوں اس کے دل دادہ ہو گئے۔ لیکن سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی انحطاط و زوال نے اسے تیزی سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ محض شعر و شاعری کی زبان ٹھہری، اور شعر و شاعری بھی ایسی جس کا مقصد دِل بہلانا اور وقت گزارنا تھا۔ انگریزوں کی توجہ سے اُسے کسی قدر فائدہ ضرور ہوا، لیکن انگریزوں کو

اس زبان سے زیادہ اپنی حکومت کی اُستواری عزیز تھی، بلکہ انہوں نے اِسی بنیادی خیال کے زیرِاثر اُردو کی ترقی وارتقار میں حصّہ لیا تھا۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج قائم کرکے اُردو کی بڑی خدمت انجام دی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو، ہندی کے جھگڑے کو بھی انگریزوں ہی نے کھڑا کیا، اور وہ برابر اِس کو ہوا دیتے رہے۔ سرسیدؔ اور اُن کے رُفقا نے اِس جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں اُنہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ جھگڑا ایک بڑی سازش کا نتیجہ تھا۔ موجودہ دَور میں اِس نے بڑی پیچیدہ صورت اختیار کرلی تھی۔ کیونکہ زبان کے مسئلے کو سیاست کا مسئلہ بنا دیا گیا تھا۔ اس سے اُردو کو بڑا نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر مولوی عبدالحق صاحب کی ذات اِس مسئلے کی اہمیّت کو محسوس نہ کرتی اور ان سیاسی بازی گروں کا پول نہ کھولتی جو ہندی اور ہندوستانی کی تحریک چلاکر اُردو کو کند چھری سے ذبح کردینا چاہتے تھے تو خُدا جانے آج اس زبان کا کیا حشر ہوتا۔

مولوی صاحب نے اس موضوع کی طرف خاص طور پر توجہ کی۔ اُنہوں نے اس ساری سازش کا پول کھول دیا جو اُردو کے خلاف کی جارہی تھی۔ اُنہوں نے صرف اِس خیال سے ہندی کے مُقابلے میں اُردو کی حمایت نہیں کی کہ وہ ان کی زبان تھی، بلکہ اِس وجہ سے اس کا ساتھ دیا کہ وہ ہندوستان کے اُس کلچر کا سرمایہ تھا، جو ہندو مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے پیدا ہوا تھا۔ مولوی صاحب اپنی تحریر و تقریر سے اِس بُنیادی خیال کو پھیلانے اور رجعت پسندوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن ان پر اثر نہیں ہوا۔ البتہ اِس صورتِ حال نے ایک خاصے بڑے طبقے میں زبان کی حفاظت کا شعور پیدا کیا، اور آج جو ہم ہندی کے مُقابلے میں اُردو سے اتنی دل چسپی دیکھتے ہیں، یہ سب مولوی صاحب قبلہ ہی کی اُن تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ خطبات اور تقاریر میں جگہ جگہ اس موضوع پر مباحث کا سلسلہ ملتا ہے۔ لیکن اِس بحث میں خلوص اور صداقت کے عناصر سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ عصبیت نام کو نظر نہیں آتی۔ جذباتیت کا مُطلق احساس نہیں ہوتا۔ پے درپے رہنے والا انداز کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جاتا۔ مَنطقی استدلال کی خصوصیت کسی جگہ بھی نظر انداز نہیں ہوتی۔ خطبات اِس اعتبار سے بہت اہمیّت

رکھتے ہیں۔ اُردو زبان کی تاریخ میں اس کو سنوارنے کا جو شعور کام کرتا ہوا کہیں کہیں نظر آتا ہے، وُہ شعور موجودہ دَور میں اِن خطبات و تقاریر نے پیدا کیا ہے، اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اس زبان سے دلچسپی کی ایک فضا بڑی حد تک عام ہوئی ہے۔ اس کے بولنے والے چاہے عملی طور پر اس کے لیے کچھ نہ کریں لیکن کم از کم یہ چاہتے ضرور ہیں کہ یہ زبان زیادہ سے زیادہ ترقی کرے۔

خطبات میں اُردو زبان کو ترقی کے راستوں پر گام زن کرنے کا ایک مکمّل اور واضح لائحۂ عمل بھی موجود ہے۔ اس کا ذکر جگہ جگہ ان خطبات میں آتا ہے۔ مولوی صاحب بار بار اس طرف توجّہ دلاتے ہیں کہ زبان بغیر ایک شعوری کوشش کے خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتی۔ عملی اور علمی دونوں طرح کے کام زبان کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں۔ ادبی سرمائے میں اضافہ بھی اس کی رفتارِ ارتقا کو تیز سے تیز تر کر دیتا ہے۔ تحقیق و تفتیش بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ مولوی صاحب نے ان تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اب یہ باتیں اُردو والوں کے لیے نئی نہیں ہیں۔ ان کے سامنے اپنی زبان کو ترقی دینے کے لائحۂ عمل کا ایک مکمّل نقشہ موجود ہے۔ مولوی صاحب کے خُطبات اور تقاریر نے اس سلسلے میں بھی بڑا کام کیا ہے۔

یہ خطبات اگرچہ عام جلسوں میں دیئے گئے ہیں اور یہ تقریریں عوام کے سامنے کی گئی ہیں لیکن ان میں ایک عالمانہ انداز ہر جگہ موجود ہے۔ تحقیق اور چھان بین کا رُجحان ان میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ مختلف علوم کے اثرات اِن میں جگہ جگہ کار فرما نظر آتے ہیں۔ وسیع مُطالعے نے اِن میں پیش کیے ہوئے خیالات میں ایک ہمہ گیری اور وسعت پیدا کر دی ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل کے گہرے شعور نے ان کو گہرائی اور گیرائی سے آشنا کر دیا ہے۔ حالات کی صحیح نبّاضی نے ان میں تجزیاتی انداز کی تمام خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔ ان کے مُطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے لسانیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانی حقائق کو وُہ بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین ہوتی ہے کہ ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ پر اُن کی نظر بڑی گہری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تہذیبی و ثقافتی مسائل کا تجزیہ بڑی گہرائی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ ادب اور تنقید کے مسائل کو وُہ بڑے عالمانہ زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ادبی اور تنقیدی مسائل کے بیان

میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ گویا مجموعی اعتبار سے ان میں عالمانہ شان ہر جگہ نمایاں ہے۔ لیکن اِس عالمانہ شان کے باوجود وُہ خصوصیت بھی ہے جو ان کو عوام سے قریب کرتی ہے۔ جس کے باعث عام افراد کے لیے بھی وُہ دلچسپی اور افادے کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ خصوصیت نظریاتی صفائی سے پیدا ہونے والی آسان پسندی کے ہاتھوں ظہور میں آتی ہے۔ اِسی خصوصیت نے ان خطبات اور تقاریر میں بڑی عالمانہ باتوں کو عام فہم بنا دیا ہے۔

اسلوب اور اندازِ نگارش کے اعتبار سے بھی یہ خطبات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُردو نثر کے اسالیب میں بھی ان کا ایک مخصوص مرتبہ ہے۔ سادگی اِن کا نُمایاں ترین وصف ہے لیکن اُن کی اِس سادگی میں بھی ایک پُرکاری ہے۔ الفاظ کا دُرو بست اور محاوروں کا استعمال اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں ممد و مُعاون ثابت ہوتا ہے۔ ان میں عبارت آرائی نہیں ہے۔ لیکن ایک تسلسل اور روانی ہے، جو اُن کے افکار و خیالات کے تسلسل اور روانی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ان میں ایک بے ساختگی اور برجستگی ہے جو نظریات کے بے باکی کی پیدا کردہ ہے۔ ان میں مشکل پسندی نام کو نہیں۔ برخلاف اس کے سلاست ہے، جو معنوی آسان پسندی کے ہاتھوں وجود میں آئی ہے۔ اس میں زور ہے جس کو خیال کی قطعیت نے پیدا کیا ہے۔ اس میں جوش ہے۔ جو جذبے کی فراوانی اور احساس کی شدت کا بنیادی نتیجہ ہے۔ اس میں ولولہ انگیزی ہے جو نظریاتی خلوص اور صداقت کے نتیجے میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے —— اور ان تمام باتوں نے مل کر اس اسلوب اور اندازِ نگارش کے ہیولے کو تیار کیا ہے، جو اپنے اچھوتے پن کے باعث ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں دل موہ لینے والی کیفیت ہے، جس کا اثر وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ جس میں تاثر کا جادُو ہے۔ —— مولوی صاحب کے ہر خُطبے اور ہر تقریر میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں، اور ان خصوصیات نے انہیں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

یہ خطبات معنوی و صوری دونوں اعتبار سے اَن گنت خصوصیات کے حامل ہیں، اور ان میں اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی کش مکش کے آئینہ دار ہیں۔ ہماری تہذیب و معاشرت کا قافلہ جن راہوں سے گذرا، اُس نے جو منزلیں بھی طے کی ہیں، اُن کا بیان کسی نہ کسی طرح اِن خُطبات میں ضرور ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی قومی زندگی کے ارتقا اور تہذیبی اور ثقافتی مد و جزر کو سمجھنے کے لیے اِن کا مطالعہ ناگزیر ہے ——

پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتحپوری

# خطباتِ عبدالحق کی اہمیت

یوں تو اُردو میں ہمارے کئی بزرگوں کے خطبات شائع ہو چکے ہیں اور ان میں سے بعض اکابر ادب مثلاً سید سلیمان ندوی اور علامہ اقبال کے خطبات چند وجوہ سے بڑے اہم و وقیع شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان میں قومی، ملکی و ملی مسائل پر غیر معمولی بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس لحاظ سے وہ گذشتہ سو سال کی اسلامی تحریکات، مسلمانوں کے ذہنی رجحانات، اُن کے سیاسی افکار کے آئینہ دار ہیں اور ہماری قومی تاریخ کے ثقافتی اور تہذیبی ورثے میں ان کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ ان بزرگوں کے خطبات سے صرف برِصغیر ہی نہیں بلکہ تمام دُنیا کے مسلمانوں کی ذہنی تاریخ کی تدوین و تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ ان میں سے بعض خطبات اور ان کے بعض اجزا زبان و بیان کی دلکشی کے اعتبار سے ادبی محاسن کے بھی حامل ہیں۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی ان میں وہ ادبی شان نہیں ہے جو ہمیں مولوی عبدالحق کے خطبات میں ملتی ہے۔ ان کے خطبات میں صرف ہیئت و لہجے نے ادبی آثار پیدا نہیں کیے بلکہ ان کے موضوعات کا بھی ہمارے ادب سے گہرا تعلق ہے، اور ادبی نقطۂ نظر سے مولوی صاحب کے خطبات کی یہی ایک خصوصیت انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

یوں تو مولوی صاحب کے یہاں بھی دوسروں کے خطبات کی طرح برِصغیر کے تمام سیاسی رجحانات، ذہنی محرکات، معاشی مشکلات اور قومی انقلابات کا ذکر آیا ہے۔ لیکن عام طور پر ان کے موضوعات پر ادبیات و لسانیات کا اثر غالب ہے۔ پھر چونکہ مولوی صاحب کے سادہ نگار قلم نے ان میں ایک مخصوص قسم کی "سادگی و پرکاری" اور "بیخودی و ہشیاری" کی کیفیت پیدا کر دی ہے اس لیے ان کی اہمیت اُردو ادب کی تاریخ میں غیر معمولی ہو

گئی ہے۔ مولانا شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "خطبات کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔ اسپیکر حاضرین کے مذاق و معتقدات اور میلاناتِ طبع کی جستجو کرتا ہے تاکہ ان کے لحاظ سے تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جو اُن کے جذبات کو برانگیختہ کر سکے اور اپنے کام میں لائے۔" مولوی صاحب کے خطبات میں خطابت کا یہ بنیادی عنصر پوری طرح موجود ہے۔ اُن کے خطبے اپنے سُننے والوں پر جادو کا اثر ڈالتے ہیں لیکن ان کا دائرہ عمل صرف خطابت کی تنگ فضا تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان میں حاضرین کے حلقے سے باہر نکل کر دور تک ایک خاص فضا پیدا کرنے کی قوت ہے۔ یوں تو خطابت عام طور پر صحافت سے قریب تر ہوتی ہے، اور اس میں وقتی تاثر چھوڑ جانے کے سوا مستقل اثر پذیری کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے، لیکن مولوی صاحب کے خطبات اس عیب سے پاک ہیں۔ اُن کے خطبات میں زود اثری کے ساتھ ساتھ ادب کے وہ دیرپا نقوش بھی پوری طرح اُبھرے ہوئے ہیں جو کسی تحریک کو ادب کا اہم جزو بنا دینے میں مدد دیتے ہیں، اور جس کی مثالیں اُردو میں بہت کم ملتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد، سرسید احمد خاں اور مولانا حالی کی بعض تقریروں اور خطبوں میں ادبی رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان میں وہ توانائی و دلکشی نہیں ہے جو مولوی عبدالحق کے خطبات کا طرۂ امتیاز ہے۔

خطباتِ عبدالحق ادبی نقطۂ نظر سے اُردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں اور ان کا خطباتی ادب میں وہی مقام ہے جو فنِ خطوط نگاری کی تاریخ میں غالب کے خطوط کا ــــ خطوط نگاری کا تعلق انسان کی نجی اور خانگی ضرورتوں سے ہے اور اس لیے ان کا ادب سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن غالب کی خلاق طبیعت نے اس میں کچھ ایسی فنکاری کا اظہار کیا کہ اُن کے خطوط ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم جزو بن گئے۔ یہی حال مولوی عبدالحق کے خطبات کا ہے۔ اگر ایک ادبی خطوط نگاری کا موجد ہے تو دوسرا ادبی خطبات نگاری کا بانی ہے۔ مولوی عبدالحق کے خطبات میں کم و بیش وہی ادبی محاسن موجود ہیں جن کے لیے خطوطِ غالب کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔

مولوی صاحب کے خطبات پر غالب کے اثر کو دیکھ کر حیرت نہ کرنی چاہیے۔ سرسید احمد خاں اور حالی دونوں غالب سے بہت متاثر تھے۔ ان دونوں کی تحریریں

غالب کی سادہ نثر کے آثار نمایاں ہیں۔ مولوی عبدالحق چونکہ حالی و سر سید کی صحبتوں کے فیض یافتہ ہیں اس لیے اُن پر غالب کا بلا واسطہ اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ مولوی عبدالحق کے خطبات میں سادگی، فصاحت اور دلنشینی کے وہ آثار تو پائے جاتے ہیں جو حالی اور سر سید کی نثر کی خصوصیات ہیں، لیکن اُن کے یہاں وہ سپاٹ پن روکھی پھیکی سنجیدگی اور غیر مانوس عربی و انگریزی الفاظ کی ثقالت نہیں ہے جو حالی اور سر سید دونوں کے یہاں کہیں بعض جگہ کھٹکتی ہے۔ مولوی صاحب کی نثر ان کمزوریوں سے پاک ہے جس سادہ اور دلکش نثر نگاری کا آغاز میر امن نے کیا تھا، جس کو غالب نے شوخ و بے تکلف بنایا تھا اور جسے حالی و سر سید نے وسعت و جامعیت عطا کی تھی۔، مولوی عبدالحق نے اپنے خطبات کے توسط سے اس میں تکمیل کی شان پیدا کی ہے۔

غرض کہ مختلف وجوہ سے مولوی صاحب کے خطبات ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ خطبات برصغیر میں رونما ہونے والے سیاسی و ادبی حالات کی مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں جن واقعات و حالات اور جن قومی و ملّی رجحانات و تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ و چشیدہ ہیں۔ ان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں صرف مطالعہ کو نہیں بلکہ مشاہدہ و تجربہ کو براہِ راست دخل ہے اور اسی لیے ان میں واقعیت و صداقت کی ایسی روح موجود ہے جو تاریخ نگار کے یہاں بھی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ ان خطبات میں دس بیس سال کا نہیں تقریباً پوری ایک صدی کی اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر آیا ہے۔ اِن میں قیامِ پاکستان کی اس ذہنی تحریک کا مکمل خاکہ بھی موجود ہے، جو ۱۹۰۶ء (قیام مسلم لیگ) سے بہت پہلے سر سید کی اصلاحی تحریک کے عین آغاز سے وجود میں آچکی تھی۔

اِن خطبات میں سر سید احمد خاں کے قومی نظریے، اُن کے سیاسی مسلک اور اُن کے اصلاحی نقطۂ نظر کی وضاحت ہے، اِن میں ہندو مسلمانوں کی ذہنی ساخت، اُن کے طبعی رجحانات، قومی نظریے کی تحریک کے اسباب و محرکات، ان کے نتائج و اثرات کی تفصیل ہے۔ ان میں اردو ہندی کے تنازعے اور اس تنازع کے اسباب و علل کی مکمل تصویر ہے۔ ان میں اُردو ہندی دونوں زبانوں کے آغاز، ارتقا، ان کے باہمی تعلقات اور عروج و زوال کی تاریخ

کا خلاصہ ہے۔

ظاہر ہے ان صورتوں میں مولوی عبدالحق کے خطبات کا مطالعہ نہ صرف ادب کے طالب علم کے لیے بلکہ تاریخ وسیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ ان خطبات میں پاک وہند کی وہ صد سالہ تاریخ محفوظ ہے جس کا خاکہ علامہ اقبال اور ان سے پہلے سرسیّد احمد خاں اور ان کے رُفقاءِ کار کے ذہنوں میں تیار ہو چکا تھا۔ اس ذہنی خاکے پر نظر ڈالے بغیر پاکستان کے موجودہ نقشے کو سمجھنا مشکل ہے۔ پاکستان دراصل سرسیّد احمد خاں اور اُن کے علی گڑھ کے خواب کی تعبیر ہے۔ یہ خواب کب اور کیونکر دیکھا گیا، اس کی تعبیر میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں؛ ان کی تفصیل آپ کو مولوی عبدالحق کے خطبات میں ملے گی، اور یہی چیزیں دراصل ان کے خطبات کی تاریخی قدر وقیمت متعین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ان خطبات کی سوانحی اہمیت بھی مُسلّم ہے۔ اگر کسی وقت مولوی صاحب کی زندگی ان کی شخصیت، ان کے کردار، ان کے علمی وادبی کارناموں کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی تو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مدد ان کے خطبات سے ملے گی۔ ان میں سے بعض خطبے اور خطبات کے بعض اجزا تو مولوی صاحب کی خودنوشت سوانح حیات کا کام دیں گے چونکہ یہ خطبات مختلف موقعوں، مختلف محفلوں، مختلف انجمنوں، مختلف مقامات اور مختلف حالات وضروریات کے لیے لکھے گئے ہیں، اس لیے ان میں ایک طرح کی ہمہ گیری ہے۔ اور مولوی صاحب کی زندگی وشخصیت کے مختلف پہلو ان میں صاف جھلک گئے ہیں۔ یہ مولوی صاحب کے مقصدِ حیات ان کے حوصلہ، ان کے عزم، اُن کی ہمّت اور ان کی قوّتِ مقاومت کا اندازہ لگانا ہو تو اُن کے مُقدّمات، اُن کی قواعد اُن کی ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے خطبات کے مُطالعہ کی ضرورت ہے۔ خطبات کو نظر انداز کر کے مولوی صاحب کی شخصیت کی رنگا رنگی، اُن کی زندگی کی ہماہمی اُن کی ہمہ گیر واقفیت، اُن کی معاملہ فہمی اُن کی خطابت ان کے تبحّرِ علمی اُن کے اندازِ بیان اُن کی جدّتِ طبع اور لطیف وشوخ طبیعت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان کے خطبوں میں اپنے مخاطب سامعین کی طبیعتوں اور اُن کی دلچسپیوں کا پورا پورا لحاظ پایا جاتا ہے۔ وہ موقع محل، حاضرین اور اُن کے حالات کو اچھی طرح ذہن میں رکھ کر خطاب کرتے ہیں

اسی لیے ان کا تیر ہمیشہ نشانے پر جا کر بیٹھتا ہے۔ مولوی صاحب کے اطوار و عادات و معمولات کا صحیح اندازہ بھی صرف خطبوں سے ہوتا ہے۔ وہ کام کرنے کے عادی ہیں اور اپنے مخاطب کو ہمیشہ وہ کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مولوی صاحب کے کردار و شخصیت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جامد اور اکھڑ نہیں لچکدار و سیّال ہے۔ وہ بوڑھوں میں بوڑھے۔ جوانوں میں جوان، طلبا میں طالب علم، مزدوروں میں مزدور حتیٰ کہ عورتوں میں عورت بڑی خوبی سے بن جاتے ہیں، اور پھر اس ہم زبانی و ہم رنگی کی مدد سے وہ ہر کس دناکس، چھوٹے بڑے، بوڑھے جوان اور عورت مرد سب کو اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں اُن کی شخصیت کے اِسی پہلو نے انھیں ہر جگہ کامیاب بنایا ہے۔ صوفیائے کرام کی طرح وہ بھی اُردو کی اشاعت اور اپنے قومی نظریئے کی تبلیغ کے لیے جس علاقے میں داخل ہوئے ہیں، انھوں نے اپنی زبان اور اپنے خیالات کو اُن پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہاں کی لوگوں میں گھُل مل کر ایک ایسی خوشگوار فضا پیدا کی ہے کہ لوگ اُردو سے دلچسپی لینے اور اُن کے خیال کی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اُن کے تمام خطبات میں مخاطبے کا یہی انداز ہے۔ اور اسی کی بدولت انھیں اپنے مقاصد کے حصول میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ مولوی صاحب کے کردار کی بعض دوسری خصوصیات مثلاً ان کے عزم و استقلال اور ان کی غیر معمولی قوّتِ ارادی کا اندازہ بھی صرف خطبات سے ہوتا ہے۔ وہ دشواریوں اور مخالفتوں سے گھبراتے نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مخالفت و دشواری کے سامنے آنے سے اُن کے قوائے مضمحل میں ایک نئی توانائی و تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کے کام کرنے کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ مقاصد کے حصول میں دوسروں کی مخالفت ہماری کیا مدد کرتی ہے؛ اس کا اندازہ کرنا ہو تو ان کا وہ خطبہ دیکھیے جو انھوں نے اردو کانفرنس کراچی منعقدہ ۱۹۵۱ء میں پڑھا تھا۔ اس میں مولوی صاحب مخالفت کے متعلق لکھتے ہیں:

"کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور حامیوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو اُبھارتی ہے۔ انسان کے اُن جوہروں کو جلا دیتی ہے، جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت

در پردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص واستقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی۔ اور تحریک سولہ سولہ آنے کامیاب ہو گی۔ مخالفت نے پاکستان بنایا۔ ورنہ کیا اتنی جلد بن جاتا، اور مخالفت ہی کے طفیل اُردو کو ترقی نصیب ہوئی ہے۔"

اِس بیان سے اُن کی حوصلہ مند طبیعت کا اندازہ کیجئے، بظاہر اُن کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ اور عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہا لیکن اُن کے خطبات دیکھئے تو اُن میں وہ حوصلہ مندی نظر آتی ہے جو نوجوانوں میں بھی مفقود ہے۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی زندگی میں حرارت، توانائی اور تازگی برقرار رکھنے کے لیے اپنے آپ کو ہمیشہ کسی نہ کسی اعلےٰ مقصد سے وابستہ رکھا ہے اِس سلسلے میں اُن تازہ خطبوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے جو پچھلے دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کے پہلے اجلاس، اُردو کانفرنس لاہور اور اسلامیہ کالج لاہور کے طلبا کے جلسے میں پڑھے گئے تھے۔ گلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا:

"صرف انجمنیں بنا دینا، قرار دادیں منظور کر دینا یا حکومت سے امداد حاصل کر لینا کافی نہ ہوگا، ہمیں کام کرنا ہوگا۔ کام سے مُراد یہ نہیں جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ نو بجے آئے اور چار بجے چلتے بنے یہ کام جو ہمیں کرنا ہے پوری قوت اور استقلال سے کرنا ہوگا۔ دن، رات، گرمی سردی، بارش سے بے نیاز ہو کر۔ کام سے عشق ہونا چاہیئے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں بیگار ہے۔ جو لوگ کسی بڑے مقصد کو لے کر خلوص وصداقت سے والہانہ کام کرتے ہیں اور اپنی جان تک کھپا دینے کی پروا نہیں کرتے وُہ کبھی نہیں مرتے۔ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، اور جو اپنی جان عزیز رکھ کر محنت سے جی چُراتے ہیں مردے ہیں۔"

اِسی طرح بزمِ فروغِ اُردو اسلامیہ کالج لاہور جسکے روحِ رواں پروفیسر سجّاد باقر رضوی ہیں،[۱] کے سامنے مولوی صاحب نے بڑی ولولہ خیز تقریر فرمائی تھی۔ اُنھوں نے اپنے خطبے میں طلبا سے کہا:

"میں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ جوان رہیں۔ میری طرح

---

[۱] موجودہ مصروفیت: اُستاد شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

بوڑھے نہ ہوں۔ اِس دُعا کو کوئی معمولی یا ناممکن بات نہ سمجھیں۔ ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے۔ بے شک جوانی لوٹ کر نہیں آتی، لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی قائم رکھنے کے لیے کوئی بلند مقصد ہونا چاہیئے۔ مقصد سے زندگی بنتی ہے، بڑھتی ہے اور قائم بھی رہتی ہے ..... جوانی کوئی چوڑے چکلے سینے، کسے ہوئے ڈنڈا اور بھاری ڈھیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڑھاپا سفید بالوں اور کُبڑی کمر سے نہیں آتا۔ جوانی ہمت و عزم سے ہوتی ہے۔ جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہے میں اپنی جوانی پھر واپس لاؤں گا اور اُس وقت تک نہ مروں گا جب تک اُردو یونیورسٹی نہ قائم کر لوں گا۔"

غرض کہ مولوی صاحب کی زندگی کے اصل ترجمان اُن کے خطبے ہیں، اور مولوی صاحب اور اُن کے کاموں کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اُن کے خطبات کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

خالص ادبی اور لسانی نقطۂ نظر سے یہ خطبات مولوی صاحب کے مقدّمات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اُن کے خطابیہ لب و لہجہ میں جو حلاوت، اثر اور دل کشی ہے وہ ان کی دوسری تحریروں میں مُشکل سے ملے گی۔ مولوی صاحب کو ایک صاحبِ طرز نثر نگار بنانے میں اُن کے مقدّمات، قواعد اور لُغت کو کم خطباتِ کو زیادہ دخل ہے۔ ان خطبوں میں ایسی سادگی، سلاست صفائی، روانی، صداقت اور اثر انگیزی پائی جاتی ہے جو کسی دوسرے کے خُطبوں میں نظر نہیں آتی۔ زبان و بیان کی خوبیوں سے قطعِ نظر اُن کے موضوعات کی اَدبی اہمیت بھی مُسلّم ہے۔ ان میں تحقیق، تنقید اور اسلوب کے اہم مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ زبان کی ساخت و پیدائش، سوسائٹی اور زبان کے تعلق، زبان و معاشرے کی ہم آہنگی، قومی عروج و زوال کی تاریخ میں زبان کی حیثیت، زبان اور ہماری تہذیبی و ثقافتی سرمایہ، زبان اور قومی کردار اور اسی قسم کے بڑے مفید اور اہم موضوعات پر مولوی صاحب نے قلم اُٹھایا ہے۔ زبان کے متعلق عموماً اور اُردو زبان کے متعلق خصوصاً اُن کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے۔ اُردو کی پیدائش اس کے ارتقا، اس کے ماخذ و مبداء اس کے اُصول و قواعد اس کے عروج و زوال کے اسباب۔ اس کے مزاج کی ساخت

اور خصوصیات سے کماحقہٗ واقفیت کے لیے خطبات عبدالحق کا مطالعہ ضروری ہے۔
بعض اہل قلم نے مذکورہ مسائل پر پوری پوری کتابیں لکھی ہیں، لیکن مولوی صاحب نے اپنے خطبات میں ان اہم مسائل پر جس اختصار و جامعیت کے ساتھ گفتگو کی ہے وہ مولوی صاحب کی قادرالکلامی، اُن کی وسیع النظری اور تبحر علمی پر دلالت کرتی ہے۔ چند سطور دیکھئے ان میں مولوی صاحب نے اُردو کی پیدائش اور اس کی معقولیت کے متعلق کیسے دل کش پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اُردو ایک مخلوط زبان ہے۔ یہ زبان کی ایک قسم ہے۔ دُنیا میں ایسی متعدد زبانیں ہیں۔ اس قسم کی زبان کے وجود میں آنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب کشورکشائی ہے۔ مسلمان بھی اس ملک میں آریاؤں کی طرح فاتح کی حیثیت سے آئے تھے۔ وہ فارسی بولتے تھے اور اہل ملک دیسی زبان۔ ان حالات میں جیساکہ دستور ہے معاشرتی، ملکی اور کاروباری ضرورت سے مسلمان بول چال میں دیسی لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور ہندو فارسی الفاظ۔ فاتحوں کی تعداد اہل ملک کے مقابلہ میں بہت کم تھی اور اس لیے وہ اہل ملک کی زبان سیکھنے پر مجبور تھے۔ دو چار نسلوں کے بعد ان کی اولاد ملکی زبان خوب بولنے لگی۔ لیکن فاتح قوم کی زبان کا اثر بھی ملکی زبان پر پڑتا رہا اور اس اختلاط نے ایک گم نام بولی کو جو عوام کی بلکہ دیہات کی بولی تھی، ایک شائستہ اور مستقل زبان کے رُتبے تک پہنچا دیا۔ جسے اُردو کہیئے یا ہندوستانی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں (جیساکہ گاندھی جی وغیرہ نے فرمایا ہے) کہ زبان مسلمان بادشاہوں نے بنائی اور حکومت کے زور سے پھیلی، وہ نہ صرف اس زبان کی تاریخ سے ناواقف ہیں بلکہ اصول لسانیات سے بھی ناآشنا ہیں۔ یہ زبان فطری اصول پر خود بخود بنی اور حالات و ضروریات نے اسے بڑھایا اور پھیلایا۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ اُن کی سرکاری اور درباری اور دفتری زبان آخر تک فارسی رہی"

اُردو کی پیدائش گاہ کی بحث اُردو ادب کی تاریخ میں اختلافی قضیہ بن گئی ہے۔ لیکن

مولوی صاحب اِسے اُردو کی مقبولیت کا سبب قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں :

"یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اُردو زبان نے وہیں جنم لیا۔ اہلِ پنجاب کو یہ دعویٰ ہے کہ اُردو کا بیج اس خطّہ میں اپجا۔ اہلِ دِلّی کا خیال ہے کہ یہ دلی اور اس کے قرب و جوار کی زبان تھی، جو بَن سنوار کر اُردو کہلائی۔ صوبہ متحدہ والے کہتے ہیں کہ میرٹھ اور اس کے پاس کے دیہات کی بولی پر فارسی کی قلم لگائی گئی اور اس پر اُردو پیدا ہوئی یا بقول ایک فریق کے برج بھاشا یا سورسینی بولی سے اس کا ظہور ہوا۔ اہل گجرات کہتے ہیں کہ یہ کچی دھات تھی ہم نے اسے نکھارا، سنوارا اور بنایا۔ اہلِ دکن کا دعویٰ ہے کہ اس زبان نے ادبی شان یہاں پیدا کی اور فروغ پایا۔ بہار والے چاہیں تو وہ بھی گجرات و دکن کی طرح اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں ـــــ اس سے اُردو کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور قبولِ عام ہی سب سے قوی دلیل اور سب سے بڑی پسند ہے۔"

اِسی طرح مولوی صاحب نے اُردو کے مختلف ناموں، ان کی وجہ تسمیہ ان کے اشتقاق و ماخذ پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اُردو، اُردوئے معلّیٰ زبان ہندوستان اور ہندوستانی، ہندی، ہندوستانی، ریختہ، زبان دہلوی اور اُردو کے بعض مترادفات کا اُنھوں نے سراغ لگایا ہے، اور ان کے رواج پذیر ہونے پر مُدلّل بحث کی ہے۔
اُردو کی آئندہ ترقی و اشاعت کا مکمل پروگرام بھی اِن خُطبات میں موجود ہے۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنا کر مولوی صاحب نے اُردو کے لیے جو کچھ کیا ہے، اُس کی تفصیل بھی ان میں آپ کو مل جائے گی۔ مادری زبان قومی کردار بنانے میں کیا مدد کرتی ہے اور قومی کردار کا مادری زبان سے کیا تعلق ہے ؛ مولوی صاحب نے اس پر بھی جگہ جگہ عملاً روشنی ڈالی ہے
ایک خُطبے میں اُنھوں نے بیان کیا کہ :

"قومیت کے لیے یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی سخت ضرورت ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں، وہاں دل بھی ایک نہیں۔ یہ دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے۔ اُردو

نے بدرجۂ کمال یہ خدمت انجام دی ہے اور یہ اس کی بڑی کرامات ہے۔

مقامی بولی اور قومی زبان کے فرق کو انھوں نے بڑی سادگی، اختصار اور استدلال سے اپنے ایک خطبے میں بیان کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

"مقامی یا مادری زبان ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے، اور ہونی چاہیئے، لیکن اس کے علاوہ ایک اور زبان بھی ہے جس کا درجہ مادری یا مقامی زبان سے بڑھ کر ہے اور وہ قومی زبان ہے ــــ مقامی بولی صرف ایک مقام کی ہے۔ قومی زبان ساری قوم کی ہے۔ قومی زبان پورے قومی خصائص اور اس کی روایات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مقامی بولی صرف ایک جزو کی نمائندگی کرتی ہے اور بس۔ قومی زبان قوم کے شیرازے کو مضبوط کرتی ہے اور اسے منتشر ہونے سے بچاتی ہے اور قومیت کے ولولوں کو زندہ و تازہ رکھتی ہے۔ اگر اس مسئلے کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور اس کی تہہ تک پہنچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومیت و زبان ایک ہیں۔"

جب اُردو کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا اور صوبہ پنجاب نے اسے عدالتی زبان قرار دینے کی تجویز کی تو انھوں نے اپنی قومی زبان اُردو کی اہمیت کا اظہار اس طور پر کیا:

"قومی زبان کی اہمیت اور قوت و اثر کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اس کا ہر لفظ، ہر جملہ، ہر محاورہ اور روزمرّہ اس کی ہر ہر ترکیب، ہماری تہذیب، ہمارے ادب اور ہماری معاشرت کی جڑوں اور ریشوں تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کے پیچھے ہماری تاریخ و تہذیب کا ایک بڑا سلسلہ ہے جس کی تہہ میں ہماری زندگی کے نقوش کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ ہمارے اسلاف کی صدہا سال کی دماغی ذہنی اخلاقی اور روحانی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس زبان نے جسے ہماری قومی زبان ہونے کا فخر حاصل ہے ہر دَور میں زمانے کا ساتھ دیا ہے، اور ادب و معاشرت، سیاست و علم و فن کی ضروریات کو کما حقہٗ پورا کیا اور کبھی اس کی طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔"

قومی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے اُردو کی فضیلت و برتری کو تاریخی اور تہذیبی وراثت کی مدد سے یوں ثابت کیا ہے کہ:

"جہاں جہاں جس حد اور جس درجے تک اُردو مُروّج ہے، وہاں مُسلمانوں میں اسی حد اور درجے تک شائستگی، روشن خیالی اور قومی شعور پایا جاتا ہے جہاں اُردو کا رواج کم ہے یا نہیں ہے وہاں اسی حد اور درجے تک شائستگی روشن خیالی، اور قومی جذبہ مفقود ہے۔ یہ زبان ہماری قوم کا آلۂ ترقی پیما ہے۔ تھرمامیٹر کی طرح اسے لگا کر آپ فوراً معلوم کر سکتے ہیں کہ کون سا علاقہ تہذیب و ترقی میں کس درجے پر ہے"

اِن چند اقتباسات سے یہ واضح کرنا تھا کہ مولوی صاحب کے خُطبات میں صرف واقعات وحالات کو جمع نہیں کر دیا گیا ان میں مختلف مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔ زبان وقوم کے ہر پہلو پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے اور مختلف نظریات کی تنقید کر کے ان سے مفید واہم نتائج کا استخراج کیا گیا ہے۔ ادب و زندگی، زبان وسماج، تخلیق و تنقید، تحقیق وتاریخ کے مختلفُ النوع مسائل ان میں زیر بحث آتے ہیں۔ ادب وزبان کے متعلق مولوی صاحب کے نظریات کا خلاصہ ان خطبوں میں پوری طرح موجود ہے۔ اس لیے جو لوگ مولوی صاحب کے متعلق اُن کے مقدمات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ وہ عملی تنقید کے سوا نظریاتی مَسائل پر قلم اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے غلطی پر ہیں۔ خُطبات کے مُطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اِن کے ذہن میں وہ تمام فنّی و ادبی نظریات واضح ہیں جن کا سہارا لے کر ہمارے مقالات کو غیر ضروری طول دینے کا رواج ہوگیا ہے۔ وُہ ہر مسئلے پر گہری نظر رکھتے ہیں، اور جیسا کہ اُوپر تفصیل دی گئی ہے، اُنھوں نے اہم اور مشکل سے مشکل مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار بڑی جامعیت کے ساتھ کر دیا ہے۔ آسان و مشکل لکھنے کا جھگڑا میرامّن اور سرور کے زمانے سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ سادہ اسلوب میں جو اثر آفرینی و دلکشی و ہمہ گیری ہوتی ہے وہ مشکل اسلوب کو بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ مَولوی صاحب نے اپنے کئی خطبات میں اس موضوع پر بحث کی ہے اور سادہ ومشکل کے فرق کو بڑی خوبی سے اُجاگر کر دیا ہے وُہ ایک خطبے میں لکھتے ہیں:

"ایسی سادہ زبان لکھنا جس میں سلاست کے ساتھ لُطفِ بیان اور اثر بھی ہو صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ محض سیدھے سادے لفظ جمع کر دینا اور سپاٹ، بے لُطف، بے جان تحریر لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ ہر شخص

کا طرزِ اُسلوب جُدا ہوتا ہے۔ ادب و شعر میں کوئی کسی کو مجبور نہیں کر سکتا
زبان میں ہر قسم کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ
اپنے مضمون یا مقتضائے حال کے مطابق جو الفاظ موزوں اور برمحل ہوں استعمال
کرے۔ اگر ہمیں اپنے بھائیوں کا درد ہے تو ہماری تقریر اور تحریر ضرور سادہ
اور سہل ہوگی۔ لیکن بے چارے ادیب یا مصنف ہی کی گردن دبانا کہ تو سہل
لکھ ٹھیک نہیں۔ ہمیں دوسرے پہلوؤں کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ آسان اور مشکل
اضافی کلمے ہیں۔ ممکن ہے مجھے جو چیز مشکل معلوم ہوتی ہے وہ آپ کے لیے
آسان ہو اور جسے میں آسان سمجھتا ہوں وُہ آپ کے لیے مشکل ہو۔"

ایک اور خطبے میں مولوی صاحب نے سادہ اسلوب کی مشکلات اور اس کے فوائد پر مدلّل بحث کی ہے۔ بعض خطبات میں ادب و انسانیت، سوسائٹی اور ادب، زبان اور عورت، سیاست و زبان، اصطلاحات و محاورات، زبان کے اشتقاق ماخذ کے اصول وغیرہ کے موضوعات پر بڑی عالمانہ بحث ملتی ہے۔ ان تفصیلات سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ مولوی صاحب کے خُطبات میں مختلف علوم و فنون کی معلومات کا ایک گراں قدر ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ وُہ علمی ادبی اور تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے انھیں تمام ادبی خطبات پر فوقیت و برتری حاصل ہے۔ مولوی صاحب اپنے خُطبات میں گارساں دتاسی کی طرح پوری ایک صدی کی ادبی رفتار کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں، لیکن اُن کا کام گارساں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ گارساں نے اپنے خطبات میں صرف اُردو کی مقبولیت اُس کے حلقۂ اثر، اس کی ارتقائی رفتار اور سال بہ سال شائع ہونے والے اُردو اخبار و رسائل اور تالیف و تصنیف کے اعداد و شمار کا ذکر کیا ہے۔ ان میں لسانی یا ادبی اُصول و نظریات کی بحث کہیں نہیں آئی۔ وہ ایک طرح کی تاریخی اطلاعات تو فراہم کرتا ہے، لیکن ان اطلاعات کی صداقت، ان کے معیار کو زیرِ بحث نہیں لاتا۔ اس کے برعکس مولوی صاحب نے اپنے خُطبات میں ادبی جائزہ کو تحقیق و تنقید کی مدد سے بے لاگ، مدلّل، موثر اور مفید تر بنا دیا ہے۔

"مولوی صاحب کے خطبات میں گارساں کے خطبات کی طرح صرف تاریخی حقائق کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اسباب ونتائج و اثرات کی تفصیل بھی ہے۔ اُن کے خُطبات کا موضوع گارساں کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع اور متنوّع ہے۔ غرض مولوی صاحب کے خُطبات کی حیثیت صرف تاریخی نہیں بلکہ علمی، لِسانی، تحقیقی، سوانحی، تنقیدی اور ادبی بھی ہے، اور جیسا کہ مَیں نے شروع میں کہا ہے، اِن میں سے کوئی حیثیت نظرانداز کر دینے کے لائق نہیں ہے۔"

---

ہ

"ادبی کارناموں میں (مولوی عبدُالحق کے) خطبات ... خاصے کی چیز ہیں۔ خُطبے اُن سے پہلے بھی لکھے گئے ہیں مگر بعض خصوصیات نے اِن خطبوں کا درجہ بلند کر دیا ہے۔ خُطبات مختلف موقعوں پر اور مختلف حالات میں لکھے گئے ہیں اس لیے ان میں اچھا خاصا تنوّع ہے۔ اِن خُطبات کا موضوع خاص تو تاریخِ ادب اور مسائلِ زبان وادب ہے مگر یہ سیاسی، سماجی، ادبی تحریکوں کی مُستند دستاویزیں بھی ہیں۔

اِن خطبات کا فنّی پہلو بھی غور طلب ہے۔ ان میں فنِ خطابت کے بیشتر اُصولوں کی پابندی پائی جاتی ہے، چونکہ یہ خطبے خلوص پر مبنی ہیں اس لیے پڑھتے ہوئے عبدالحق پر استغراق کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی ہے۔"

——— ڈاکٹر سیّد ظہیرالدین مَدنی

۱

○

"— (وہ) بلا شبہ بڑا آدمی تھا، اُس نے عمر بھی بڑی پائی۔ ... وہ عمر بھر علمی مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہا۔ ہندوستانی زبان (اُردو) سے اُس کا شغف عشق کے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ اُس کا کارنامہ اس قدر وقیع ہے کہ وہ ہماری زبان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ایک لمحے کے لیے سوچیے اور دیکھیے کہ یہ منظر کس قدر عجیب اور دل چسپ ہے کہ ایک بُڈھا ... ہندوستانی زبان بڑے جوش اور شوق سے لکچر دے رہا ہے اور (لوگوں) کے دلوں میں اس غریب زبان کا شوق پیدا کر رہا ہے۔ اپنی فرصت کا تمام وقت اسی زبان کی تحقیق میں صَرف کرتا ہے۔ اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان دونوں سے خط و کتابت کرتا ہے۔ ایک ایک کتاب، ایک ایک اخبار اور رسالے کا حال پوچھتا ہے۔ قلمی نسخوں کی نقلیں منگواتا ہے۔ ان کی تصحیح کرتا ہے، ترجمہ کر کے چھپواتا ہے۔ خود اس زبان کی تصانیف کا ذخیرہ جمع کرتا ہے اور ہندوستانی ادب (اُردو) کے مختلف شعبوں پر بحث کرتا ہے اور اس کی مفصّل اور مبسوط تاریخ لکھنے کا سامان کرتا ہے اس سے بڑھ کر انسان کے بڑے ہونے کی کیا علامت ہو سکتی ہے!"

——— بابائے اُردو (مقدمہ خطباتِ گارساں دتاسی):

آمنہ صدیقی

# مولوی صاحب کے خطبات

خیالات کے اظہار کے لیے خطابت کو ہمیشہ اہم مقام حاصل رہا ہے اور یہاں تک کہ بعض مُفکرّین نے اس کا شمار فنونِ لطیفہ میں کیا ہے۔ اچھی خطابت بعض اوقات شاعری اور ڈرامے سے بھی زیادہ تاثر پیدا کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ خطیب اپنے سامعین کو محض الفاظ و معنی سے ہی نہیں متاثر کرتا بلکہ اُس کی آواز کا اُتار چڑھاؤ، اُس کے چشم و ابرو کی حرکات، لب و لہجے کی موزونیت اور اُس کے ہاتھوں کے اشارے وغیرہ بھی سامعین کو متاثر کرنے میں بڑا حصّہ لیتے ہیں۔

الفاظ کے معنی ہر حال اور ہر عالم میں وہی نہیں ہوتے جو لغات میں بیان کیے جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات — بعض اوقات کیا، اکثر اوقات، بولنے والے کا اندازِ بیان معنی میں بہت کچھ ردّ و بدل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً "کہی ہوئی" باتوں سے "ان کہی" باتیں زیادہ بامعنی ہوتی ہیں۔

خطیب کی کامیابی اس میں نہیں کہ......... وہ سامعین کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے بلکہ اس کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ خود سامعین کی توجّہ کا مرکز بنا رہے اور یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب کہنے والا، سُننے والوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو۔ مولوی صاحب اس راز سے اچھی طرح واقف ہیں۔

مَیں نے اُن کی دو یا تین تقریریں سُنی ہیں جن کی یاد آج بھی میرے لیے "فردوس گوش" ہے۔ اُن کی آواز کا اُتار چڑھاؤ اور لب و لہجے کی شگفتگی، سُننے والوں کو اپنی طرف متوجّہ رکھتی ہے۔ وہ کسی موقع پر بھی سامعین کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ تقریر کر رہے ہیں۔ گفتگو کا سا سادہ لیکن پُرکار انداز ایسا ہوتا ہے کہ ہر شخص یہی تصوّر کرتا ہے

کہ وُہ صرف اُسی سے مخاطب ہیں۔

مولوی صاحب کے خطبات و تقاریر دو طرح کی ہیں۔ ایک وُہ جو فی البدیہہ کی گئیں، اور دوسری وُہ جو پہلے سے لکھ کر پڑھی گئیں۔ پہلی طرح کے خُطبوں کا افسوس ہے کوئی ریکارڈ میرے سامنے نہیں۔ دوسری طرح کے خطبے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور یہاں اُنہیں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔

مولوی صاحب کے خطبات کی حیثیت مُستقل مضامین کی سی ہے۔ کیوں کہ یہ نہایت محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ہر خطبہ اپنی علیحدہ انفرادیت رکھتا ہے اور اپنی جگہ ایک مُستقل تصنیف ہے۔ یہ خُطبات ایک ہی مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں اور وُہ مرکزی خیال "اُردو" ہے۔ اِن خُطبوں میں اُردو زبان کی تاریخ، اس کے لسانی ارتقا اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ علمی و ادبی اداروں کی کاوشوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان کے لسانی مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ادب و زبان کے بُنیادی مَسائل کو سُلجھانے کی پُر خلوص کوشش کی گئی ہے۔ اُردو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لیے قابلِ عمل تجویزیں بتائی گئی ہیں۔ اُردو زبان سے متعلق شاید ہی کوئی مسئلہ ہو، جس پر مولوی صاحب نے روشنی نہ ڈالی ہو گویا یہ خُطبات اُردو زبان کی اِن سائی کلوپیڈیا ہیں ــــــ

اِن خطبات کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ ان میں عام لسانی مسائل اور اُردو زبان سے متعلق

فکر انگیز بحثیں کی گئی ہیں، اور بہت سے متنازعہ فیہ مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھایا گیا ہے زبان کیا ہے؟ قومی زبان کسے کہتے ہیں؟ لفظ و معنی کا باہمی ربط کیوں کر قائم ہوتا ہے؟ مخلوط زبان کیا ہے؟ اُردو مخلوط زبان کیوں ہے؟ اُردو کا خمیر کن عناصر سے مرکب ہے؟ اُردو میں ہندی فارسی اور عربی عناصر کس حد تک ہیں؟ اُردو میں نظم و نثر کا رواج کب ہوا؟ اُردو نے ہندوستان کے کن کن مختلف مقامات پر پرورش پائی؟ کن کن لوگوں اور اداروں نے اس کی ترویج و اشاعت میں حصّہ لیا؟ مختلف زبانوں میں اِس زبان کی صورت کیا تھی؟ مقامی تعصب زبان کی ترقی کی راہ میں کس حد تک حارج ہوتا ہے؟ زبان کی صحت کا معیار کیا ہے؟ اُردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ کس طرح حل کرنا چاہیئے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے سوالات کے تشفی بخش جوابات اِن خطبوں میں ملتے ہیں۔

مولوی صاحب نے لسانی مسائل پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی۔ لیکن اِن خطبات کی وجہ سے اُن کا شمار صفِ اوّل کے ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے مولوی صاحب نے لسانی مسائل کو حل کرنے میں جو دادِ تحقیق دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے مثال کے طور پر بہار اُردو کانفرنس کا خطبہ دیکھئے۔ اِس میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ اِس مسئلے پر بھی لکھا ہے کہ مختلف زمانوں میں اُردو زبان کو کن کن ناموں سے یاد کیا گیا۔ اِس موضوع پر اُنھوں نے بمشکل تین صفحے لکھے ہیں، لیکن اِن تین صفحوں میں بھی اُنھوں نے پوری ایک داستان بیان کر دی ہے، اور مدلّل طور پر بتایا ہے کہ یہ زبان کن کن ناموں سے موسوم ہوتی رہی۔

برصغیر ہند و پاکستان کی ثقافتی تاریخ میں وہ لسانی جھگڑا بڑی اہمیت رکھتا ہے، جسے ہندی اُردو جھگڑے کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ جھگڑا آج سے تقریباً اسّی نوّے سال قبل شروع ہُوا جب کہ اُردو کی عام مقبولیت کو نظر انداز کر کے ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان منوانے کی کوشش کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کی تشکیل و تعمیر اور بنانے سنوارنے میں ہندوستان کی تمام قومیں برابر کی شریک ہیں۔ یہ زبان نہ تو کسی ایک خطّے کی ملکیت ہے اور نہ ہی کسی ایک قوم کی میراث ہے۔ اس پر سبھی کا حق ہے۔ لیکن جب بعض لوگوں نے اپنا مفاد اُردو کی مخالفت ہی میں دیکھا تو اُنھوں نے ہندی کا ڈھونگ رچایا، ہندی بقول ڈاکٹر مسعود حسین ایک منفی لسانی تحریک ہے، اور کوئی

فطری زبان نہیں۔

ایک عرصے تک ہندی اُردو کا جھگڑا دبی ہوئی آگ کی طرح سُلگتا رہا لیکن جب ۱۹۳۵ء ۱۹۳۶ء میں مہاتما گاندھی نے سیاست اور لسانیات کو ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی تو اُن کی مسیحا نفسی سے یہ دبی ہوئی آگ شعلۂ جوالہ بن گئی۔ سارا ملک دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک طرف اُردو کے حامی اور دوسری طرف ہندی کے طرفدار پیدا ہوگئے۔ ہندی کے طرفدار زیادہ طاقت ور تھے۔ کیونکہ گاندھی جیسی بڑی شخصیت اُن کی راہ نمائی کر رہی تھی۔ ایسے موقع پر مولوی عبدالحق نے اُردو کے تحفظ پر کمر باندھی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ اُردو ہی ہندوستان کی مقبول ترین زبان ہے۔ ہندی اُردو کے اِس جھگڑے کی تمام تفصیلات اور اُردو پر جو اعتراضات کیے گئے اُن کے مدلّل جوابات خطباتِ عبدالحق میں موجود ہیں اور اس لحاظ سے اِن خطبات کو ہندوستان کے اہم ترین لِسانی جھگڑے کی مکمل تاریخ کہا جاسکتا ہے۔

اِن خطبات میں مولوی صاحب نے ملک کے تعلیمی مسائل پر بھی جا بجا بحث کی ہے، اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستانیوں کی تعلیم خود انھیں کی زبان میں ہونی چاہیئے اس سلسلے میں اُنھوں نے جہاں ایک طرف یہ بتایا ہے کہ غیر زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے کیا نقصانات ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف یہ بھی مدلّل طور پر ثابت کیا ہے کہ اُردو ہر اعتبار سے اِس لائق ہے کہ اسے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے دہلی کالج اور جامعۂ عثمانیہ کی مثالیں جا بجا دی ہیں اور ان عظیم الشان اداروں کی خدمات کا خاکہ پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی راج کے استحکام کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دے کر اِن کی قومی اور تہذیبی خصوصیات کو ختم کر دیا مولوی صاحب کے نزدیک ہندوستانیوں کو اِس ذہنی غلامی

سے آزاد کرانے کی یہی سب سے موزوں تدبیر تھی کہ انہیں خود انہیں کی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لیے وُہ جو کچھ کر سکتے تھے، اُنہوں نے کیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب کوشش نہ کرتے تو جامعہ عثمانیہ کبھی وجود میں نہ آتی۔ اِس یونی ورسٹی کی تعمیر و تشکیل مولوی صاحب کا ایسا کارنامہ ہے کہ جس نے ہند و پاکستان کے تعلیمی نظام میں ایک تغیرِ عظیم برپا کر دیا، اور ہر شخص کو یہ ماننا پڑا کہ اُردو میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ وُہ ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے رائج ہو سکے مولوی صاحب کے اِن خیالات کی جھلک اُن کے خطبات میں جا بجا پائی جاتی ہے۔

اِن خطبات میں مولوی صاحب کی اُردو دوست شخصیت پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے مجھے تو ان خطبوں میں وہی سچائی اور وہی خلوص نظر آتا ہے، جو ایک اچھی خود نوشت سوانح عمری کا خاصہ ہے۔

مولوی صاحب نے جن مختلف زاویوں سے اُردو کی فضیلت ثابت کی ہے، جن مختلف طریقوں سے اُردو کے مخالفوں کو شکست دی ہے، اس کی تمام رُوداد ان خطبوں میں مل جائے گی، اور یہ رُوداد ایسی ہی ہے جیسے کوئی اپنی داستان لکھ رہا ہو۔ اگرچہ لفظ "میں" اِن خطبوں میں بہت کم آیا ہے، اس کے باوجود مجھے یہ اصرار ہے کہ یہ خطبات مولوی صاحب کی خود نوشت سوانح عمری نہیں بلکہ اُن کے "اعتراف" ( confession ) ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ذات کو اُردو میں ضم کر کے "من و تو" کا فرق مٹا دیا ہے۔

الغرض اِن خطبوں میں ہمارے دور کا ایک عظیم ذہن پوری طرح بے نقاب نظر آتا ہے۔ ارسطو نے زہر کا پیالہ پینے سے پہلے یونان کی عدالت میں جو بیان دیا تھا وہ انسانی ذہن کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ خطبے جو مولوی عبدالحق نے اُردو کی محبت میں سرشار ہونے کے بعد لکھے، ہندوستان کی ثقافتی تاریخ کا نمایاں ترین باب ہیں۔

---

٥

"(مولوی عبدالحق) کے خُطبات میں وہ روکھا پن یا عارضی اثر نہیں ہوتا جو عام خُطبات کی خُصوصیت ہے ... اُن خُطبات میں لہجے کی ہنک اور ادب کی چاشنی کے علاوہ، موضوعات کا تنوع ملتا ہے جو دوسرے ادیبوں کے خُطبات میں بہت کم نظر آتا ہے۔ بعض (خطبات) اگرچہ طویل ہیں مگر ان کی سادگی اور پُرکاری سامعین کے دماغ میں ایک دیرپا اثر چھوڑتی ہے ... یہ خُطبات درحقیقت ایک تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں اُنھوں نے جن حالات کا ذکر کیا ہے وہ شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ و چشم دیدہ ہیں ... اِن خطبات میں سرسید احمد خاں کے قومی نظریات، سیاسی مسلک اور اصلاحی نقطۂ نظر کی وضاحت ملتی ہے۔ اقبال اور ان سے پہلے سرسید اور ان کے دوسرے رفقائے کار کی ذہنی کاوشوں کی ایک سرسری سی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اِن خُطبات کی سوانحی اہمیت بھی ہے۔ ان میں بابائے اُردو کی زندگی کے مختلف اُتار چڑھاؤ اُن کے علمی اور ادبی کارنامے اور ایک طرح کی ہمہ گیری ملتی ہے۔ اِن خُطبات سے ہم مولانا کی خود نوشت سوانح حیات کا کام لے سکتے ہیں۔"

—— غلام احمد فُرقت کاکوروی

کنیز فاطمہ اشرف

# بابائے اُردو کے خطبات میں مزاح

بابائے اُردو ایک بلند درجہ محقق ہیں، ادیب و انشا پرداز ہیں اور ساتھ ہی بلند مرتبہ مقرر بھی ہیں اُن کے خطبات و تقاریر میں اِس امر کی روشن دلیلیں موجود ہیں۔

خطابت ایک فن ہے۔ متمدن ممالک میں بہ حیثیت فن اس کو سکھلایا جاتا ہے۔ وہ لوگ اس کے بڑے قدرشناس ہیں۔ اس فن کے شوقین برسوں مشق کرتے ہیں، تب کہیں کسی قابل بنتے ہیں اِس کے برعکس ہمارے ہاں علوم و فنون کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ایسے بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں جو فن کی اہمیت اور اس کی نزاکتوں کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر جس تقریر میں چیخ پکار ہوتی ہے اُسی کو بہترین تقریر خیال کیا جاتا ہے۔

فنِ خطابت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصّہ مواد و موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا حصّہ زبان اور تیسرا حصّہ اندازِ بیان سے۔ دراصل زبان اور اندازِ بیان کو الگ نہیں کیا جاسکتا؛ لب و لہجہ یا اندازِ بیان، زبان کے ساتھ آجاتا ہے۔ الفاظ کا استعمال زبان کی رَوانی، آواز کا آتار چڑھاؤ، جملوں کی ساخت وغیرہ بہت اہمیت رکھتے ہیں، اور پھر زبان و اندازِ بیان کے مواد و موضوع کے ساتھ وابستگی کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ غرض اِس طرح اس فن میں خود اپنی نزاکتیں اور باریکیاں ہیں۔ اسی طرح مُقرر یا خطیب اَپنے سننے والوں کے جذبات اور ذہنی کیفیتوں میں بھی خیال رکھتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے وُہ مواد کو ترتیب دیتا ہے، اور زبان بھی اسی کے مُطابق موزوں اور مناسب استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح خطیب یا مقرر اَپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کئی ترکیبیں کام میں لاتا ہے۔ کہیں وہ زبان کے چٹخارے سے کام لیتا ہے۔ کہیں موقع و محل کے پیشِ

نظر طنز و مزاح کو آلۂ کار بناتا ہے۔ جس طرح شاعر اپنے خیال کو ہم تک پہنچانے کے لیے تشبیہ و استعارہ کا استعمال کرتے ہیں، یا جس طرح صوفی اپنا پیغام پہنچانے اور تصوّف کے نکات سمجھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے لطیفوں اور چٹکلوں سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح مقرر بھی سامعین کو متوجہ کرنے اور اپنا خیال ان کے ذہن نشین کرنے کے لئے لطیفوں اور چٹکلوں سے کام لیتا ہے۔ اس کے استعمال میں بھی بڑی ہوشمندی اور زیرکی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ جاننا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا لطیفہ یا چٹکلہ خیال سے مناسبت رکھتا اور زود اثر ہے اگر اس میں ذرا بھی چوک ہوتی ہے تو پھر مقرر اور خطیب، مقرر اور خطیب نہیں ہوتے، بلکہ داستان گو اور لطیفہ گو ہو کر رہ جاتے ہیں۔

بابائے اُردو فنِ خطابت سے بخوبی واقف ہیں۔ اُن کے خطبات فنِ خطابت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یہ جس طرح اُردو زبان و ادب کے ہر گوشہ سے واقف ہیں۔ اسی طرح فنِ خطابت سے بھی پورے پورے آگاہ ہیں۔ اس فن کے برتنے میں بابائے اُردو نے صوفیوں کا تتبع کیا ہے۔ اپنی کتاب "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں بابائے اُردو نے صوفی اور مولوی کے فرق کو واضح کیا ہے:

"اصل صوفی بہت بڑا ماہرِ نفسیات ہوتا ہے اور باوجودیکہ وہ دنیا سے ایک گونہ بے تعلق اور مولوی اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ دُنیا دار ہوتا ہے۔ مگر وہ علما کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے۔ وہ دلوں کو ٹٹولتا ہے، اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں کی تہ تک پہنچتا ہے۔ جہاں انسان کے اصل اسرار چھپے اور دبے رہتے ہیں، جن سے ہم خود بھی واقف نہیں ہوتے۔ مولوی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی۔ اس میں صوفی کی جیت ہے . . . . . . . جب دِل ہاتھ میں آ گیا تو سب کچھ مل گیا۔ کسی کا دِل ہاتھ میں لانا ایک نئی دُنیا فتح کرنے سے کم نہیں۔ یہ جو مشہور ہے کہ "دِل بدست آور کہ حجِ اکبر است" یہ صوفی ہی کا قول ہے اور صوفی ہی اِس پر عمل کر سکتا ہے۔"

کہنے کو تو بابائے اُردو کہتے ہیں کہ یہ صرف صوفی ہی کر سکتا ہے مگر اس موقع پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بابائے اُردو نے اِسی خیال کے پیشِ نظر اپنے خطبات ترتیب دیئے ہیں۔

بابائے اُردو کے خطبات اپنے مباحث اور مضامین کی وجہ سے نہایت متنوّع ہیں۔

انہیں خوشی و مسرت غم و غصہ وغیرہ ہر قسم کے جذبات کے اظہار کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن بظاہر نہ یہ کھلا کھلا کے ہنستے پائے گئے، نہ روتے دکھائی دیئے اور اسی طرح کبھی بھی غیض و غضب میں چیخے نہ چلّائے۔ یہ سب کام انھوں نے الفاظ اور لب و لہجہ سے لیا ہے۔ وہ ہنسے اور ہنسایا۔ روئے اور رلایا غصّہ میں آئے، اور غصّہ دلایا۔ اسی میں اُن کی کامیابی رہی اور اسی سے اُنھوں نے گڑھ جیتے ہیں۔ اسی طرح بابائے اُردو نے بعض جگہ لطیفوں اور چٹکلوں سے بھی اپنے مافی الضمیر کو ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اُن کے کثیر التعداد خطبات میں معدودے چند لطیفے اور چٹکلے ہیں مگر جہاں کہیں اِن سے کام لیا گیا ہے، وہاں یہ اتنے برمحل ہیں کہ چٹکلے کے ذریعہ دفتر کے دفتر ہمارے ذہنوں میں بھر دئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ موضوع خاص کے علاوہ سامعین اور قارئین کے سامنے بیک وقت کئی اور پہلو بھی آ جاتے ہیں۔

بابائے اُردو کی زندگی کا اوّلین مقصد ہمیشہ اُردو زبان کی اشاعت رہا۔ سیاست سے اُنھیں زیادہ واسطہ نہیں تھا۔ ۱۹۳۸ء میں، علی گڑھ میں "سیاست اور اُردو زبان" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے ایک واقعہ بیان کیا جو دلچسپ بھی ہے اور اُن کے نقطۂ نظر کی پوری طرح وضاحت بھی کرتا ہے۔ اُس واقعے سے اُس عہد کے سیاست دانوں کے کھوکھلے پن پر روشنی بھی پڑتی ہے:

"جس زمانے میں کہ مسلم یونیورسٹی نہ تھی اور ایم۔ اے۔ او کالج تھا اُس وقت کالج میں ایک حجام عنایت اللہ نامی تھا۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو اُسے اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئے۔ وہ بہت سمجھدار اور وفادار شخص تھا۔ اُس نے حیدر آباد میں خاص حیثیت حاصل کر لی تھی، اور ہم سب اُسے عزت سے دیکھتے تھے۔ کچھ دنوں بعد مولوی شبلی حیدر آباد تشریف لے گئے، اُنہیں وہی خیال رہا۔ اور عنایت اللہ کی نئی حیثیت کی خبر نہ تھی۔ اُنھوں نے عنایت اللہ سے کہا کہ "میاں خلیفہ ذرا ناخن تو لینا" یہ اُسے ناگوار تو ضرور ہوا، مگر خیر اُن کے ناخن تو لئے مگر ایک ناخن ذرا گہرا بھی کاٹ ڈالا۔ جس سے مولوی صاحب کو ذرا جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اس کے

بعد انہوں نے پوچھا کہ "اب تم کیا کرتے ہو"، عنایت اللہ نے کہا کہ "مولوی صاحب اب میں پولیٹیکل ہو گیا ہوں" اس زمانے میں حیدر آباد کی فضا کچھ ایسی ہی تھی۔ میں جب اُس زمانے کا خیال کرتا ہوں اور آج کل کے زمانے کو دیکھتا ہوں تو ہر شخص حجام یعنی پولیٹیکل نظر آتا ہے۔"

بابائے اُردو کا خیال ہے کہ انسان ہمیشہ ماضی سے حُسنِ ظن رکھتا ہے۔ اچھائیاں یاد رہ جاتی ہیں، اور بُرائیاں بھول جاتا ہے۔ اس خیال کی وضاحت انہوں نے بڑے دل چسپ پیرائے میں کی ہے:

آپ نے ضرور سُنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جا رہا تھا چلتے چلتے رستہ میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا، اُس وقت بے ساختہ اُس کی زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی" پھر جھٹ اُٹھ کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں ہے تو کہنے لگا "جوانی میں کون سے تیر مارے تھے" جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اَپنے سامنے دیکھتا ہوں تو مجھے وُہ شریف بڈھا یاد آجاتا ہے ایک دو بار نہیں بار بار مَیں نے یہ کہتے سُنا ہے کہ پہلے کے جوان (یعنی چالیس برس پہلے کے) زیادہ قابل ہوتے تھے۔ میں نے اِس کی ہمیشہ تردید کی ــــ"

مضمون یا تقریر کی یکسانیت سے آدمی اُکتا جاتا ہے جس طرح مُنہ کا مزہ بدلنے کے لیے ہم کبھی کبھی چٹ پٹی چیزوں کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں اسی طرح ایک خطیب سے ہم اسی وقت مُتاثر ہو سکتے ہیں جب کہ وہ ہمیں تلخیوں کے ساتھ ساتھ اپنی شیریں بیانی سے محظوظ کرے۔ بابائے اُردو کے خطبات بدرجہ اتم اس خصوصیت کے حامل نظر آتے ہیں۔

پروفیسر سیّد شبیر علی کاظمی

# خطباتِ عبدالحق کا اسلوب

"بابائے اُردو کے طرزِ نگارش کے متعلق لکھنا جتنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے اتنا ہی اصل میں دشوار ہے۔ اُن کی ذات کم و بیش ایک صدی کی ترجمان ہے اور پھر اُنہوں نے دُنیا کے سب دھندے تیاگ کر اُردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ زمانے کی ضرورتوں کے مدنظر اس کو پھیلایا اور سنوارا، دُھن کے پکے تھے، اُردو کو اپنایا اور ایسا اپنایا کہ بابائے اُردو کہلائے۔ بابائے اُردو کے اجزائے ترکیبی میں بہت سے عوامل و تاثرات کارفرما ہیں۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں منصہ شہود پر آتے ہیں۔ اُن کے ہوش کی آنکھیں سرسیّد سے دوچار ہوتی ہیں۔ اُن کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کے ماحول میں اُن کا ذہن تربیت پاتا ہے۔ اُن کے استاد انہیں فلاسفر کہہ کر پکارتے ہیں۔ اُن کے ہم جماعت اُنہیں سینٹ پال کا خطاب دیتے۔ وُہ حالیؔ کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ وُہ حالیؔ کی سادگی اور خلوص سے بہرہ وَر ہوتے ہیں۔ شبلی کی جانشینی پاتے ہیں۔ غرض کہ ان تمام عناصر نے مل کر مولوی عبدالحق کو بابائے اُردو بنا دیا۔ تجرّد کی زندگی نے موقف کی اہمیت کو اُن کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے مرتکز کر دیا، اور اس کے حصوّل کے لیے اُنہوں نے وُہ سب کچھ کیا جو شاید ایک انجمن بھی نہیں کر سکتی وہ ساز باز سے جیتنے کے قائل نہ تھے۔ بلکہ حقائق کی روشنی میں دلیلوں سے نصرت کا جھنڈا گاڑنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اُن میں ایک قسم کی دُرشتی اور سختی پیدا ہو گئی تھی، جس کو لوگ ضد یا ہٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب حق و ایمان داری کا دیدہ و دانستہ خون بہایا جاتا ہے مولوی صاحب کی کراچی کی زندگی ایک کرب والم کی داستان ہے جس کا اُنہوں نے مختلف طور پر تذکرہ کیا ہے، اس

دور کی تحریروں سے میرؔ جیسی نشتریت ٹپکتی ہے جو غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُمید، جوش، ولولہ اور کارہائے نمایاں کی تکمیل سے مولوی صاحب کے طرزِ تحریر میں ایک استغنا کا عکس ملتا ہے جو آخری دَور کی زندگی میں پہنچ کر خاصہ غم آگیں ہو جاتا ہے، سادگی و پرکاری میں نااُمیدی اور بے بسی کی جھلک ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کو اپنے اسلوب میں سمو دیا اُن کی زندگی اور اس کا نور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے۔ اُن کے طرزِ نگارش میں سرسیّد کا کاروباری پن، حالیؔ کا اُردو پن اور شبلیؔ کی شان مل کر ایک مُستقل دبستان بن جاتا ہے۔ اسلوب دراصل اظہارِ ذات ہے۔ اس کی خوبیاں اور بُرائیاں مُصنّف کے دل و دماغ کے عکس ہیں۔ اِس لیے بابائے اُردو کی تصویر ان کے طرزِ نگارش میں پوشیدہ ہے۔

خُطباتِ عبدالحق جو اب کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، مُقدّماتِ عبدالحق کے بعد اہمیّت میں دوسرا درجہ رکھتے ہیں۔ خُطبات میں سامعین کے جذبات سے کھیلنا مطلب براری کے لیے مستحسن ہے۔ خطبہ بھی ایک قسم کی شریفانہ نعرہ بازی ہے۔ جس میں ہجومی نفسیات کا دخل ہوتا ہے۔ مگر مولوی صاحب کے یہاں یہ بات نہیں۔ وُہ سیاسی نہیں، وُہ مذہبی مُبلّغ نہیں، وُہ خطیب ضرور ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ ادیب بھی۔ اِس لیے اُن کے یہاں غور و فکر کے لیے کافی مواد ہے، جسے وُہ اپنی سیدھی سادی ذات کی طرح سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ سستی جذباتی اپیل نہیں، واقعات کا اظہار ہے جو مخالف کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ خُطبات کا جغرافیہ پورا ارضِ ہندوستان ہے، جہاں پر ہر علاقہ میں کوئی نہ کوئی علاقائی زبان ہے مگر مولوی صاحب کے خُطبات کو ادبی شان کے باوجود ہر کس و ناکس سمجھتا ہے۔ خُطبات کی طرزِ نگارش کی یہی سب سے بڑی شان ہے۔

بابائے اُردو نے مقالاتِ حالیؔ حصّہ اوّل کے دیباچے میں حالیؔ کے طرز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وُہ دراصل اُردو نثر کے طرزِ تحریر کے لیے ایک منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ چُنانچہ فرماتے ہیں:

"ان کی نثر جچی تلی اور متین ہوتی ہے۔ اِس میں ضبط و اعتدال ایسا ہے، جو بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے، اور بڑے بڑے اساتذہ ہی اِس پر قادر ہو سکتے ہیں، ورنہ اچھے اچھے انشا پرداز اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر کہیں سے

کہیں بھٹک کر نکل جاتے ہیں اور غیر متعلق باتیں کہنے لگتے ہیں اور بعض اوقات بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جو زیادہ چلائے گا اُس کی آواز زیادہ سُنائی دے گی، وہ دھوکے میں ہیں۔ وہ انسانی فطرت سے واقف ہیں اور نہ انشار پردازی کے گُر سے۔ مولانا اس وقت تک کبھی نہیں کہتے جب تک انہیں کسی بات کے کہنے یا خیال ظاہر کرنے کی حقیقی ضرورت پیش نہیں آتی، اور جو کہتے ہیں، وہ ایسی کہ دل میں اُتر جائے۔ جب کوئی خیال دماغ میں صحیح اور صاف نہیں ہوتا تو بیان میں بھی صحت وصفائی نہیں آتی اور ہزار عبارت آرائی کیجئے، دُھندلاپن نہیں جاتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم خیال تو ادا کر دیتے ہیں، مگر جو ہم چاہتے ہیں وہ بات پیدا نہیں ہوتی اس لیے فقروں کے ردّے پر ردّے چڑھائے چلے جاتے ہیں، اور پھر بھی بات نہیں بنتی ہے۔ کیا ہے، ایک لفظ کی کمی ہے جو اس موقعہ پر آنا چاہتا تھا اور وہ نہیں سوجھا۔ یہ گُر مولانا حالی سے سیکھنا چاہیئے۔ انہیں لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال میں کمال حاصل ہے، بعض جگہ وہ ہندی کا پُرانا اور غریب لفظ استعمال کر جاتے ہیں، لیکن وہ ایسا برمحل ہوتا ہے کہ کلام میں جان پڑ جاتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ہار کر نثری شاعری کرنے لگتے ہیں۔ یہ شیوہ ضعفِ ادبیت کی دلیل ہے۔ مولانا حتی الامکان کبھی نثر میں شاعری کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ یہ نہ نظم ہوتی ہے اور نہ نثر اور خیال کی صحت اور قوت کو ضعیف کر دیتی ہے۔ اُن کی نثر میں متانت قوت، صفائی اور ضبط پایا جاتا ہے، جو اعلیٰ نثر کے جوہر ہیں"۔

حالی کی نثر کی خوبیاں بابائے اُردو کے یہاں بھی ہیں۔ بلکہ اُنھوں نے اپنے طرزِ نگارش میں شگفتگی اور گیرائی کا مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اِن خُطبات میں کہیں کہیں تفصیل بارِ خاطر ہو گی، مگر خطبہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے۔ خُطبات کو کتابی صورت میں پڑھتے وقت تکرار ملتی ہے۔ جس کے لیے خطیب ذمہ دار نہیں۔ خُطبات میں اکثر و بیشتر بابائے اُردو نہایت پیچیدہ خیال کو اپنی نوکِ قلم سے پانی کر دیتے ہیں۔ آسان زبان، بیان میں سُلجھاؤ، حقیقت کا بیان، واقعات کا اظہار، دلیلوں کی بھرمار، تاریخی پس منظر، احتیاج وقت کا احساس اور ساتھ

ہی ساتھ اَدبی چاشنی غرض یہ کہ وُہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو موثر خطبات کے لیے لازمی ہیں۔ یہ خُطبات اُردو کی اشاعت اور تعارف کے لیے تھے۔ اِن میں مقصد کی جھلک ہے محبت کی پُکار ہے۔ عقل و دانش سے اپیل ہے۔ خطیب قسمیں نہیں کھاتا، خُدا و رسول کا واسطہ نہیں دیتا، بلکہ اپنے موقف کو نہایت اعتماد اور خلوص سے پیش کرتا ہے، اور اس مقصد کے لیے وہی اسلوب اختیار کرتا ہے، جس میں ادبی وقار کے ساتھ ساتھ منوا لینے کا حربہ بھی کارگر ثابت ہوتا ہے۔ خُطبات کے مواد اور اسلوب سے اُردو زبان کو کیا فائدہ پہنچا اس کا اندازہ لگانا دُشوار ہے لیکن اُردو کی اشاعت میں ان کا کافی ہاتھ ہے۔ خُطبات نے مولانا کے طرز کو مُتعیّن کر دیا اور وُہ رَچ بس کر ایک مُستقل دبستان بن گیا۔ خطبات سے کچھ اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

"جس رسم خط میں صَرف کم ہوگا، وقت کم لگے گا، جگہ کم گھرے گی اور جس کے پڑھنے میں آسانی ہوگی، اور جو دیکھنے میں خوش نما ہوگا، وُہی مقبول ہو کے رہے گا۔"

"جو اسے بولتا ہے اُس کی زبان ہے، جو زیادہ فصاحت کے ساتھ لکھتا بولتا ہے، وُہی زیادہ تر زبان داں اور اہلِ زبان کہلانے کا مُستحق ہے۔"

"زبان کا کوئی رنگ روپ نہیں۔ اس کی کوئی ذات نہیں۔ اس کی کوئی قومیّت نہیں اس کا کوئی مذہب اور وطن نہیں، جو اِسے بولے، لکھے، پڑھے گا اور استعمال کرے گا، اسی کی وہ زبان ہوگی۔"

"زبان کیا ہے، خیال کے اَدا کرنے کا آلہ اور اگر کسی کاریگر کا آلہ بھدّا ہے تو اُس کا کام بھی بھدّا ہوگا۔"

"زبان کے بنانے میں یہ نُکتہ یاد رہے کہ ملک کی عام اور مقبول زبان وہی ہو سکتی ہے جسے زیادہ سے زیادہ تعداد سمجھے اگر آپ اِس اُصول کو مدِّنظر نہ رکھیں گے تو آپ کی زبان سُکڑتے سُکڑتے ایک محدود حلقے میں بند ہو کر رہ جائے گی۔ اُردو کو اِس لیے برتری ہے کہ اس ملک کے زیادہ سے زیادہ اشخاص اِسے بولتے ہیں۔"

"یہ زبان عوام کی زبان تھی وہ عوام میں پیدا ہوئی اور عوام کے گودوں میں پلی اور عوام سے خواص میں گئی۔ بازار اور گلی کوچوں سے محلّوں میں پہنچی۔"

"زبان کسی ایک شخص کی ایجاد نہیں۔ اس کے بنانے اور ترّقی دینے میں ساری قوم نے کام

کیا اور جب تک قومی زبان میں جان باقی ہے، یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔"

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ زندہ زبان میں لازم ہے کہ اس میں نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہے ورنہ ایک روز وہ مردہ ہو جائے گی۔ ہر زبان کی ایک فطرت اور ساخت ہوتی ہے، اور جب تک لفظ اس کے سانچے میں نہیں ڈھلتا قابلِ قبول نہیں ہوتا۔"

"خیال ہمارے دماغ میں اس قدر صاف اور روشن ہونا چاہیئے کہ جس وقت ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحہ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا نظر آئے۔"

"میں نے لڑکپن میں انجمن حمایت اسلام کا بچپن دیکھا تھا، اور اب بڑھاپے میں اس کی جوانی کی بہار دیکھ رہا ہوں۔ میں جوں جوں بڑھتا جاتا ہوں بڈھا ہوتا جاتا ہوں، یہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہے، جوان ہوتی جاتی ہے۔"

نمونہ از خروارے۔ دیکھئے بابائے اُردو نے اپنے مافی الضمیر کو کس یقین اور سادگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اس سادگی میں اعتماد کی جھلک ہے، جو اُن کی قدرتِ زبان کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ مندرجہ بالا ٹکڑے لسانیات سے متعلق ہیں، کیونکہ اُردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں مولوی صاحب کو اُردو کی خوبیاں اور اُس کی اصلیت واضح کرنا پڑی تھی۔ مگر طرزِ نگارش کی خوبی ہے کہ لسانیات سے متعلق خیالات کو عام فہم بنا کر پیش کیا اور اس جیسے خشک موضوع کو عوام کی سطح پر لا کر قدرتِ بیان کے کرشمے سے سامعین کو متحیر کر دیا۔ یہ بابائے اُردو ہی کا حق تھا وُہی اس کو نبھا گئے۔ بقول عبادت بریلوی سادگی اُن کا نمایاں ترین وصف ہے لیکن اُن کی سادگی میں بھی ایک پُرکاری ہے، اس میں مشکل پسندی نام کو نہیں۔ برخلاف اس کے سلاست ہے جو معنوی آسان پسندی کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ اس میں زور ہے جس کو خیال قطعیت نے پیدا کیا ہے، اس میں جوش ہے جو جذبہ کی فراوانی اور احساس کی شدت کا بنیادی نتیجہ ہے۔"

مولوی صاحب دراصل خطبات بڑے غور و فکر سے لکھتے تھے۔ ان میں دانشمندانہ سوجھ بوجھ ہے۔ ان کا مقصد سامعین کے جذبات کو مشتعل کرنا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ سوچ بچار کے لیے غذا بھی فراہم کرنی مقصود تھی۔ اس لیے یہ خطبات محض جذبات کو اپیل نہیں کرتے بلکہ سامعین اور قاریوں کے دل و دماغ بھی متاثر ہوتے ہیں، جو کہ طرزِ نگارش کا نتیجہ ہے۔ یہ اسلوب اُردو نثر کا سہل ممتنع ہے اور بابائے اُردو بظاہر اس کے مختتم ہیں۔

خطبات کی زبان میں ہندی الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ملتے ہیں۔ ان میں بعض الفاظ عوام اور عورتوں کی زبان کے لیے مخصوص ہیں۔ ثقہ حضرات ان کے استعمال پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، کیونکہ ان کے فارسی و عربی مرادفات مستعمل ہیں۔ مگر بابائے اردو نے ان کو قصداً استعمال کیا ہے، جس سے زبان میں وسعت اور سکت بڑھ گئی ہے اور پیرایۂ بیان بھی تکلف سے بچ گیا ہے۔ یہ الفاظ دونوں قسم کے ہیں۔ اول مفرد۔ دوم مرکب۔ مفرد الفاظ ہندی میں رائج ہیں یا عورتوں کی بولی میں سُنے جاتے ہیں۔ مگر اردو میں ادبی حیثیت سے بیگانہ تھے۔ بابائے اردو نے انہیں استعمال کیا اور نئی زندگی بخشی۔ مفرد الفاظ یہ ہیں۔ ساجھی۔ رُدپ۔ کنیڈا۔ بکری۔ دوس چیونٹی۔ بساند۔ کپوت۔ جھرجھری وغیرہ، ان کے استعمال نے زبان میں وسعت کے ساتھ ساتھ ایک بے تکلفی بھی پیدا کر دی ہے۔

مرکب الفاظ دو قسم کے ہیں۔ دونوں ہندی اصل ہیں یا ایک ہندی کا ہے اور دوسرا غیر ہندی۔ مثلاً ایک تسا جال۔ کس بل، پیسے کے لوبھی، کونا کھدرا، مہا تصانیف۔ خط پتر وغیرہ، یہ مرکبات اس صورت سے وضع ہوئے ہیں کہ ان سے بہتر اور کوئی دوسری صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے زبان دانی کہیے، اہلِ زبان ہونے کا نتیجہ کہیے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس امر کو زبان کی خلاقی سے عبارت سمجھئے۔ یہ عام لوگوں کے بس کا روگ نہیں کہ زبان کی توسیع کے لیے دخیل الفاظ باریابِ ادب کریں۔ یہ مخصوص ہستیاں ہی ہوتی ہیں۔ اردو زبان میں بابائے اردو اس سے ممتاز ہیں۔ یہ گھریلو الفاظ عبارت کی روانی میں مانع نہیں۔ عبارت کے سیاق سے ان کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے۔

خطبات کا طرزِ نگارش بابائے اردو کا ادبی کرشمہ ہے۔ سادگی و پرکاری اور ادبی چاشنی سے وہ اسلوب تخلیق ہوتا ہے جس کا اتباع اگر غیر ممکن نہیں تو دشوار تو ضرور ہوگا، اور اسی میں بابائے اردو کی بزرگی اور عظمت پوشیدہ ہے۔

# سیرت نگاری

"ہم عصر مشاہیر کے حالات لکھنا (قدما) کے مقابلے میں بہت کٹھن ہے ... تمام حالات کا جمع کرنا اور مختلف واقعات اور بیانات کی چھان بین کے بعد کیریکٹر کی صحیح تصویر کھینچنا ... ایک ایسی دشواری ہے جسے اُس کا جی جانتا ہے جس کو کبھی اس قسم کے کام کرنے کا تجربہ ہوا ہے ... جس قدر جو شخص بڑا ہوگی اسی قدر سوانح نگار کو اپنی رائے اور قیاس سے زیادہ کام لینا پڑے گا۔ وسعتِ تعلقات سے اصل حقیقت کے سمجھنے میں نہ صرف اُلجھن پیدا ہوتی ہے بلکہ غلطی واقع ہو جاتی ہے اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ گرد و پیش کے حالات کا اثر اس پر اور اس کا اثر ان حالات پر کیا پڑا۔ قطع نظر غلطی و صحت کے اُس کی نیت کا اندازہ کرنا پڑے گا۔ اس کے اصلی اور اندرونی خیالات کو دیکھنا پڑے گا۔ اس کے برتاؤ، اس کے طرزِ کلام و طرزِ تحریر، اس کی عام روش اور رُجحان کی تلاش کرنا پڑے گی ... اگر سوانح نگار ایسا شخص ہو جو اس بڑے شخص کی خوبیوں کا قدر دان نہیں تو کیا وہ اس اہم فرض کو ادا کر سکتا ہے۔؟"

——— بابائے اُردو

پروفیسر سیّد وقار عظیم

# مولوی صاحب کی سیرت نگاری

آدمی کے لیے آدمی کی پرکھ سے زیادہ دشوار کام شاید کوئی نہیں کہ وہ جتنا باہر سے نظر آتا ہے، اُس سے زیادہ اندر چھپا ہوا ہے۔ اُس کے اِس چھپے ہوئے حصّے کو دیکھ سکنے اور اس کا پورا بھید جاننے کے لیے دیکھنے والے کو ظاہری نظر سے کہیں زیادہ دِل کی آنکھ اور بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے، اور یہ بصیرت ہر ایک کے حصّہ میں نہیں آتی۔ آدمی نے زندگی میں جو کچھ دیکھا ہے یا اُس کے ظاہر و باطن کا جو مشاہدہ کیا ہے اُس کا ذکر اس کی عادت ہے۔ اس عادت نے طرح طرح کی صورتیں اختیار کی ہیں اور تحریر میں یہی عادت ادب کی گوناگوں اصناف کی تخلیق کا باعث بنی ہے۔ ان ہی اصناف میں سے ایک، سیرت نگاری ہے جس کے ذریعہ ادیب اُن شخصیتوں کی شخصیت کی تصویریں الفاظ میں کھینچتا ہے، جنھیں اُس نے دیکھا بھالا اور جانا پہچانا ہے اور اس طرح کھینچتا ہے کہ ظاہر اور باطن دونوں کے رنگ اُبھر کر شخصیت کے مکمل نقش کو یوں اُجاگر کر دیں کہ اس کا صحیح عکس آنکھوں میں پھر جائے اور پورا نقش دل میں بیٹھ جائے جس شخص کی سیرت اور شخصیت کا ذکر اور بیان ہو رہا ہے، وہ اس طرح ہماری نظر کے سامنے آ جائے اور ہمارے دِل میں گھر کرے، جیسے ہم نے اُسے خود دیکھا بھالا، سمجھا بوجھا اور پرکھا ہے۔ آدمی خواہ نیکیوں کا پُتلا ہی کیوں نہ ہو فرشتہ نہیں ہو سکتا، اس لیے سیرت نگار کا کمال یہ ہے کہ اس کی نظر اوصاف کے ساتھ ساتھ اُن کمزوریوں پر بھی ہو جو انسان کو فرشتہ ہونے سے بچاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ سیرت کشی اور سیرت نگاری کسی کی بھی ہو ایسی ہونی چاہیئے کہ ہم اُس شخص کو بغیر جانے بھی پوری طرح جان سکیں اور اس کے لیے سب سے پہلے اور سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ سیرت نگار اس شخص سے پوری طرح واقف ہو جس سے دوسروں

کو واقف کرنا چاہتا ہے اور کام کی دشواری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

دشواری کی بنا صرف یہی بات نہیں کہ سیرت کشی کے لیے شخصیت کا مکمل علم اور وقوف ضروری ہے اور اس کا حاصل کرنا بڑا دشوار ہے بلکہ بعض اور باتیں بھی ہیں، جو سیرت کشی کے کام کو دشوار اور نازک بناتی ہیں، ان میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ سیرت نگار جب تک اپنے موضوع (یعنی وہ شخص جس کی سیرت لکھنی مقصود ہے) سے جذباتی تعلق نہ پیدا کرے اور جب تک اس کی زندگی کے واقعات اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو شخصی انداز میں نہ دیکھے شخصیت اور سیرت کے اندرونی لطیف نقش نہیں ابھرتے۔ لیکن جذباتی تعلق اور شخصی نظر اور نقطۂ نظر میں جانب داری پیدا ہو جانے کا بڑا خطرہ ہے اور یہی کام کا وہ پہلو ہے، جسے میں نے دشوار اور نازک کہا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے بہت سے ہم عصروں کی سیرتیں لکھی ہیں یہ سیرتیں "چند ہم عصر" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ کتاب میں کل ۲۴ سیرتوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک (پروفیسر مرزا حیرت) مولوی صاحب کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ باقی ۲۳ سیرتوں میں سے کچھ مختصر ہیں۔ اور کچھ طویل، لیکن ہیں سب کی سب مولوی صاحب کے معاصرین کی اور ایسے معاصرین کی جنھیں مولوی صاحب نے قریب سے دیکھا ہے، اور جن کے ساتھ انھیں کسی نہ کسی بنا پر وہی جذباتی تعلق ہے جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ مولوی صاحب کو بھی اس کا احساس ہے کہ اس طرح سیرتیں لکھنے والا جب اس کام کی طرف رُخ کرتا ہے تو وہ ایک سنگلاخ راہ اور پُرخار وادی میں قدم رکھتا ہے۔ اس راہ کی دقتوں اور اس وادی کی دشواریوں کا ذکر انھوں نے "سر سید احمد خاں" کی سیرت میں کیا ہے۔ سر سید احمد خاں کی سیرت ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:

"تصویر جس قدر بڑی، شان دار اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خد و خال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے، جنھوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کار نمایاں کیے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں، ان میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف نہ پیدا کیے) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ ان میں

مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی۔ خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی رائے کے جانچنے کے لیے نیت بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ایک مدت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔

سر سید ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح گزرے ہیں۔ ان کی وفات کو اس وقت پچاس سال سے اوپر ہوتے ہیں۔ . . . . اب نہ وہ عقیدت مندی رہی جو ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے تھے اور نہ وہ مخالف جو ان کے ہر کام کو ریاکاری، خوشامد اور اسلام دشمنی پر محمول کرتے تھے، اس لیے بے لاگ مورخ کے لیے موقع ہے کہ وہ اس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر ان کی زندگی اور ان کے کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائے۔ یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کا اہل بھی نہیں لیکن چوں کہ مجھے کئی سال تک ان کو پاس سے دیکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے اس لیے صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے انھیں کیسا پایا اور وہ کس کردار اور سیرت کے انسان تھے۔"

مولوی صاحب نے اس عبارت میں سیرت نگاری کی جس دقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم عصر کے لیے بے لاگ رائے دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے ضمناً کچھ باتیں ایسی بھی کہہ دی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک سیرت کشی اور سیرت نگاری کے شرائط کیا ہیں، عبارت کے آخری ٹکڑے کے جو اجزا مختلف حیثیتوں سے ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں یہ ہیں:

۱۔ بے لاگ مورخ کے لیے موقع ہے کہ وہ اس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر ان کی زندگی اور ان کے کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائے۔

۲۔ یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کا اہل بھی نہیں۔

۳۔ لیکن چوں کہ کئی سال ان کو پاس سے دیکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے اس لیے صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے انھیں کیسا پایا

وہ کس کردار اور سیرت کے انسان تھے ۔

ان تینوں جملوں میں کئی چھوٹی چھوٹی لیکن اہم باتیں موجود ہیں :

(الف) مورّخ کو بے لاگ ہونا چاہیئے ۔

(ب) اُسے اُس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے ۔

(ج) زندگی اور کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھانی چاہیئے ۔

(د) یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے ۔

(ہ) انھیں کئی سال تک ان کو پاس سے دیکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ۔

(و) صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ میں نے انھیں کیسا پایا (یعنی اُن کی رائے میں ذاتی رنگ ہے ۔)

مولوی صاحب کی لکھی ہوئی سیرتوں کا مطالعہ اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد جو باتیں واضح طور پر پڑھنے والے کے سامنے آتی اور اسے مُتاثر کرتی ہیں وہ یہی ہیں کہ مولوی صاحب نے ان ۲۳ سیرتوں میں اشخاص اور افراد کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وُہ بے لاگ انداز میں کہا ہے۔ اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو حق اور سچ کا پردہ نہیں بننے دیا۔ جس شخص کے متعلق کچھ کہا اُس سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد کہا۔ مشاہدہ نے جو کچھ دکھایا، اُسے مُطالعہ سے تقویت پہنچائی، عہد کی تاریخ اور ماحول کو شخصیت اور سیرت کا آئینہ دار بنایا، مواد کی فراہمی میں محنت اور کاوش سے کام لیا اور اس مُشاہدے، مُطالعہ اور تجزیے کے بعد اشخاص اور افراد کی زندگی اور کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائی۔

مولوی صاحب نے سیرتوں کے مشاہدے، مُطالعے اور تجزیے میں اچھائی اور برائی دونوں پر نظر رکھی ہے اور سیرت کے نقش کو مکمل اور شخصیت کی تصویر کو صحیح بنانے کے لیے دونوں پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ —— ذاتی لگاؤ یا شخصیت کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر برائیوں کے ذکر میں بھی اُسی بے تکلفی، بے باکی اور صفائی سے کام لیا ہے جیسے اوصاف کے بیان میں اور یوں اُن کی سیرتوں میں گو خوبیوں کا رنگ غالب ہے، اور یہ خوبیاں ممدوح کو ہماری نظر میں محبوب بھی بناتی ہیں لیکن ہم یہ کہیں محسوس نہیں کرتے کہ مولوی صاحب کی مدح وثنا قصیدہ بن گئی ہو۔ اس کے برخلاف یہ ضرور ہوتا ہے کہ ہم بڑے سے بڑے آدمی

کا حال پڑھ کر بھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آدمی خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ بہر حال آدمی ہے۔ اس لیے خطا و قصور کے بغیر اس کی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انھیں خطاؤں اور خامیوں سے محبوبی کی شان اُبھرتی اور اُجاگر ہوتی ہے۔

حیدر آباد کے جلسۂ تعزیت میں سید محمود مرحوم پر جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ بھی تھے:

"اس عزیز کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سبق اور حیرت ناک عبرت ہے۔"

---

دوستو! دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی، اسی طرح انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا۔ . . . . . . .

---

عزیز مرزا مرحوم کی خوبیوں کا ذکر کرتے کرتے یہ جملہ لکھا ہے:

. . . . . . لیکن آخر میں حیدر آباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا مگر بے عیب ذات خدا کی ہے . . . . . ."

مولوی سیّد علی مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں:

. . . . . . لیکن جب اُن کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے علم کے مقابلے میں اُن کا عمل بہت ہی کم تھا اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً جفاکش اور علمی کام کی طرف کم راغب تھے دوسرے دکن کی آب و ہوا اور خاص کر یہاں کے حالات اس وقت کچھ ایسے تھے کہ آدمی کرتا بھی ہو تو کچھ نہ کر سکے . . . . . "

اور آگے چل کر کہتے ہیں:

"مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وُہ متلوّن مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے۔ یا حُبِّ جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو اُن کی شان کے شایان نہ ہوتی تھیں۔ . . . . . . . مرحوم اگر اپنے فضل و کمال سے کام لیتے تو بہت بڑے آدمی ہوتے، لیکن افسوس کہ حیدر آباد کی گوناگوں دل فریبیوں نے اور مجبوریوں نے اُن کے وقت

عزیز کا بہت سا بیش قیمت حصّہ غصب کر لیا اور رجاہ طلبی کے بکھیڑوں نے نے وُہ اُلجھاؤ پیدا کیا کہ اس قدر اطمینان نصیب نہ ہوا کہ وُہ علمی مشاغل میں اطمینان کے ساتھ مصروفیت رکھتے جس کے وُہ ہر طرح موزوں اور اہل تھے۔"

اور پھر پوری زندگی پر تبصرہ کر کے اپنی بات کا رُخ ایک اہم اخلاقی نکتے کی طرف موڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسان اگر ٹھنڈے دِل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اُسے معلوم ہو گا کہ وُہ مقاصد جن کے لیے وُہ رات دن سرگرداں و حیراں رہا، وہ آرزوئیں جن کے خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا اور وُہ کوششیں جن کے لیے اُس نے اپنی جان تک کھپا دی، پانی کے بلبلے سے زیادہ نا پائیدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں اور کچھ انھیں کاموں کو بقا حاصل ہے جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور شاید ضمنی طور پر کیے گئے تھے۔"

خواجہ غلام الثقلین کے مختصر حالات میں اُن کے اوصاف کا ذکر اور کارناموں کا بے لوث جائزہ ہے۔ اُس میں یہ جملہ آتا ہے:

"لیکن افسوس کہ کچھ تو اُن کے تلوّن کی وجہ سے اور زیادہ تر کانفرنس کی بے اعتنائی اور مالی دقتوں کی وجہ سے اُنھیں اس صیغے کو خیر باد کہنا پڑا۔"

حکیم امتیاز الدین کی وفات پر ایک خط میں اُن کا ذکر کیا ہے، جو مشکل سے دو صفحوں کا ہے اس کے شروع ہی میں دو جملے آتے ہیں:

"اگرچہ طبیعت کا کم زور اور لااُبالی تھا مگر دوستی کا سچّا اور دُھن کا پکّا ------ اُس میں ہر بات انتہائی تھی۔ محبت تھی تو انتہا درجے کی عداوت تھی تو انتہا درجے کی۔ میانہ روی سے وُہ بالکل آشنا نہ تھا۔"

مولانا وحید الدین سلیم سے مولوی صاحب کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ اُن کے انتقال پر اُنھوں نے لکھا تھا:

"مولانا سلیم کے انتقال سے اُردو ادب کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہو

گئی ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن جیسا ادیب سارے ملک میں کوئی نظر نہیں آتا۔"

لیکن اُن کی بعض کمزوریوں کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

"مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باوجود زبردست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔"

سر سید مولوی عبدالحق صاحب کے نزدیک سب سے بڑے مُصلح ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اُن کے پایے کا انسان اور کوئی نہیں، لیکن ان کی بھی جو بات بُری لگتی ہے اُس کے کہنے میں تکلف سے کام نہیں لیتے۔ نواب محسن الملک کے ذوق کی نفاست اور پاکیزگی کا حال لکھتے لکھتے کہتے ہیں:

"مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سر سید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی یہاں اِس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے اُن کا منشا کیا تھا اور اُن کا خیال کن مصالح پر مبنی تھا، لیکن یہ بلا آئی انھیں دنوں اور انھیں کی بدولت۔"

سر سید نے چندہ لینے کے لیے جو جو جتن کئے، ان کا حال مزے لے کر بیان کیا ہے اور سب کچھ کہہ کر چکنے سے یہ بات بھی لکھ دی ہے:

"اِس چندے سے دوست آشناؤں کی جان عذاب میں تھی۔ خدا اُن کی مغفرت کرے وہ یہ بدعت اپنے پیچھے ایسی چھوڑ گئے ہیں کہ آج تک اِس سے نجات نہیں ملی۔"

مولوی صاحب نے ان مختلف عظیم اور متعدد شخصیتوں کی زندگیوں کا مطالعہ کر کے ان کی سیرت کی ایک واضح، سچی اور مکمل تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اچھائیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُن کی کمزوریوں کا ذکر بھی ضروری تھا جو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے ان کمزوریوں کا ذکر جس سادگی سے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کمزوری کو انسانی فطرت کا ایک لازمی حصّہ جانتے ہیں اور اس لیے یہ ہرگز نہیں سمجھتے کہ کسی کی ایک یا چند کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اُس کے جملہ اوصاف پر پردہ پڑ جاتا ہے

یا ان کارناموں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جو اس شخص نے دوسروں کے لیے انجام دیئے۔ یہ صحیح ہے کہ سیرت نگار کی حق بینی اور راست بازی کا تقاضا ہے کہ وُہ شخصیت کے اچھے پہلوؤں کے ساتھ بُرے پہلوؤں کو بھی نُمایاں کرے لیکن بحیثیت سیرت نگاری کے اس کا منصب یہ بتانا بھی ہے کہ اس نیک شخص کی نیکی کے راستے میں کیا کیا چیزیں حائل تھیں کہ وہ اگر یوں حائل نہ ہوتیں تو اس سے بھی بڑے کام کرتا، جیسے اُس نے کیے۔ یہ بات سیرت نگار میں مشاہدے اور مطالعے کے علاوہ تجزیہ کرنے کی عادت سے پیدا ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی سیرت نگاری کے فن کا سب سے بڑا وصف تجزیہ کر کے صحیح نتائج اخذ کرنے کی یہی عادت ہے۔ اور اس عادت نے اُن کی سیرت نگاری کے ادبی عمل میں کئی صورتیں اختیار کی ہیں۔

ان میں سے ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ بڑی خوبصورتی سے کسی شخص کے اوصاف کو یوں ایک ہی جگہ جمع کر دیتے ہیں کہ چند جملوں میں شخصیت کا نقش اُبھرتا اور اس کے مختلف پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ چند مثالوں سے اُن کے اُسلوبِ سیرت نگاری کی اس خصوصیت کا اندازہ کیجئے:

"وہ ایک پارسا صفت، درویش منش، صوفی مشرب اور بالغ نظر حکیم تھا ----- وُہ اپنے اخلاق، فیاضی اور بے تکلفی کی وجہ سے ادنا اور اعلا ہر طبقہ اور ہر ملّت کے لوگوں میں مقبول تھا۔" (سیّد محمود)

"غرض مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج، کوہِ وقار، عالی خیال شخص تھے۔" (مولوی چراغ علی)

"ایک صائب الرّاے، معتدل مزاج، بے لاگ اور با خلوص کام کرنے والے کا اٹھ جانا غضب ہے۔" (خواجہ غلام الثقلین)

"اُن کا ذہن ایسا رسا، اُن کی طبیعت ایسی حاضر، اُن کے اوسان ایسے بجا اور معاملات اور واقعات پر ایسا عبور تھا کہ بڑے بڑے پیچیدہ معاملات کو باتوں باتوں میں سلجھا دیتے تھے۔" (محسن الملک)

"اُن کی اخلاقی جرأت، آزادیٔ خیال، انصاف پسندی، بے تعصبی، فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مسلمان سب قائل تھے۔" (سر سیّد)

"سر سیّد کی کامیابی کا راز اُن کے اخلاقِ حمیدہ میں تھا۔ اخلاق سے صرف

یہی مراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کرے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جیسا کہ اکثر تعریف کرنے کے طور پر کہا جاتا ہے "مرنج و مرنجان ہو"۔ اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں، عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جراُت (خصوصاً اخلاقی جراُت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رُواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار، انسان کے اصل جوہر ہیں، ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلا ہے یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کے دُکھ، درد کو اپنا دکھ درد سمجھے۔ انتہا یہ کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اِسی سے عبارت ہے"۔ (سرسیّد)

مولوی صاحب اُپنے موصوف اور ممدوح، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ موضوع کی صفات کبھی کبھی تو یکجا کر دیتے ہیں اور کبھی ایک صفت کا ذکر کرتے اور اس کی تائید میں واقعات بیان کرتے ہیں جو ایک قسم کی دلیل کا کام دیتے اور رائے کو موثر اور باوزن بنا دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کئی چیزیں مل جل کر حصہ لیتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"آدمی کو کچھ تو ورثے میں باپ دادا سے ملتا ہے، کچھ تعلیم و تربیت اور ماحول سے اور کچھ اپنی سعی اور ارادے سے"۔

ایک دوسری جگہ یہی بات یوں کہی ہے:

"اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میّسر آتے ہیں"۔

مولوی صاحب جب ماحول کہتے ہیں تو اُن کے ذہن میں کسی شخص کی گھریلو زندگی سے لیکر اُس کے عہد کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کے تمام پہلو ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پہلو کبھی بالواسطہ اور کبھی براست اشخاص کی سیرت کی تشکیل و تعمیر اور ان کے سوچنے اور کام کرنے کے انداز پر اثر ڈالتا ہے اور یہ اثر اکثر صورتوں میں مُستقل اور مستحکم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے جب کسی سیرت کی مُصوّری کا ارادہ کیا ہے تو اس کی سیرت اور شخصیت کے نقش کو سُلجھانے کے لیے ان میں سے ہر چیز سے حسب ضرورت کام لیا ہے،

مثال کے طور پر جب اُنھوں نے مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، مولانا حالی، سر راس مسعود، اور سرسید جیسی شخصیتوں کی سیرت کشی پر قلم اٹھایا ہے تو بڑی وضاحت سے پہلے غدر کے بعد کے مسلمانوں کے سیاسی، قومی اور معاشرتی زندگی کے اہم جذبات کو سیرت شناسی کا آئینہ بنایا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ہے (مثلاً سید علی بلگرامی، مولانا محمد علی، سرسید) وہاں خاندانی حالات کی تفصیلات درج کی ہیں لیکن سب سے زیادہ یہ کہ شخصی اوصاف کو نمایاں کرنے کے لیے اُنھوں نے عموماً ایسے واقعات سے مدد لی ہے جو اُن کے اپنے مشاہدے میں آئے تھے، ان واقعات کے مطالعے کے بعد جو بات پڑھنے والا ہر جگہ محسوس کرتا ہے، یہ ہے کہ مولوی صاحب نے واقعات کے انتخاب میں بڑی دقتِ نظر، باریک بینی اور نفاستِ ذوق سے کام لیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ واقعات سیرت نگاری کے مقصد میں ممد ثابت ہونے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے انبساط کا سرمایہ مہیا کرتے ہیں واقعات کے بیان میں جو دو چیزیں باقی دوسری چیزوں پر غالب ہوتی ہیں، ایک اُن کا رنگِ صداقت اور دوسری اُن کی شگفتگی جو بیان کی سلاست اور قدرت سے پیدا ہوتی ہے۔ ان واقعات میں سے بعض کی حیثیت محض لطیفوں کی ہوتی ہے، اور وہ اسی لیے موثر ہوتے ہیں کہ ان میں لطیفے کی لطافت اور نزاکت موجود ہے، لیکن جو بات اس لطیفے پن سے بھی زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ یہ لطیفہ سچائی کے نقش کو اتنا نمایاں کرتا ہے کہ شاید کوئی اور چیز نہ کر سکتی۔ اس طرح کے دو لطیفے سن لیجئے:

مولوی سید علی بلگرامی اپنے ایک دوست کو تمدنِ ہند کا وہ باب سُنا رہے تھے جس میں دراوڑی قوم کا ذکر تھا۔ باب سن کر دوست نے سوال کیا کہ یہ قوم ابھی باقی ہے؟ اتفاق سے اس وقت ایک مولوی صاحب ملنے آئے تھے۔ وہ پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارے سے بتایا کہ یہ حضرت اُسی قوم کی یادگار ہیں۔

بمبئی کا ذکر ہے کہ ایک باورچی نواب صاحب کا نام سن کر حاضر ہوا، نواب صاحب نے پوچھا، کیا کیا پکانا جانتے ہو؟ کہنے لگا "چپاتی اور قورمہ" نواب صاحب نے کہا "بس!" اس نے جواب دیا "اصل کھانا تو یہی ہے، باقی سب نوابوں کے نخرے ہیں"۔

اس طرح کے لطیفوں کا مقصد عموماً تو یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ سیرت کے کسی پہلو کی وضاحت ہوتی ہے، لیکن کبھی کبھی مولوی صاحب یہ لطیفے بیان میں لطف اور سیرت کشی

کی فضا میں حق و صداقت کا رنگ بھرنے کے لیے سُناتے ہیں۔ ان لطیفوں کا اور ان کے علاوہ اُن واقعات کا جو سیرتوں کی وضاحت کے سلسلے میں بیان کیے جاتے ہیں ایک اہم معاشرتی بلکہ تہذیبی پہلو یہ ہے کہ ان سے ایک خاص عہد اور یہ عہد مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، کی معاشرتی اور مجلسی زندگی کی تصویریں ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ مولوی صاحب نے جن مُقتدر شخصیتوں کا ذکر کیا ہے وہ سب غدر کے بعد کی سیاسی معاشرتی، تہذیبی، علمی اور ادبی زندگی کی عمارت میں ایک ستون کی حیثیت رکھتی تھیں اور تہذیبی انحطاط کے ایک نازک دور میں ان کے عمل اور کردار سے تہذیب کو ایک نئی زندگی مل رہی تھی۔ یہ سب شخصیتیں اس زندگی کی قدروں کے رکھوالے اور پاسبان ہیں۔ خود مولوی صاحب بھی انھیں قدروں کی آغوش کے پُروردہ ہیں اس لیے جب اُن کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیتے ہیں اور یوں سیرتوں کا یہ مجموعہ ہماری تاریخ کے ایک اہم عہد کی تہذیبی زندگی کا آئینہ بھی بن جاتا ہے۔

سر راس مسعود کے حال میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ۱۸۹۷ء کے سالانہ جلسے کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے:

"اس زمانے میں کانفرنس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ لوگ بڑے شوق اور رغبت سے آآکر شریک ہوتے تھے۔ یوں تو ہر صوبے کے لوگ ہوتے تھے لیکن پنجاب اور یوپی والے کثرت سے نظر آتے تھے۔ شوق اور رغبت کی وجہ تھی۔ ایک تو سر سید اس وقت زندہ اور سلامت موجود تھے۔ ان کی تقریریں اور باتیں سننا تو ایک طرف اُن کی زیارت کر لینا ہی بڑی بات تھی، اُن کا بھاری بھرکم جُثّہ، پُررعب چہرہ، اُن کی شان اور ان کا وقار ایسا تھا کہ درحقیقت وہ زیارت کے قابل تھے، جب وہ ہال میں آتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جہاز آرہا ہے، دوسرے مولانا حالی کی دل ہلا دینے والی نظمیں، مولانا شبلی کے عالمانہ مضامین، مولانا نذیر احمد کی دھواں دھار، اور پُرلطف تقریریں روز روز کہاں سننے میں آتی ہیں۔ یہ موقع نصیبوں سے مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی نواب محسن الملک بھی آنکلتے تھے اور اپنی خوش بیانی سے سب کو رِجھا جاتے تھے۔ مولوی نذیر احمد کا لکچر سر سید آخری دن رکھتے تھے تاکہ لوگ جانے نہ پائیں، اور واقعی لوگ اس کے انتظار میں برابر جمے رہتے تھے۔ ان کے لکچر کے دن سننے

والوں کا ایسا ٹھٹھ لگ جاتا کہ تِل رکھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں بہت سے ذی علم، باوضع اور نامور لوگوں سے ملنے کا موقع مل جاتا، جو یوں برسوں نصیب نہ ہوتا۔ غرض یہ بڑی پُرلطف صحبت ہوتی تھی اور شرفار کا بڑا اچھا مجمع ہوتا تھا۔"

مولوی عبدالحق کو نہ جانے ایسی کتنی پُرلطف صحبتیں دیکھنے اور ان میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے۔ اُنھوں نے سیرتوں کے ذریعے ان کی یاد تازہ بھی کی ہے اور اِسے آئندہ کے مورّخ کے لیے محفوظ بھی کیا ہے۔

یہ سیرتیں مولوی عبدالحق کے صحیح مشاہدے اور گہرے تجزیے کا عکس ہونے کے علاوہ ان کی فکری بصیرت، تنقیدی نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی کا نچوڑ بھی ہیں۔ مولوی صاحب سیرتوں کا ذکر کرتے ہوئے جب اُفراد کے ماحول پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں اسی ماحول میں بہت سی ایسی باتیں نظر آتی ہیں، جو انسان کے لیے نصیحت کا آئینہ اور عبرت کا مرقع ہیں۔ مولوی صاحب نے ایسی چیزوں کو دیکھ کر زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کے مُتعلق اپنی ذاتی رائیں قائم کی ہیں۔ ان رایوں میں ہر جگہ مشاہدے تجربے اور فکر کا رنگ شامل ہوتا ہے، اور اس رنگ کو مولوی صاحب کی انفرادیت اور زیادہ تیکھا اور روشن کرتی ہے، چنانچہ جب سُننے والا واقعات کے ضمن میں یہ چلتے ہوئے فقرے سُنتا ہے تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ انھیں حرزِ جان بنائے۔ ایسی چند مثالیں سُن لیجئے:

"انسان کی اصل ترقی دماغی قوت پر منحصر ہے۔ دولت اس کی محض معین ہے انسان کی رُوح کو اگر ایک گاڑی تصور کیا جائے تو یہ جوڑی اس کی کھینچنے والی ہے، لیکن اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہے۔ تو یہ زمین تو کیا فلک الافلاک تک پہنچ جائے گی۔ لیکن خدانخواستہ اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ سے چھین لی گئی تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔" (سیّد محمود)

---

"کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلا قابلیت کا ہونا ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہے گی اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو اس کی ترقی شاہ راہِ تمدن پر بہت سُست ہوگی۔" (مولوی چراغ علی)

" بیرونی امداد بڑی کار آمد اور مفید چیز ہے، بشرطیکہ دلوں میں شوق اور جوش اور ہمت ہو، لیکن اگر کوئی چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لیے سب کچھ ہو جائے تو محض خیالِ خام ہے۔" (مولوی چراغ علی)

---

" کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محبت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔" (خواجہ غلام الثقلین)

---

" اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ہر کوئی اس کی قدر نہیں کر سکتا اس لیے شریف رونا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔" (گدڑی کا لال)

---

" سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں۔ بعض وقت اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔" (گدڑی کا لال)

---

" انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے، تو مذہب کی پناہ ڈھونڈھتا ہے۔" (محسن الملک)

---

" بے تعصبی کا وصف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔" (حالی)

---

" شہرت وہ بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔" (حالی)

---

" سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔" (نام دیو، مالی)

کام اسی وقت ہوتا ہے، جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں، بیگار ہے۔ (نام دیو مالی)

---

عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے، آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔ (نام دیو مالی)

---

نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے، جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔ (نام دیو مالی)

---

درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ (نام دیو مالی)

---

ان سیرتوں میں پڑھنے والے کے لیے فائدے کی ایک بہت بڑی بات یہ ہے۔ کہ مولوی صاحب نے ہر سیرت سے کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہ نتیجہ قاری کے لیے ہمیشہ یاد رکھنے والا سبق ہے:

شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ ہے۔

(سید محمود)

---

اس عزیز کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سبق اور حیرت ناک عبرت ہے۔ (سید محمود)

---

اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے..... ان کی زندگی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ان کے کارنامے جوانان ملک کے لیے دلیل راہ کا کام دیں گے۔

(مولوی چراغ علی)

"جو لوگ یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں انھیں مولوی چراغ علی مرحوم کی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیئے اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زمینِ شور میں قبلہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ انھیں مولوی چراغ علی مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے نتائج اب تک بار آور ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جائیگا۔"

(مولوی چراغ علی)

"انسان نہیں رہتا، لیکن اُس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اُس کی پونجی، یہی اُس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ انسان کا نام اُس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں، بلکہ ان کے کیریکٹر اور کام کی وجہ سے اور ہم کیا یاد کر رہے ہیں، ان کا کیریکٹر اور ان کا کام خود ہمیں ان کی یاد دلاتا ہے۔"

(مولوی چراغ علی)

"انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ تکمیل کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنھیں بقائے دوام ہو، اور خلقِ خدا کو ان سے فائدہ پہنچے، وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی بھی قدر نہیں کرتا، اور قدر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دُنیا میں نہیں رہتا، مگر اُس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو، جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں، اور لوگ کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں۔"

(عبد علی بلگرامی)

"غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے

ہیں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔" (نور خاں)

---

"مجھے وُہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال اُن کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ وُہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے!"

---

یہ اخلاقی نتیجے مولوی صاحب نے بالکل ایسے نکالے ہیں جیسے ہر وہ شخص نکالتا ہے جسے اپنی رائے پر اعتماد اور اپنے خیال پر بھروسہ ہوتا ہے۔ ان نتیجوں میں ہر جگہ ایک شخصی اور انفرادی رنگ ہے۔ اس شخصی اور انفرادی رنگ میں جذبے کی جو ہلکی سی جھلک ہر جگہ موجود ہے اسی نے ان نتیجوں کو ہر مخاطب کے لیے ایسا بنایا ہے جیسے وُہ اس کے دل کی بات ہو۔ ان کی تاثیر میں ایک ہمیشہ باقی رہنے والی کسک ہے اور یہ کسک رائے کے خلوص کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ یہ خلوص مولوی صاحب کے سیرت نگاری کے فن اور اس کے ہر پہلو پر پوری طرح چھایا ہوا ہے چنانچہ اشخاص اور افراد کی زندگیوں پر بے لوث تبصرہ کرتے ہوئے جب اُنھوں نے ان افراد اور اشخاص کے ماحول کا پس منظر پیش کیا ہے تو اس میں ضمنی طور پر زندگی کے بعض اجتماعی پہلوؤں، بعض اداروں اور بعض گروہوں کا ایسا ذکر آگیا ہے جن سے ان کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے تبصروں کے دو ایک نمونے دیکھیے ——

ایک جگہ ریاستوں کے متعلق اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"ریاستوں میں نوکری کرنا اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں، وہاں سازشوں ترغیبوں اور پیچیدگیوں کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تیز نظر اور ہوش مند بھی پھنسے بغیر نہیں رہ سکتے اگر کچھ کرنا ہے تو دانستہ یا نادانستہ، بالواسطہ یا بلا واسطہ پھنسنا ہی پڑتا ہے۔"

---

"ریاستوں میں دوگونہ مصیبت ہوتی ہے۔ ایک اندرونی، دوسری بیرونی۔۔ ۔۔۔۔ خود مختار ریاستوں میں ایک بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سازشوں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ ہر شخص کی (خواہ وُہ کوئی ہو) یہ کوشش ہوتی ہے

کہ کسی نہ کسی طرح "سرکار" کو خوش کر لیا جائے۔ جس سے "پیا" خوش اسی کا راج اس سعی میں رقابت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا ہے، اس کش مکش میں کذب و افترا، بہتان، مُخبری غرض کوئی ایسی کمینہ حرکت نہیں ہوتی جو حریف ایک دوسرے کے خلاف کام میں نہ لاتے ہوں۔ یہ ایک عجیب اسرار ہے جس کا سلسلہ شاخ در شاخ دور دور پہنچتا ہے اور عجیب رنگ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔"

"شخصی سلطنتیں سازش کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھلتی پھولتی ہے۔"

ریاستوں سے آگے بڑھ کر حکومتوں کے عام انداز پر یوں مختصر طور پر تبصرہ کیا ہے:

"قصرِ حکومت کے راستے ایسے پیچ در پیچ اور اس میں اتنی بھول بھلیاں ہیں کہ ان میں داخل ہو کر نکل آنا بڑے شاطر کا کام ہے۔"

زوال یافتہ قوموں کا حال کیا ہے:

"زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے، وہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اُٹھتے ہوئے کو بٹھانا چاہتے ہیں، اس میں انھیں خوشی ہوتی ہے، کُبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کبڑا دیکھنے سے اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اُن کے خیال میں شاید مساوات کا یہی تقاضہ ہے۔"

ایک جگہ انگریزوں کی ذہنی کیفیت کا ذکر بڑے چلتے ہوئے انداز میں لیکن بے لوث یقین اور اعتماد کے ساتھ یوں کیا ہے:

"سلطنت اُنھوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ مسلمانوں سے بدگمان تھے اور بدگمان رہے انھوں نے ابتدا میں جس مکر و فریب، جعل سازی، اندرونی سازشوں اور حکمتوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس سے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔"

افراد، اشخاص، جماعتوں اور اداروں کے متعلق مولوی صاحب نے ان مضامین میں جو رائیں ظاہر کی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ ان کی نجی اور شخصی رائیں ہیں اور نجی اور شخصی رایوں کے اظہار میں ہمیشہ جذبے کے رنگ کی جھلک کا نمایاں ہونا ضروری ہے، اظہارِ رائے میں جذبے کا یہ رنگ اکثر بڑا معتدل اور متوازن رہا ہے۔ مولوی صاحب نے اسے بڑی خوبی سے سنجیدہ فکر میں سمویا اور ایک ایسا نکھرا ہوا اور واضح رنگ پیدا کیا ہے جو کسی کی نظر میں نہیں چبھتا۔ جذبے کی لہر کے باوجود فلسفیانہ بے تعلقی اور غیر جانبداری ان رایوں کی ایسی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ان میں وزن اور وقار پیدا ہوا ہے۔ ان رایوں میں احساس و فکر کا یہ ملا جلا بلکہ سمویا ہوا رنگ مولوی صاحب کی شخصیت اور مزاج کی بعض خصوصیتوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اظہارِ حقیقت میں راست بازی اور پیرویٔ حق کا پورا احساس، حق گوئی میں جرأت اور بے خوفی، افراد کی شخصیتوں کی مصوری اور عکاسی کرنے سے پہلے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونے اور اس واقفیت کی خاطر مطالعہ، تحقیق، جستجو اور معتبر اور مستند وسائل سے مدد لینے کی کوشش، فراہم شدہ مواد کا تجزیہ کرنے اور نتائج تک پہنچنے کے لیے استدلال کرنے اور علت و معلول کا رشتہ قائم کرنے اور پھر اپنے نتائج کو دوسروں کے سامنے لاتے وقت احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی عادت اس سادگی پسندی، شگفتہ طبع اور رنگین اور بردبار سیرت نگار کے مزاج کی بعض خصوصیتیں ہیں جن سے کام لے کر اس نے اپنے عہد کے اکابر اور بعض اوقات نسبتاً غیر معروف اشخاص کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ان لوگوں کی سیرتوں کا ایسا نقش ابھرتا ہے کہ وہ سب کے سب ہمارے لیے جانے پہچانے لوگ بن جاتے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا یہ کرشمہ سیرت نگاری کی شخصیت اور مزاج کے ان عناصر کا ہے جو اس اہم کام کے مختلف مرحلوں پر اپنا اثر ڈالتے رہے اور اس میں شبہہ نہیں کہ مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب میں مزاج کے ان عناصر کو بڑا دخل ہے لیکن جہاں تک ان سیرتوں کی تاثیر اور دل نشینی کا تعلق ہے ان کا ایک اہم اور بعض حیثیتوں سے بنیادی پہلو ان کا وہ اسلوب ہے، جن میں یہ سیرتیں لکھی گئی ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ان سیرتوں کی بنیاد ہی حقیقتوں اور صداقتوں پر ہے اور صداقتوں کے اس ذکر سے پڑھنے والا طرح طرح کے خوش گوار تاثر قبول کرتا ہے۔ لیکن دیکھنے کی چیز اصل میں یہ ہے کہ یہ خوش گوار تاثر جہاں ایک طرف موضوع کی اہمیت اور سچائی کا پیدا کیا ہوا ہے وہاں ان کی تخلیق میں اس اسلوب کو بھی بڑا دخل ہے جس میں یہ حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ یوں مولوی عبد

نے صداقت اور سادگی بیان میں لازم و ملزوم کا رشتہ قائم کیا ہے اور واقعہ نگار اور اس سے بھی بڑھ کر سیرت نگار کو یہ سبق سکھایا ہے کہ تکلّف، تصنع اور عبارت آرائی سچ اور اس کی تاثیر کے دشمن ہیں، بات سیدھی، صاف، سلیس روزمرہ میں کہی جائے تو سب سے زیادہ اثر کرتی ہے۔ لیکن سادگیٔ بیان لکھنے والا اس لیے اختیار نہیں کرتا کہ بیان کا یہ طرز آسان نہیں ہے۔ اسے اختیار کرنے کا سبب اُس کے نزدیک یہ ہے کہ اس کے فنی مقصد میں پوری کامیابی اسی راہ پر چل کر ہوتی ہے۔

سادگیٔ بیان کے متعلق مولوی صاحب کے جو خیالات ہیں، ان کا اظہار سرسیّد کی سیرت میں ایک جگہ ان الفاظ میں ہوا ہے:

"سادگی و پرکاری کمالِ صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیئے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطفِ بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوعِ تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے۔ جسے اپنے فن یا علم پر کافی عبور ہو۔ وُہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرزِ بیان کے ذریعے عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابلِ فہم اور دل کش ہو جاتا ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وُہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ تحریر اور تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تضیع اوقات ہے ...... اثر رنگین عبارت، مُقفّیٰ مُسجّع جملوں، تشبیہوں اور استعاروں کے ایچ پیچ سے نہیں پیدا ہوتا۔"

اُسلوب کی سادگی کے متعلق مولوی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سب کے سب اُن کے اسلوب پر صادق آتے ہیں، اس عبارت کا تجزیہ کیا جائے تو اس سے کئی واضح نتیجے نکلتے ہیں:

(۱) ادیب کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ موضوعِ تحریر سے مکمل واقفیت حاصل کرے۔

(۲) اُس کے کام کی دوسری منزل اور اُس کا فنّی مقصد یہ ہے کہ لوگ اس کی کہی ہوئی بات

کو سمجھیں اس سے اثر قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔

(۳) یہ سب باتیں رنگین، مسجّع، مقفیٰ اور پیچ در پیچ مثالوں سے پیدا نہیں ہوتیں

(۴) سادہ اور سلیس زبان اظہار کا بہترین اسلوب ہے۔

(۵) سادہ اور سلیس اسلوب میں بھی پُرکاری اور کمال صناعی کا وصف لازمی ہے، اس لیے کہ لطفِ بیان اور اثر میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔

بہ حیثیت ادیب اور اس جگہ یوں کہنا چاہیے کہ بہ حیثیت سیرت نگار مولوی صاحب نے اپنے کام کی پہلی شرط جس خوبی سے پوری کی ہے، اُس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس شرط کو بہ کمال و تمام پورا کرکے جب وہ بیان و اظہار کی طرف رجوع ہوئے ہیں تو انہوں نے رنگینیٔ بیان سے بے تعلقی اختیار کرکے سادگی اور سلاست کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے اور جیسا کہ ہمارے علم میں ہے کہ یہ رشتہ جوڑ کر بلا شبہ وہ اس مقصد میں بھی کامیاب ہوئے ہیں کہ جو کچھ وہ کہیں اُسے لوگ نہ صرف سمجھیں بلکہ اس سے اثر قبول کریں اور لطف اُٹھائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سادگی و سلاست نے پُرکاری اور خود بقول مولوی صاحب کے "کمال صناعی" کے یہ تقاضے کس کس طرح پورے کیے ہیں۔

بات بغیر کسی تکلّف اور تصنّع کے انتہائے سادگی سے کہہ دی جائے تو وہ کتنی موثر ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے اس کے اندازے کے لیے چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

مولانا وحید الدین کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ مگر بڑی سادہ طبیعت کے آدمی تھے، مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ اُن کے دامن پر نہ تھا جو جی میں آتا ہے کہہ بیٹھتے تھے جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے ہیں۔ جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ہونے کے سیاسیات کا ذوق نہ تھا، اسی طرح باوجود زبردست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یہ ذاتی چیز ہے اسے علم و فضل سے کوئی واسطہ نہیں۔"

---

"اچھے برے ہر قوم میں ہوتے ہیں، شریف افسر، خاں صاحب کی سچائی، دیانت اور جفاکشی کی بہت قدر کرتے تھے اور ان کو اپنی اردلی میں رکھتے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے سر میں خناس سمایا ہوا تھا۔" (گدڑی کالال)

"مرحوم ہماری تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی، چہرے سے شرافت ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔" (حالی)

"مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری بڑی مشقت طلب، ٹیڑھی اور کٹھن خدمت تھی جو اچھے بھلے آدمی کو دیوانہ بنا دے اور بڑوں بڑوں کو ناک چنے چبوا دے، اس میں ہاتھ ڈالنا بلا مبالغہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سید احمد خاں کی روح نے مسعود کے دل پر القا کیا کہ پھولوں کی سیج کو چھوڑ کر کانٹوں بھری گدی قبول کر لی۔" (راس مسعود)

"دوسروں سے کام لینا خوب جانتے تھے۔ یہ سلیقہ میں نے یا تو نواب محسن الملک میں دیکھا یا مسعود میں، اُن کے مددگار یا اہل کار خوشی خوشی کام کرتے تھے، جیسے کوئی اپنا کام کرتا ہے، کام کرنے والوں کی قدر بھی کرتے تھے، اور انہیں فائدہ پہنچانے کی تاک میں رہتے تھے، وہ اپنے دوستوں سے خوب پھسلا کر کام لیتے تھے۔ دوسروں کے کام نکالنے اور فائدہ پہنچانے میں بڑے دلیر تھے۔ وہ جھگڑ کر، خوشامد سے، چاپلوسی سے غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے اس طرح اُنھوں نے سینکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا، اپنا کام نکال لینے کا بھی خوب ڈھب یاد تھا، ایک تو اُن کی ذاتی وجاہت دوسرے وہ خوش تقریر ایسے تھے کہ جو کہا منوا لیا۔ اسی وجہ سے اُنہیں حیدر آباد اور علی گڑھ میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔" (سید راس مسعود)

چند ہم عصر کی سیرتوں میں سے کوئی سیرت اُٹھا کر پڑھ لیجئے اور اس کا جو سا

حصہ جی چاہے پڑھ لیجیے معلوم ہوتا ہے، سیرت نگار نے بڑی سے بڑی بات، اہم سے اہم حقیقت اور گہرے سے گہرا نکتہ عام بول چال کی زبان میں بڑی سلاست اور روانی سے کہہ دیا ہے اور کہا ایسے چچے تلے انداز میں ہے کہ جو بات جن لفظوں میں کہی گئی ہے، وہی اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ یہی چیز وُہ قادر الکلامی ہے جس کی طرف مولوی صاحب نے خود اشارہ کیا اور جسے موثر بیان کا لازمہ بتایا ہے۔ بیان کی اِسی تاثیر اور قادر الکلامی کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ بات سادہ اور آسان لفظوں میں کہی جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ اس میں محاورے اس بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں، جیسے اسی موقع کے لیے وضع ہوتے ہیں جہاں ان سے کام لیا گیا ہے۔ چھوٹی سی عبارت میں پے بہ پے کئی محاورے آتے ہیں، اور بات میں ذرا بھی تکلف نہیں پیدا ہوتا۔ یہی الفاظ، ترکیبیں اور محاورے ہیں کہ جب کوئی دُوسرا استعمال کرتا ہے تو ان میں ایک فرسودہ سی محسوس ہوتی ہے اور وہی ہیں کہ جب مولوی صاحب استعمال کرتے ہیں تو ان میں جان پڑ جاتی ہے اور پڑھنے اور سُننے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ہم اس لفظ، اس ترکیب اور اس محاورے کے صحیح مفہوم اور مصرف سے نا آشنا تھے۔ اُوپر کی مثالوں میں سے دو ایک کی یہی کیفیت ہے۔ بعض ٹکڑے اور دیکھیے:

"بڑے بڑے ماہرینِ فن اور اُساتذہ ان کے فیصلوں کو دیکھ کر عش عش کرتے ہیں، اور حیرت کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تیرہ خاک میں بھی ایسے ایسے قابل جوہر پیدا ہوتے ہیں۔" (سیّد محمود)

"وُہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلا درجے کا مقرّر تھا۔ لیکن جب لکھنے اور بولنے پر آ جاتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اُوجھل ہو جاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور روڑے بھی بے تکلف چلے جاتے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دُشمن تھا، لیکن اگر کبھی اُس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وُہ محبت و مروّت کا پُتلا تھا، اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اُوقات ذرا سی بات پر اس قدر

آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔"

(مولانا محمد علی)

ان عبارتوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ لفظ، ترکیبیں اور محاورے ان کے تابع فرمان اور حلقہ بگوش ہیں، جس لفظ، ترکیب اور محاورے کو جب چاہیں اور جہاں چاہیں طلب کرلیں۔ وہ دست بستہ حاضر ہوتا اور بات کہنے کی وہ خدمت انجام دیتا ہے جس سے سادگی اور تاثیر ہم معنی بنتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی عبارت میں متین، باوقار، پُرشکوہ فارسی اور عربی لفظوں کے شانہ بہ شانہ ایسے لفظ بھی آراستہ و صف بستہ نظر آتے ہیں جنھیں دوسرے ادیب ٹھیٹھ روزمرہ اور بولی ٹھولی کے لفظ سمجھ کر قابلِ اعتنا نہیں گردانتے۔ گپ شپ، ٹھٹول، بھیڑ چال، بندھن گھنگا لنا، ڈھے جانا، ڈھل جانا، بھاویں، کاٹ کباڑ، چٹیک، پتال، دھڑے بندی، لچر، مٹوہ، کھکیڑ، بھاگوان، گھٹی، شوربور، بندربانٹ، مُنہ بھرائی، ان کی عبارتوں میں بے تکلفی اور روانی سے اور لطف و تاثیر کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

لفظوں کی قدر و قیمت اور معنوی اہمیت کا مولوی صاحب کو جو صحیح اندازہ ہے، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب وہ ہندی کی ٹھیٹھ روزمرہ کو فارسی اور عربی کی عدد درجہ ثقہ ترکیبوں میں ملا کر اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ دونوں ایک ہی ٹکسال کے سکے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک جملہ سنیئے ——

مولوی چراغ علی کے متعلق لکھتے ہیں:

"تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہہ تک پہنچتے اور اس کے مالہ و ماعلیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے۔"

اُردو کے اس کمال کو کہ وہ ہر زبان کے لفظ کی غیریت اور بے گانگی کو مٹا کر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، ہمارے بہت کم ادیبوں نے سمجھا اور پرکھا ہے۔

مولوی صاحب کی عبارت کی اہمیت اس بات میں بھی ہے کہ انھوں نے اُردو کی اس خصوصیت سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور بہت سے غیر معروف اور بعض اوقات غیر مانوس لفظوں کو برت کر ان کی معنوی قدر و قیمت واضح اور متعین کی ہے۔

مولوی صاحب کی عبارتوں کے متعلق عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے (اور یہ بات سرسیّد اور حالی کے متعلق بھی کہی گئی ہے) کہ ان کی سادگی موثر ہونے کے باوجود ادبی چاشنی اور شگفتگی سے خالی اور عاری ہے۔ معلوم نہیں اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، اس لیے کہ بات سلیس اور سادہ ہو کر بھی موثر اور دل نشین ہے تو اس سے بڑھ کر ادبیت اور کیا ہوگی۔ لیکن ہماری زبان میں انشا پردازی اور رنگینیٔ بیان سے کام لینے کا اتنا رواج ہے کہ پڑھنے والا ہر جگہ اس کی تلاش کرتا ہے اور جب نہیں ملتی تو شکایت کرتا ہے۔ یہی شکایت سرسیّد اور حالی کی عبارتوں کی طرح لوگوں کو (ایک خاص طرح کے لوگوں کو) مولوی صاحب کی عبارتوں کے مطالعے کے بعد بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب نے جہاں کہیں اُردو انشا پردازی کی روائتی اسلوب کا راستہ اختیار کیا ہے۔ وہاں بھی طرح طرح کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ دو چار مثالوں سے اُن کے اسلوب کی اس خصوصیت کا اندازہ بھی کیجئے:

"شہرت، دولت اور حکومت، جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے۔ اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے، وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے ــــ"

"یہ شیر بیشۂ عزلت کہا کرتا تھا "کیا حاصل ہے شہرت سے؟"

"تاروں بھری رات کو جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں، تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا؟ جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر وسیع سطح اور بے چین موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے قلب پر عجیب و غریب کیفیت پیدا نہیں ہوتی؟"

(سید محمود مرحوم)

"اُن میں پارس پتھر کی خاصیت تھی، کوئی ہو کہیں کا ہو اُسے چھوا نہیں اور کندن کا ہوا نہیں۔"

اس طرح کی ادبیت طبیعت کی بشاشی اور شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے اور یہی بشاشت اور شگفتگی ہے کہ کبھی کبھی ظریفانہ جملوں کا روپ اختیار کرتی اور دوسروں کو بھی بشاش اور شگفتہ بناتی ہے۔ مولوی صاحب کی عبارتوں میں بھی یہ جا بجا سنجیدہ ظرافت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے اور جہاں ظاہر ہوئی ہے اپنے ایجاز اور اختصار کے باوجود ایک دیرپا اثر کی حامل ہوئی ہے چند جملے اس طرح کے بھی سن لیجئے:

"سرکاری وظیفے سے ولایت گئے جہاں انھوں نے کوئی امتحان نہیں دیا سوائے ڈگری حاصل کرنے کے اور ایسے ڈگری یافتہ خیر سے ہمارے ملک میں سینکڑوں ہیں۔" (سیّد محمود)

"وہ اپنے فلسفہ اور خیالات میں، خواہ باد ہوائی کیوں نہ ہوں، مگن ہیں۔"

"مطالعے سے بیحد شغف تھا۔ گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔۔۔۔ انتہا ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔" (مولوی چراغ علی)

"مصلحتِ وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی بدنصیبی سے اُنھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیئے اور کچھ صحبت اور تجربہ ان میں سے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔" (مولوی وحید الدین سلیم)

"دوسرے روز مقبرے میں آئے۔ باغ کا رجسٹر منگوایا اور نور خاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اُٹھتے۔" (گدڑی کا لال)

ریاستوں کا حال لکھتے لکھتے کہتے ہیں:

"یہ تو ہوئی ایک مصیبت اور اندرونی۔ اب بیرونی۔ مصیبت کا حال سُنیئے

جو بیرونی ہے۔ والیٔ ریاست اپنے علاقے کا حاکم با اختیار ہے، سیاہ سفید کا مالک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک ایسی "چیز" لگی ہوتی ہے جس کے سامنے سارے اختیارات دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب وغریب شخص ہوتا ہے۔ نہ صاحبِ اختیار ہے، نہ صاحب جاہ ومنصب۔ نہ غیر معمولی قابلیت اور ذہانت رکھتا ہے، لیکن سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے۔ یہ رزیڈنٹ بہادر ہیں۔ راج پاٹ تو "حضور" کا ہے لیکن اس کنکوے کی ڈور "صاحب عالی شان بہادر" کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔" (محسن الملک)

"بسم اللہ پڑھانے کے لیے جھنجھانے سے ایک دقیانوسی مولوی (پیر فراست) بلائے گئے تھے۔" (سر سید راس مسعود)

"میرن صاحب باتیں مزے لے لے کر اور ٹھیر ٹھیر کر کرتے تھے۔ جلدی اُن کے مزاج میں نہ تھی اور نہ ان کو اس کی ضرورت تھی۔ شاید غدر میں بھاگتے وقت اس کی ضرورت پڑی ہو تو پڑی ہو۔ ورنہ یوں عام طور پر زندگی کے کاروبار میں انھیں اس "شیطانی حرکت" یعنی تعجیل سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔" (میرن صاحب)

"اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے پُرتگالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی، لیکن اس کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پُرتگالی ہندوستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے، ان دونوں مقصدوں کے حصول میں اُنھوں نے بڑے ظلم وجبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دوغلے مرد وزن باقی رہ گئے ہیں۔" (سید حسین بلگرامی)

سیرت نگاری کے اسلوب میں بنیادی طور پر سادگیٔ بیان سے مدد لینا، اس سادگی اظہار میں لفظوں اور محاوروں کو ان کی صوتی اور معنوی اہمیت اور قدر و قیمت کے لحاظ

سے استعمال کرنا غیر معروف اور غیر مانوس لفظوں سے مفہوم کے نئے رُخ اور گوشے پیدا کرنا سادگی کو تکلف اور تصنع سے محفوظ رکھتے ہوئے بھی اس میں ادبی شان پیدا کرنا۔ مزاج کی چاشنی سے تنقید و تبصرے کو دل نشین اور قابلِ قبول بنانا مولوی صاحب کے طرز کی چند خصوصیات ہیں۔ یہ خصوصیات بدیہی طور پر مُصنّف کی شخصیت اور اس کے مزاج کا پَرتو ہیں۔ مزاج کا یہی عکس اور پَرتو ہے جس نے مولوی صاحب کی سیرت نگاری میں متانت اور وقار کی شان بھی پیدا کی ہے اور سیرتوں کے بیان کو پسندیدہ اخلاق اور اعلیٰ و اَرفع انسانیت کی قدروں کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے کا وسیلہ بھی بنایا ہے۔ سیرت نگار کے ذہنی خلوص اور دیانت داری، اُس کی حق پسندی اور حق گوئی اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کی چشمِ بینا اور دلِ دانا کی رہنمائی کی بدولت یہ سیرتیں شخصیتوں کا مُرَقّع بننے کے علاوہ ایک خاص عہد کی سیاسی، معاشرتی اور اس سے بھی بڑھ کر مجلسی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ بنی ہیں ـــــ ایک ایسا آئینہ جس میں موضوع اور بیان دونوں کے مکمل امتزاج نے چمک اور روشنی پیدا کی ہے۔ ایک ایسی تصویر جس میں موضوع اور بیان دونوں پر مُصنّف کی شخصیت کے مختلف عناصر کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

---

> "مولوی صاحب کی قوتِ مُشاہدہ اور باریک بین نظریں ایکس رے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُن کا کھرا اور استوار کردار کسی کی خوبیوں کے دبانے یا خامیوں کے اُجاگر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ . . . مولوی صاحب کے جن سے جتنے زیادہ گہرے مراسم تھے، اُن کی اُتنی ہی زیادہ پتے کی باتیں بتائی ہیں۔ ان کے مضامین کی طوالت و اختصار کا انحصار، نہ صرف مواد پر بلکہ ان کے اپنے معیار، مذاق اور پسند نا پسند پر ہے اِسی لیے اُن کے ذاتی تعلقات اور اُن کا شخصی عنصر ("چند ہم عصر") کے مضامین کو خاص دلکشی بخشتے ہیں۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے دَرک اور بصیرت کا اظہار ہوتا ہے"
>
> ـــــ ڈاکٹر سید شاہ علی

○

”(بابائے اُردو) کا تخلیقی جوہر تحقیق اور تنقید میں ... نمایاں ہے لیکن اس کا شباب بعض ایسی اَصناف میں نظر آتا ہے جس کی نوعیت تخلیقی ہے اور جس کی طرف بابائے اُردو نے توجہ کی ہے۔ مثلاً شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کا اُنہوں نے ایک نیا انداز پیدا کیا ہے۔ اس میں سیرت اور سوانح کا رنگ افسانے کے رنگ کے ساتھ کچھ اِس طرح شیر و شکر ہو گیا ہے کہ بڑی دل آویز سی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اس فضا میں تحقیق و تنقید کی بجلیاں بھی کوندتی ہیں اور مجموعی طور پر اِن تمام پہلوؤں کا امتزاج پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔ یہ خاکے انشاء کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان میں انشائیے کی صنف کے بھی بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ پھر بابائے اُردو کے اُسلوب کی سادہ پُرکاری نے انہیں معراج کمال پر پہنچا دیا ہے اور اس طرح یہ صنف اُن کے ہاتھوں میں تخلیقی ادب کا ایک شاہکار بن گئی ہے“

——— ڈاکٹر عبادت بریلوی

پروفیسر اُسلوب احمد انصاری

# مولوی عبدالحق کی مُرقّع نگاری

مُرقع نگاری بحیثیت ایک آزاد فن، ہماری زبان میں ابھی تک ایک مقبول صنف نہیں بنی ہے۔ خود سوانح عمری کے بہت زیادہ اور اچھے نمونے ہمارے یہاں موجود نہیں ہیں۔ دونوں کے درمیان جو فرق ہے، وہ صرف حجم کا نہیں، نقطۂ نظر، ترتیب اور مقصد کا بھی ہے۔ مرقع نگاری کے اولین نمونے، پرانے تذکروں اور خصوصاً "آبِ حیات" کی قلمی تصویروں میں ملتے ہیں۔ سوانح نگار کے لیے بھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ جوش وخروش کو اعتدال میں رکھ کر ہمدردی لیکن غیر جانبداری کے ساتھ اس تمام مواد کو، جو اس کی دسترس میں ہے، اس لحاظ سے منظم کرے کہ ممدوح کی سیرت کے خاص خاص گوشے تاریکی سے اُبھر کر روشنی میں آجائیں۔

دراصل ہر سوانح نگار کو ایک دہرے عمل کا پابند ہونا پڑتا ہے، یعنی ایک طرف تو ممدوح کی شخصیت اور اس پورے سیاسی، سماجی یا ادبی ماحول کے درمیان ایک توازن قائم کرنا پڑتا ہے، جس سے وُہ ہزار نقطوں پر ارتباط رکھی ہے، اور دوسرے شخصیت کی زوال دوال پرچھائیوں کو تخیل کی مدد سے ایک ٹھیرا ہوا روپ دینا پڑتا ہے مرقع نگار کا کام اس کام کی نسبت کچھ کم مشکل نہیں ہے۔ پورے سائز کی سوانح عمری اور ایک قلمی مرقع میں وہی فرق اور نسبت ہے، جو ایک مربوط اور مکمل ناول اور ایک مختصر کہانی میں ہوتا ہے۔ ناول میں واقعات کا پھیلاؤ، منظر نگاری میں جزئیات کا لحاظ، فضا کی تعمیر، کرداروں کی کی فراوانی، ماضی اور حال کے درمیانی نفوذ باہمی، ایک پورے ماحول یا دور کی عکاسی اور جذبات ومحرکات کا تجزیہ، ان سب کے لیے گنجائش ہوتی ہے۔ افسانہ میں اس کے برعکس کسی ایک واقعہ، کسی ایک جذبہ، سیرت کے کسی انوکھے پہلو پر ہی توجہ کو مرکوز کیا جاسکتا ہے۔ اگر ناول کی بساط اور اس کے امکانات کو ایک پُرجوش سمندر سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے

تو اس کے مقابلے میں افسانہ یا کہانی، ایک آبجو کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے سوانح اور مرقع کی نسبتِ باہمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور جو اسباب آج کی زندگی میں افسانہ یا کہانی کے فروغ کے ہیں، تقریباً وہی مرقع نگاری کی مقبولیت کے بھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ زندگی کی بے پناہ ہماہمی، وقت اور بے فکری کے احساس کی کمی، اور شخصیت اور دوران کے متعلق نئے نظریات نے اُس پُرسکون اندازِ فکر کا خاتمہ کر دیا ہے، جو پہلے فن کاروں سے عظیم بساط پر رزمیہ کارناموں، طویل ناولوں، لمبی بیانیہ نظموں اور مبسوط سوانح عمریوں کی تخلیق کرا سکتا تھا۔

مرقع نگاری کی جو جذبہ پایا جاتا ہے، وہ ہے ممدوح کو لفظ و بیان کے ذریعہ حیاتِ نو بخشنا، اور اس کی سیرت کے اُن گوشوں کو نمایاں کرنا، جن سے مرقع نگار متاثر ہوا ہے اور چونکہ یہ گوشے، خارجی عمل اور واقعات کے خلاف ردِّعمل کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے لازمی طور پر واقعات کا انتخاب بھی مرقع نگار کو کرنا پڑتا ہے۔

سوانح عمری میں تصویر کو پوری تفصیل کے ساتھ سامنے لانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ایک طور سے معاہدہ ہوتا ہے، لکھنے والے اور وسیع پڑھنے والے طبقہ کے درمیان جسے نبھانے کے لیے بھرپور تاریخی شعور کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مرقع نگاری میں تاریخی شعور سے زیادہ..... انفرادی تاثر اور ردِّعمل مشعلِ راہ بنتا ہے۔ مختصر رقبہ اور پیمانہ پر کام کرنے کے لیے واقعات کی کھتونی کی بجائے صرف اہم اور معنی خیز اشاروں، وقت کے چند اہم نقطوں اور شخصیت کی بوقلمونی میں سے چند نقوش کو اسیر کر لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مرقع نگار اور اس شخصیت کے درمیان، جس کی تصویرکشی مقصود ہے، ایک انفرادی معاملہ ہوتا ہے اور اس لیے اس میں شخصی جذبہ کی کارفرمائی اور رنگ آمیزی لازمی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے واقعات کی صحت کسی طرح مشتبہ یا مجروح نہیں ہوتی۔ صرف ان کی ترتیب اور ان کے انتخاب میں فرق آ جاتا ہے۔

اس کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اس تصویر کو ذہن میں رکھ کر اور دوسرے ذرائع سے اگر چاہیں تو مواد حاصل کرنے کی کوشش کریں، اور اس طرح ان نقوش کی وضاحت کے لیے سلسلہ وار اور معروضی واقعات کا سہارا لیں اور تاریخی اور سوانحی حقائق کو ان نقوش و آثار کی مدد سے بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس طرح مرقع نگار

ہمیں ایک عالم اصغر سے دوچار کر دیتا ہے، جس کی بنیاد پر ہم عالم اکبر کا قیاس کر سکتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اختصار و تنظیم کے ساتھ ہی ایک طرح کی سرعت اور تیز رفتاری بھی اس عمل میں درکار ہوتی ہے، جس کے ذریعے مختلف تصویریں، چشم زدن میں ذہن کے سامنے جلوہ نما ہوکر ایک خاص نقش کے اُبھرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اِس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو مرقع نگاری کا آرٹ سکونی نہیں بلکہ حرکی معلوم ہوتا ہے، اور موجودہ دور میں اس کا مقبول ہونا زندگی کے مزاج کی تیزی اور اس کی لمحہ بہ لمحہ منقلب کیفیتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی تہہ میں نادانستہ طور پر ایک تو یہ مفروضہ کام کر رہا ہے کہ وقت، ماضی، حال اور مستقبل سے مرکب نقطوں پر مشتمل ایک خط مستقیم نہیں ہے، جس میں لازمی طور پر ایک منطقی وحدت پائی جاتی، بلکہ یہ نقطے اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہتے ہیں کہ ان اکائیوں کو وقت کے گرداب سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں، اور اس لیے واقعات کی ترتیب، زندگی میں سلسلہ وار نہیں ہے، اور نہ اس طرح پیش کی جا سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ خود انسانی شخصیت صفات و عیوب کی ایک مالا نہیں ہے۔ بلکہ ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ایک وحدت ہے۔ اس لیے شخصیت کا احاطہ یا تجزیہ اس کے اوصاف کے شمار کرنے سے ممکن نہیں، بلکہ اندرونی سرچشموں اور سوتوں کو نمایاں کرنے سے ہے۔ وقت اور شخصیت کے تعلق سے دونوں مفروضے، پچھلے تمام مفروضات کی تکذیب کرتے ہیں، اور ان کے مطابق زندگی اور مادہ ایک جگہ پر ٹھہری ہوئی اور جامد اکائیاں نہیں معلوم ہوتیں۔ بلکہ ہر لمحہ بڑھتے اور بدلتے ہوئے مظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے حال پر انسان کی گرفت کچھ کمزور سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہے کہ ہم شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو وقت کے مختلف نقطوں کے بالمقابل رکھ کر دیکھ سکتے ہیں اور اس سے کسی جامد یا میکانکی کیفیت کے پیدا ہونے کا امکان نہیں رہتا۔

پرانے تذکروں میں جن کا ذکر شروع میں کیا گیا تھا۔ ہمیں مرقع نگاری کا کوئی اس قسم کا تصور نہیں ملتا۔ ان تذکروں میں اور "آبِ حیات" میں جو کردار نگاری کی گئی ہے۔ وہ چند اُچٹتے ہوئے اشاروں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ جس میں کوئی وحدتِ تاثر نہیں پائی جاتی البتہ جدید دور میں چند ایسے مجموعے سامنے آتے ہیں، جو، اِن اوّلیں خاکوں پر بڑا اضافہ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً "چراغ حسن حسرت کی کتاب" مردم دیدہ "رشید احمد صدیقی کی" گنجہائے گراں مایہ"

—— مولوی عبدالحق صاحب کی "چند ہم عصر" اور شوکت تھانوی کی "شیش محل" اور ان سب کے پیشترو اور ان پر بالا، ڈپٹی نذیر احمد اور وحید الدین سلیم کے وہ دو لافانی مرقعے، جو مرزا فرحت اللہ بیگ کی فطانت اور قوتِ ایجاد کا بہترین مظاہر ہیں۔ ان سب مجموعوں میں مولوی عبدالحق کی کتاب "چند ہم عصر" اپنا الگ امتیاز رکھتی ہے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، اس کتاب میں مولوی صاحب نے اپنے ان معاصرین کی سیرت کو نمایاں کیا ہے، جن سے زندگی کی کسی منزل پر بھی انہیں قربت رہی ہے۔ ان میں سر سید اور حالی جیسے بزرگوں سے لے کر خالدہ ادیب خانم اور حسرت موہانی تک وہ تمام مشاہیر شامل ہیں، جنہوں نے علم و فضل سیاست اور مذہب اور شعر و ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اور ان کے علاوہ ایک بزرگ میرن صاحب جو غالب سے منسلک ہونے کی وجہ سے معروف ہیں۔ اور دو ایسے گمنام افراد شامل ہیں، جنہیں صرف مولوی صاحب کے قلم نے تحریر کے صفحات پر زندگی بخش دی ہے۔ غالب نے اپنے اشعار کے انتخاب کے سَر اپنے دِل کے کھلنے کا معاملہ رکھا تھا۔

مولوی صاحب نے اس نگار خانے میں جن بظاہر متخالف شخصیتوں کو جمع کر دیا ہے، اور ان کی جن اخلاقی اور انسانی خوبیوں کو سراہا ہے، اس سے ان کے مرکزی اقدارِ حیات کے تعین کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب، ہمارے ادب میں جو مرتبہ رکھتے ہیں، اس کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔ اوّل ان کی گہری تحقیقی نظر، دوسرے انکا اسلوب بیان، اور ان سب پر مستزاد وہ پیہم لگن اور والہانہ شیفتگی جو انہیں اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کی بقا و استقلال سے ہے۔

مرقع نگاری میں جو چیز سب سے پہلے ہماری توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے، وہ ان کی تحریر میں تقلیلِ الفاظ (Understatement) کا جوہر ہے۔ معیاری نثر نگاری کے سلسلہ میں ہماری مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ مفہوم کی اکائیوں اور الفاظ کی اکائیوں کے درمیان سخت ترین مُطابقت پائی جائے۔ عبارت میں جھول نہ ہو، جملوں کی دروبست اور تنظیم میں اختصار، صحت اور جامعیت سے کام لیا جائے۔ اور الفاظ اتنے اور ایسے ہی استعمال کئے جائیں، جو مفہوم ادا کرنے کے لیے لابدی ہوں۔ لیکن اس

کے ساتھ ہی اس میں ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں طنز اور تنقید کا ایک ہلکا سا پہلو بھی نکلے جسے کھول کر نہ بیان کیا گیا ہو۔ شاعری میں ہم جس چیز کو ابہام (Ambiguity) کہتے ہیں۔ وہ اس سے کسی قدر وسیع چیز ہے۔ وہاں لطیف ترین اشارے وسیع امکانات تک لے جاتے ہیں۔ معنی و مفہوم مختلف سمتوں میں کھلنے اور پھیلنے کی طرف میلان رکھتے ہیں اور ایک ایک اشارے کی کئی کئی سطحوں پر تعبیر کی جا سکتی ہے۔ نثر میں اس صفت کی تشریح ان موقعوں میں مندرجہ ذیل تراشوں سے کی جا سکتی ہے:

" وہ خواجہ حافظ کی غزلیں، قطعات، ابن یمین اور عمر خیام کی رباعیات پڑھتا اور مزے لیتا، حتیٰ کہ اس پر عمل بھی کرتا۔"

(سید محمود صفحہ ۸)

" آخر زمانے میں اُن پر مذہب کا رنگ بہت آ گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے مطالعہ نے زمانے کا ساتھ نہ دیا ہو، یا صحت کی خرابی کچھ مساعد ہوئی ہو، یا یہ کہ مذہب کے غواص اور اسرار کی طرف انہوں نے خاص طور سے توجہ کی ہو۔"

(خواجہ غلام الثقلین مرحوم صفحہ ۱۱۴)

" مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے، مگر بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ اُن کے دامن پر نہ تھا۔"

(مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی صفحہ ۱۱۹)

" مولانا محمد علی، عجیب و غریب شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر سے تشبیہ دی جائے۔ تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔"

(مولانا محمد علی مرحوم صفحہ ۱۵۲)

" شخصی سلطنتیں سازش کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھلتی پھولتی ہے۔ سرسالار جنگ بڑے مدبر تھے۔ وہ ریاست کے ہر شعبہ پر نظر رکھتے تھے۔ . . . . . ان کی وفات کے بعد چشم نگراں اُٹھ گئی، اور سازشوں کا دروازہ کھل گیا۔ آپس کی کشمکش اور رقابت نے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں پر اُبھارا اور حریف ایک دوسرے کو گرانے کے لیے کذب

وافترا، بہتان اور اس سے بھی بدتر حربے استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے۔"

(نواب عماد الملک صفحہ ۲۰۴)

"یہ ایک عجیب وغریب شخص ہوتا ہے، نہ صاحب جاہ ومنصب، نہ غیر معمولی قابلیت اور ذہانت رکھتا ہے۔ لیکن سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے یہ ریزیڈنٹ بہادر ہیں۔ راج پاٹ تو "حضو" کا ہے۔ لیکن اس کنکوے کی ڈور، صاحب عالی شان بہادر کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

(محسن الملک صفحہ ۲۴۲)

دوسری خصوصیت ان مرقعوں کی زبان کا ٹھیٹ استعمال ہے۔ مولوی صاحب کی تحریریں بالعموم فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار سے خالی ہوتی ہیں اور اس اُردو کا بہترین نمونہ ہیں، جو ایک مخلوط زبان ہے۔ اور جس کی مقبولیت کا راز اس امر میں ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ ایک خاص تناسب اور اعتدال کے ساتھ اس طرح ایک دوسرے میں آمیز کئے گئے ہیں کہ زبان کی اپنی انفرادیت اور حُسن نکل آیا ہے۔ زبان کی شعوری طور پر اور سیاسی وجوہ کے زیر اثر فارسی اور عربی یا ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے گراں بار کرنے کی کوشش سے مولوی صاحب کی تحریریں پاک ہیں۔ وُہ محاورہ کے استعمال میں بڑا سلیقہ رکھتے ہیں اور کم مُستعمل اور بعض اوقات متروک الفاظ کو اس خوبی کے ساتھ جملوں کی ساخت میں کھپا دیتے ہیں کہ اس سے نہ صرف اجنبیت کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ عبارت کی معنویت اور دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ اس اندازِ تحریر کو ابھی ہماری علمی اور تنقیدی تحریروں میں فروغ نصیب نہیں ہوا ہے، اور ایسا پوری طرح ہونا کچھ عرصہ تک ممکن بھی نہیں، لیکن بعض دوسری قسم کی تحریروں میں اسکا چلن نہ صرف ممکن ہی ہے، بلکہ مفید اور دلکش بھی۔ شعوری طور پر مُزیّن زبان کا اختیار کرنا اظہار بیان کے عجز کا پتہ دیتا ہے۔ مولوی صاحب کے یہاں روزمرہ اور محاورہ کی صفائی اور بظاہر خلافِ معمول الفاظ کا استعمال جو مزہ دیتا ہے، اس کی چند مثالیں دیکھئے:۔

"تحقیق وتفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کہ تہہ تک پہنچتے، اور اُس کے مالہ وماعلیہ کے سُراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے، اور پتال تک کی خبر لاتے، اپنی کتاب کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے اور لوگوں کو بھیج

کر مصر و شام اور دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے"۔

(مولوی چراغ علی مرحوم صفحہ ۳۳)

"انگریزی سے اُردو میں اصطلاحات یا الفاظ ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی، تو انگریزی داں بھی اُن کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ وُہ الفاظ کے کھنڈوں اور ان کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے، اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے، اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں جن سے الفاظ ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔"

(وحید الدین سلیم، پانی پتی صفحہ ۱۲۲)

"سرسید تو آخری زمانے میں مورد لعن وطن تھے ہی، اور ہر کس و ناکس اُن پر منہ آتا تھا، لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ پڑی، وہ حالی تھے۔"

(حالی صفحہ ۱۷۱)

"سرسیّد نے مسلمانوں کو ذلت و تباہی کے بھنور سے نکالنے کا ایک ہی علاج سوچا تھا، یعنی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج۔ ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد اسے عمل میں لانے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے۔ کیسی کیسی مخالفتیں اور صعوبتیں برداشت کیں، طعن و تشنیع، لعنت ملامت سہی، اور کیسی کچھ کھکھیڑیں نہ اُٹھائیں۔ لیکن نہایت استقلال اور عالی حوصلگی کے ساتھ اپنے خیال پر جمے رہے اور جو سوچا تھا، اِسے کر کے چھوڑا۔"

(سرسیّد احمد خاں صفحہ ۳۴۳)

مولوی صاحب اپنی قوتِ فیصلہ کی جرأت اور بے لاگ رائے کے لیے بہت مشہور ہیں، اور اس کا ثبوت اُن محاکموں میں جگہ جگہ ملتا ہے جو اپنے ممدوحین کی سیرتوں پر اُنہوں نے کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب لوگوں نے جو اس مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ مولوی صاحب کے جذبۂ تحسین کو اُکسایا ہے، اور وہ مختلف میدانوں میں ان کی خوبیوں اور ان کے کمالات سے متاثر ہوئے ہیں، لیکن اس سے بھی انکار کرنا ممکن نہیں کہ ان کی دو رائیں، خوبیوں اور خامیوں کا غیر جانبداری کے ساتھ احاطہ کرنے کے سبب بہت متوازن ہو گئی ہیں۔

• مولوی چراغ علی مرحوم کے سلسلہ میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ وُہ اپنے فیصلوں میں یک طرفہ

رائے اور جذبات پرستی سے کوسوں دور رہتے تھے۔ یہی حال مولوی صاحب کا بھی ہے۔ اس معاملہ میں وُہ حالیؔ سے کہیں کم بامُروّت اور سرسیّد کی عقل پسندی اور معروضیت سے قریب تر ہیں حالیؔ کے صحیح جانشین ہونے کے باوجود، وہ شخصیت کی چھان بین (Evaluation) میں حالی سے زیادہ دُور رس ہیں، اور اُن کا خیر و شر کا تصوّر عقلی ہے، جذباتی نہیں۔ وہ انتہائی ہمدردی محبت اور عقیدت کے باوجود اپنی رائے کے مُنصفانہ اظہار میں پس و پیش نہیں کرتے۔ سیّد علی بلگرامی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وُہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے، یا حُبِّ جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو اُن کی شان کے شایان نہ ہوتی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیدر آباد کی گوناگوں دلفریبیوں اور مجبوریوں نے اُن کے وقتِ عزیز کا بہت سا بیش قیمت حصّہ غصب کر لیا تھا اور جاہ طلبی کے بکھیڑوں نے وُہ اُلجھاؤ پیدا کیا کہ اس قدر اطمینان نصیب نہ ہوا کہ وہ علمی مشاغل میں اطمینان کے ساتھ مشغول رہتے، جس کے وُہ ہر طرح موزوں اور اہل تھے۔"

(صفحہ ۱۰۶)

مولانا محمد علی کے بارے میں اُن کی رائے بہت قابلِ وقعت ہے:

"وُہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکّا دشمن تھا۔ لیکن اگر کبھی اُس کے ہاتھ میں اقتدار آتا، تو وُہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وُہ محبت و مُروّت کا پُتلا تھا، اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا، کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے تھے، جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔"

(صفحہ ۱۵۳-۱۵۲)

شیخ غلام علی قادر بلگرامی کے مُرقّعے میں زبان و بیان کا مزہ، اختصار، کردار نگاری اور محاکمہ کی سچائی اور قطعیت بڑی خوبی کے ساتھ آمیز کی گئی ہیں۔

"شعر اس جوش سے پڑھتا تھا، کہ گویا شعر کے جگر میں گھسا جاتا تھا، اور پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتا تھا۔ ذوقِ سخن ایسا اچھا تھا کہ شعر سُن کر وجد میں آ جاتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ بظاہر اکھڑ تھا۔ لیکن دل میں خلوص تھا۔ تواضع اس طرح کرتا تھا کہ جیسے کوئی کسی سے

لڑتا ہے اور یہ اُس کے عین خلوص کی علامت تھی دوستی کا سچا اور دوستوں کا قدرداں تھا۔" (صفحہ ۱۵۷)

حالی کی سیرت کا جو نقشہ مولوی صاحب نے کھینچا ہے۔ وہ کہیں اور نظر نہیں آتا:

"مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی، اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگزر کا یہ عالم تھا کہ کوئی اُن سے کیسی ہی بے معاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے، اُن کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا تھا، ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا، جب اُن سے ملتے تو اُن کے حسنِ سلوک اور محبّت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجہ کے نکتہ چین، جو دوسروں کی عیب گیری کے بغیر مانتے ہی نہیں، اُن کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔" (صفحہ ۱۸۳)

سرسیّد کے متعلق مولوی صاحب کا یہ محاکمہ بہت چیا تلا اور صحیح ہے:

"وہ قدامت پرست نہ تھے، بلکہ اُنہوں نے بہت سی پرانی رسموں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ وہ ہر بات کو تحقیق اور عمل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے ۔۔۔۔۔۔ تقلید کے مطلق قائل نہ تھے۔ جدّت اور نئی روشنی کے حامی تھے۔ خود وہ کئی ایسی بدعتوں اور جدّتوں کے بانی ہوئے کہ مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر طرف سے مخالفتیں ہوئیں، مطعون ہوئے، مردود ہوئے، مگر اُنھوں نے کچھ پروا نہ کی، اپنی بات پر اڑے رہے۔"

(صفحہ ۲۳۹)

ایک اور جگہ سرسیّد کے متعلق یہ جملے ان کی سیرت پر منصفانہ روشنی ڈالتے ہیں:

"سرسیّد کا میدانِ عمل، قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ ایسا جامع صفات اور جامع حیثیات، بے لوث و بے نفس، پُرعزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت اور ہمہ تن ایثار مصلح، ہمیں اِس سے پہلے اور نہ اس کے بعد نصیب ہوا ۔۔۔۔ حق یہ ہے کہ قومیت کا خیال بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔"

(صفحہ ۳۵۲)

سب سے دلچسپ مرقع مولانا حسرت موہانی کا ہے، جس میں اُن کی ظاہری ہیئت اُن کے خیالات کا تضاد اور اُن کی بے پناہ اخلاقی جرأت اور عزم و ایثار و استقلال کو

بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ بات کہی گئی تھی کہ :

اِن مُرقعوں میں مولوی صاحب نے اپنے ممدوحین کی جن خوبیوں پر زور دیا ہے۔ ان سے ایک حد تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں کن اخلاقی قدروں کو عزیز رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں ایسے جملے بھی ملتے ہیں، جہاں اُنہوں نے بعض حالات کے ذکر، بعض شخصیتوں کی تصویر کشی یا ان حالات میں اُن شخصیتوں کے ردِّ عمل سے تعمیمات اَخذ کئے ہیں۔ لیکن ان عام نتائج اور مفروضوں کی صحت اور صداقت سے قطعِ نظر یہ بات قابِل لحاظ ہے کہ وُہ انسانی شخصیت کے کن پہلوؤں سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ چند تراشے قابِل غور ہیں :

"باوجود اِس لیاقت اور ثروت کے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ شہرت، دولت اور حکومت، جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے، اور جن کی آگ تقریباً ہر سینہ میں مُشتعل ہے، وُہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے، ورنہ چاہتے تو اس قدر شہرت اور اور دولت حاصل کر سکتے تھے، جو دوسرے کی قدرت سے باہر ہے، لیکن اُنھوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی، اور مستانہ وار ٹھکرا کر چلے گئے۔"

(سیّد محمود صفحہ ٦)

"حالانکہ وہ ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے، لیکن کبھی کسی جھگڑے، کسی سازش کسی پولیٹیکل، سوشل تحریک میں اُن کا نام نہیں آیا۔ وُہ ہمیشہ دھڑے بندیوں سے الگ رہے۔ نہ اپنا کوئی جتھا بنایا، اور نہ کسی کے جتھے میں شریک ہوئے۔ وُہ اُپنے تمام سرکاری نیز خانگی اُمور میں ہر قسم کے تعصّبات سے بَری تھے۔"

(مولوی چراغ علی مرحوم صفحہ ۴۹)

"لیکن مرحوم کی جفاکشی اور مُستعدی میں آخر دم تک فرق نہ آیا۔ وُہ کبھی راست بازی اور دیانت کے راستے سے نہ بھٹکے۔ اُن کی زندگی جیسی سادہ اور بے ریا پہلے تھی، ویسی ہی آخر دم تک رہی، اور اُن کے اِتقاء اور پرہیز گاری میں کبھی تزلزل واقع نہ ہُوا۔"

(مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم صفحہ ۶۴)

"اُن کی اخلاقی جرأت، آزادیٔ خیال، رواداری، انصاف پسندی، بے تعصّبی اور ہمدردی کے ہندو مسلمان سب قائل تھے۔ جس کام کو انہوں نے اپنے ہاتھ میں لیا، اُسے کامل خلوص اور تندہی سے انجام دیا۔ جب قومی خدمت کا بار اپنے سر لیا، تو یہ شغف اور بڑھ گیا۔ اس دھن میں وہ سب کچھ بھول گئے۔"

(سر سیّد احمد خاں صفحہ ۳۲۸)

"وہ ایسے لوگوں سے جو ذوقِ علم اور ذوقِ تہذیب سے عاری ہوتے، گو دنیاوی حیثیت سے اُنکا پایہ کتنا ہی بلند ہوتا ملنے سے اِبا کرتے۔ ایسے اصحاب سے اُن کا برتاؤ خشک اور اُچٹتا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن اہلِ علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے اور اُن سے گھُل مِل کر باتیں کرتے۔ اِن ملاقاتوں میں طالب علمانہ سادگی، خلوص اور ہمدردی پائی جاتی تھی"

(نواب عماد الملک صفحہ ۳۳۴)

کیا مندرجہ بالا تراشوں سے یہ قیاس کرنا غلط ہوگا کہ مولوی صاحب کی ذات میں اُن قدروں کا عکس پایا جاتا ہے، جو اِن مشاہیر کی کردار نگاری میں ظاہر ہو رہی ہیں؟

مُرقّع نگاری کے جدید ترین فن میں مولوی عبدالحق صاحب جو امتیاز رکھتے ہیں، ان میں صرف پروفیسر رشید احمد صدیقی اُن کے شریک ہیں۔ دونوں کے فن میں جو فرق ہے وہ ان کے مزاج اور نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ رشید صاحب کا آرٹ حرکی اور تخیلی ہے۔ مولوی صاحب کے یہاں عقل اور قوّتِ فیصلہ کی کارفرمائی زیادہ ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولوی محمد علی مرحوم پر دونوں کی رائے میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ تقلیلِ الفاظ (Understatement) محاورہ کا استعمال، عبارت کا گھٹاؤ، منصفانہ محاکمہ اور سیرت نگاری میں مرکزی اخلاقی اقدار کی تلاش "چند ہم عصر" میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ اِن مُرقّعوں کے پڑھنے سے بڑی حد تک یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سر سیّد کے دَور سے لے کر اب تک مسلمان نے علم و فضل اور شعر و ادب کے میدان میں کیا کیا کارنامے سر انجام دئے ہیں۔ مبسوط سوانح عمری کے برعکس، قلمی تصویریں، صرف چند نقوش کو اُبھار سکتی ہیں۔ لیکن ذاتی تعلقات کے اس تانے بانے کے نیچے وسیع تر قومی اور تہذیبی زندگی کے دھاروں کے رُخ کو پہچانا جاسکتا ہے۔

سر سیّد پر اپنے مضمون کے شروع میں مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ "ہم عصر

بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں''۔ لیکن اس خیال کی تردید اِن تمام مُرقعوں سے ہوتی ہے۔ کیونکہ مولوی صاحب کے فیصلہ کا اندازہ ذاتی ہونے کے باوجود، ایک طرح کی لاتعلقی کو ظاہر کرتا ہے، جس سے تصوّر کے خط و خال میں تناسب باطنی کا عنصر برقرار رہتا ہے۔

اِن مُرقعوں میں کہیں کہیں طنز و مزاح کے ہلکے ہلکے چھینٹے بھی نظر آتے ہیں، لیکن ان پر عقل کا زبردست پہرہ، ہر جگہ بیٹھا ہوا ہے۔

خطوط نگار کی طرح، مُرقّع نگار بھی معمولی واقعات اور تجربات سے تصویر میں رنگ بھرنے کا کام لیتا ہے۔ ''چند ہم عصر'' میں ایسے واقعات کا بیان، بہت سے پردوں کو اُٹھانے کا سبب بنتا ہے۔

کردار نگاری، سماجی پس منظر، ذاتی واقفیت، معروضی اندازِ بیان اور زبان و بیان کی صحت اور وضاحت کی بناء پر یہ مُرقعے بہت اہم اور دلکش ہیں۔

---

''علم محنت اور کوشش سے حاصل ہوتا ہے۔ عقل زندگی کے تجربوں سے آتی ہے۔ علم بغیر عقل کے کار آمد نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات نقصان رساں ہوتا ہے۔ سعدی نے سچ کہا ہے کہ ''یک من علم را دہ من عقل می باید'' اور عقل بغیر علم کے اکثر غلط رستے پر لے جاتی ہے۔ علم اور عقل دونوں کے تعاون پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے لیکن ایک چیز اور ہے جو ان سے بھی برتر اور افضل ہے۔ وہ انسان کی سیرت (یعنی کیرکٹر) ہے۔ اس میں کچھ فطرت کا عطیہ ہوتا ہے جو پیدائشی ہے اور کچھ ماحول اور تعلیم و تربیت کا اثر — جہاں یہ نہیں، وہاں علم و عقل دونوں بے کار ہیں''

——— بابائے اردو

ڈاکٹر محمود الہٰی

# ڈاکٹر عبدُالحق کی شخصیت نگاری

ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اپنے ایک معاصر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وُہ اپنے ہم عصروں کی ہمّت افزائی کرتے ہیں۔ اور ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی داد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقولہ خود اُن کی ذات پر زیادہ صادق آتا ہے۔ اپنی طویل ادبی زندگی میں اُنھوں نے نہ صرف اپنے بڑے بڑے معاصرین کو چار چاند لگائے۔ بلکہ اُن چھوٹے چھوٹے ہم عصروں کو بھی ادب دوستوں سے روشناس کرایا، جن کے اندر ابھی عہد آفرینی کی صلاحیتیں بیدار نہیں ہوئی تھیں۔

وُہ چاہتے یہ ہیں کہ ہر اُس فرد کا نام دُنیا جان جائے جس نے علم و ادب کو فروغ دینے میں تھوڑی بہت بھی کاوش کی ہے۔ ہم عصر شخصیتوں پر ڈاکٹر صاحب نے اب تک جو لکھا ہے، اگر اُسے یکجا کیا جائے تو "چند ہم عصر" جیسی جیسی کئی کتابیں تیار ہو جائیں۔ کبھی کسی کتاب کے سلسلہ میں کسی نئی شخصیت پر وُہ بحث کرنے لگتے ہیں۔ کبھی وُہ ادبی رُجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے کئی گمنام شخصیتوں کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں، اور کبھی ایک ہی شخصیت کو موضوعِ گفتگو بنا لیتے ہیں۔

شخصیت نگاری کا فن جتنا آسان ہے، اُتنا ہی مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ اگر کسی کی قوّتِ مُشاہدہ تیز ہو تو وہ شخصیت کے ہر نقش اور ہر لکیر کو پہچان سکتا ہے۔ لیکن مشکل اِس لیے کہ نقشِ باطل اور نقشِ حق میں امتیاز کرنا سب کا کام نہیں۔ یہی وُہ منزل ہے جہاں باریک بیں شخصیت نگار بھی دھوکا کھا جاتا ہے، اور وُہ زمانے

کے سامنے کسی شخصیت کا رطب و یابس سب کچھ رکھ دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیت مجہول ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور زمانہ اس سے بالکل متاثر نہیں ہوتا ڈاکٹر صاحب اس کوچے سے ایک کامیاب شخصیت سے گزرے ہیں "چند ہم عصر" میں شخصیتوں کے خاکے ہیں اور ظاہر ہے کہ عظیم شخصیتوں کی تصویر دس پانچ صفحوں میں نہیں کھینچی جا سکتی لیکن انھوں نے ہر شخصیت کا عطر نچوڑ کر ان میں جمع کر دیا ہے، اور ان تمام اجزا کو چند صفحوں میں فراہم کر دیا ہے جنھوں نے شخصیت کی تعمیر کی اور جنھوں نے دنیا کی تقدیر بدلنے میں مدد کی وہ ہر شخصیت کی رگ و پٹھے میں دوڑ کر اس کا وہ صالح خون نکال لیتے ہیں، جس نے دنیا کی انگنت شخصیتوں میں اسے ممتاز کر دیا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں ہمیشہ شخصیتوں کی دکھتی رگیں یا شہ رگ ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ اور رگوں پر عملِ جراحی۔ فعلِ عبث ہے۔ اس لیے اس رگ پر اپنا زور صرف کرتے ہیں جو فعّال اور متحرک ہوتی ہے اور جس کی روشنی میں ایک دنیا فعال اور متحرک بن سکتی ہے۔

بظاہر "چند ہم عصر" سوانحی خاکے ہیں لیکن ان خاکوں سے رنگارنگ تصویر بنائی جا سکتی ہے

بظاہر یہ مجمل اشارات ہیں لیکن ان اشارات سے مفصّل اور مبسوط کتاب تیار کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے سوانحی خاکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان سے نہ صرف زیرِ بحث شخصیت کے خط و خال واضح ہو جاتے ہیں، بلکہ اس کی رفتارِ ترقی کا بھی حال معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت اور زمانہ کے باہمی رشتوں کو قدم قدم پر جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آ جائے کہ اس شخصیت نے زمانہ کے ساتھ کیا کیا، اور زمانے نے اس سے کیا اثرات قبول کئے تدبّر اور حکمتِ عملی کے زیور سے آراستہ ہونا بڑی اچھی بات ہے۔ محسن الملک کے اندر بھی یہ خصوصیت تھی، مگر اس خصوصیت میں تابندگی، درخشندگی اس وقت آتی ہے جب محسن الملک کے تدبّر و حکمتِ عملی کے بیان کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ریاست حیدر آباد کے انتظامی کھوکھلے پن کو بھی بیان کرتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ محسن الملک کی یہ خصوصیت حیدر آباد کو سنوارنے کے کام آئی۔ ڈاکٹر صاحب کے ہر سوانحی خاکے میں یہ بات ملتی ہے اور وہ زیرِ بحث شخصیت

کو کبھی زمانے سے الگ ہٹ جاکر نہیں پرکھتے بلکہ وہ زمانے کے دل کی دھڑکن اور شخصیت کی نبض کی رفتار پر بیک وقت توجہ کرتے ہیں۔ اور دونوں کی گرہیں ایک دوسرے کی مدد سے کھولتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب شخصیتوں کے نمائندہ نقوش سے ایک عالمگیر صداقت کی بنیاد رکھتے ہیں اور ایک آفاقی اصول مرتب کرتے ہیں، مثلاً حالی کی دردمندی، انسان دوستی اور رحم دلی سے متعلق وہ چھوٹے چھوٹے واقعات جمع کرتے ہیں۔

واقعات جمع کرنا کوئی اہم کام نہیں لیکن ان سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حالی کے یہی رجحانات انھیں اپنے وقت کا عظیم انسان بنا دیتے ہیں اور ان کی ادبی زندگی کی تقلید کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ مولانا محمد علی کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ ہر بڑی تحریک میں استقلال اور ثابت قدمی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اور یہی چیز مولانا کے اندر نہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ شخصیتوں کے سیرت و کردار اور ذہن و مزاج کو دنیا کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں، اور نئے چلنے والوں کے لیے ایک آزمودہ راہِ عمل متعین کر دیتے ہیں۔ شخصیت نگاری کا یہ بہت بڑا آرٹ ہے کہ شخصیتیں دنیا کے سامنے مشعلِ راہ بن کر پیش کی جائیں، اور ان کو دیکھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ اور امنگ پیدا ہو۔ نہ یہ کہ شخصیتوں کو ایک بُت بنا دیا جائے اور دنیا صرف اس کی پرستش کرتی رہے۔ اور اپنے فرائض بھول جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت نگاری کا یہ آرٹ اُردو میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور اصل میں یہی شخصیت نگاری ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے "چند ہم عصر" میں زیادہ تر علم و ادب کے رہنماؤں کو اپنا موضوعِ علم بنایا ہے اس لیے اُن رہنماؤں کی سیرت کے ساتھ ساتھ اُن کی خدمات کا بیان کیا جانا ایک فطری بات ہے۔ اور صحیح تو یہ ہے کہ شخصیت متشکل ہوتی ہے کردار و خدمات کے امتزاج سے، ڈاکٹر صاحب شخصیتوں کے کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلتے ہیں۔

یہ اشارے سادہ اور سپاٹ نہیں ہوتے بلکہ ان میں بھرپور ناقدانہ نگاہ مستور رہتی ہے۔

امیر مینائی، چراغ علی، مولانا بلگرامی، اور دوسری شخصیتوں کے کارناموں پر وہ ایک بے باک نقاد کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں اور ان کے کھرے کھوٹے کو الگ کر کے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کبھی کسی شخصیت کو اس کے اپنے دائرے سے الگ نہیں کرتے۔ امیر مینائی لکھنؤ کے دبستان شاعری کے آخری چراغ تھے۔ وہ اس بات کا ذکر اشاروں اشاروں میں کر دیتے ہیں اور امیر مینائی کی شاعرانہ حیثیت متعین کر دیتے ہیں۔ اس طرح جب غلام قادر گرامی کی شاعری کی داد دیتے ہیں تو اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ قدیم اساتذہ کی روش پر چلتا تھا اور اپنے شعر کو خوب بناتا اور سنوارتا تھا۔

وہ سوانحی خاکوں میں اصولِ تنقید، معیارِ تنقید، بضرورتِ تنقید پر بھی بحث کرتے ہیں۔ امیر مینائی نے سرورِ کائنات کی شان میں نعتیہ شاعری بھی کی ہے اور اس باب میں وہ کچھ روشِ عام سے بچ کر چلے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے امیر مینائی کی اس ادا کی نہ صرف داد دی ہے بلکہ اصول نعت گوئی پر کھل کر تبصرہ کیا ہے اور مختصر لفظوں میں اس صنعت کا جائزہ لیا ہے اسی طرح "امیر اللغات" کے ضمن میں اردو میں لغات کی کمی اور ان کے تدوین کے اصول وضرورت پر اپنی رائے دی ہے۔ اسی طرح مولانا وحید الدین سلیم کے اندازِ درس و تدریس پر بات کرتے کرتے یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے، اور پھر وہ اپنا راستہ خود نکال لیتا ہے یا ان کی شیفتگیٔ علم پر رائے دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس کوچے میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم بننا دشوار۔

ریسرچ اور تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ خود اپنی زندگی کو اس کام میں وقف کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کے لیے آمادہ کرتے رہے "چند ہم عصر" میں بھی وہ اپنے اس رجحان طبع کو ترک نہیں کرتے جب بھی وہ کسی شخصیت کے بارے میں آخری رائے قائم کرتے ہیں تو وہ اکثر تحقیقی اعتبار سے قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔ شخصیت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی شخصیت کے بارے میں ذاتی تاثرات کو بھی اسی وقت اہمیت حاصل ہوتی ہے جب وہ تحقیقی بنیاد پر حرفِ باطل نہ ثابت ہوں۔

یہ بڑی سچی بات ہے کہ موضوع، خود تحریر کا انداز بدل لیتا ہے۔ تذکرہ یا سوانح میں وہ انداز نہیں چل سکتا جو ناول یا افسانے میں کام آتا ہے، لیکن :

ڈاکٹر صاحب کا اسلوب تحریر اتنا پختہ اور بے لچک ہے کہ وہ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں بڑی دور سے پہچان لیے جاتے ہیں وہی تحقیقی احتیاط، وہی شوخی و بے باکی سے گریز کی کوشش، وہی سنبھل سنبھل کر اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی عادت، وہی دلوں پر ٹھیس نہ لگنے کا خوف، وہی اصلاحی اور واعظانہ رنگت ہر موضوع میں نمایاں رہتی ہے۔

مگر وہ کمال یہ کرتے ہیں کہ اُن کا یہ اسلوب اس موضوع کی تربیت نہیں معلوم ہوتا اُن کی تحریر کبھی کبھی پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر کسی حال میں کسی پر گراں نہیں گزرتی۔ شخصیت نگاری کے سلسلہ میں لب ولہجہ کا ضبطِ اعتدال ایک لازمی جزو ہے۔ ہر موقع پر یہ خیال رہنا چاہیئے کہ شخصیت نگار نہ تو واقعہ نگار ہے اور نہ مدّاح۔ مدّاحی اور واقعہ نگاری کا درمیانی راستہ اختیار کرنا حالی سے بھی بعض وقت نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب اِس نکتے پر کافی محتاط رہتے ہیں اور اُن شخصیتوں کی تصویر کشی میں جن کے واقعی وہ مدّاح ہی مدّاح تھے، بڑا سنجیدہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

حالی اور شبلی کو دورِ جدید کے رہنماؤں میں شمار کیا گیا ہے اور ان کے چراغ سے چراغ جلایا گیا ہے۔ لیکن سوانح نگاری اور شخصیت نگاری کے میدان میں ان کے فن کو ترقی دینے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کا کارواں اِتنا آگے بڑھنے کے باوجود بعض راہوں میں اب بھی جامد و ساکت ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق نے جہاں ایک زندہ و توانا ادب کی تمام اصناف پر توجہ دی وہاں سیرت و شخصیت نگاری کے فن کی طرف بھی مائل ہوئے۔ "چند ہم عصر" اُن کے اِسی میلانِ طبع کا نتیجہ ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں اُن کے اِن سوانحی خاکوں کی اہمیت کبھی کم نہ ہو گی۔

---

○

"کتاب (چند ہم عصر) کی علمی اور ادبی خوبیوں کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ معانی کا وزن اور عبارت کی سبک روی، خیالات کی متانت اور بیان کی شگفتگی، جذبات کا جوش اور ان کے اظہار میں ضبط و اعتدال، مولوی (عبدالحق) صاحب کی تحریر کے عام جوہر ہیں اور اس کتاب میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ واقعات کے جمع کرنے میں افراط و تفریط سے پرہیز جو علمی سیرت نگاری کی شرطیں ہیں، پوری طرح ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خاکوں میں جو اس قدر صحت کے ساتھ تیار کیے گئے ہیں رنگ بھرنے میں مصنف کے قلم نے مو قلم کا کام کیا ہے اور اس کے جان بخش اندازِ تحریر نے اِن خاموش تصویروں میں جان ڈال دی ہے۔ ...

مصنف ... یوں تو اپنی ہر تحریر کے اُسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک دکھانے پر مجبور ہے لیکن خاص کر اُس وقت جب وہ دوسروں کی سیرت پر قلم اُٹھاتا ہے، اُس کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اُٹھ جاتا ہے، اوروں کے جوہر پرکھنے میں خود اُس کے جوہر کھُل جاتے ہیں۔ اِس نکتے کو مدِّنظر رکھ کر مولوی عبدُالحق کی تنقیدی تحریروں خصوصاً "چند ہم عصر" کا مطالعہ کیجیے — ان رنگا رنگ صورتوں میں خود اُن کی سیرت کی جھلک دیکھیے اور ... لُطف اٹھایئے!"

——— ڈاکٹر سیّد عابد حسین

سید معین الرحمٰن

# "چند ہم عصر" کا تنقیدی جائزہ

"ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں، صحرا بھی ہو، دریا بھی ہو، آسان ہے لیکن انسانی خصائل یا کسی اُداسئے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اُوپری نظر جو بیرونی اشیا تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے۔"
(مقدمات عبدالحق، ۳۴۲)

مولوی عبدالحق، صاحبِ نظر تھے۔ اُنھیں انسانی سیرتوں کی بڑی پرکھ تھی اور اِس پرکھ کو لفظوں کا مُتناسب پیرہن عطا کرنے کی غیر معمولی قدرت اور صلاحیت کے بل پر اُنھوں نے اپنے بعض رفیقوں، بزرگوں، اور نیاز مندوں کے وہ وہ مُرقّعے تراشے ہیں کہ رہتی دُنیا تک یادگار رہیں گے۔ "چند ہم عصر" اس ذیل کا یادگار مجموعہ ہے۔ اِس سے اُردو میں مُرقّع نگاری کا ماں دان سلامت ہے۔ مختلف اوقات میں لکھی گئی مولوی عبدالحق کی اِن تحریروں کو سب سے پہلے مولوی صاحب کے ایک عزیز اور لائق شاگرد شیخ چاند نے جمع کیا۔ لیکن وہ اِنھیں اپنی زندگی میں طبع نہ کرا سکے۔ چاند کے انتقال کے بعد یہ مجموعہ اَب سے کوئی پچیس ستائیس برس قبل انجمن ترقّی اُردو (ہند) کے سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۹۲ کے تحت شائع ہوا۔ اِس پہلے ایڈیشن میں چودہ شخصی مُرقّعے شامل تھے ان میں سے کچھ تو رسالوں میں پہلے چھپ چکے تھے، کچھ اس مجموعہ کے لیے خاص طور پر لکھے گئے اور بعض شیخ چاند مرحوم نے کتابوں کے تبصروں یا مولوی عبدالحق کے خطوں سے اقتباس کر کے اس میں داخل کر دیئے۔ شیخ چاند کا خیال یہ بھی تھا کہ ہر مُرقّع کے ساتھ

شخص مذکور کی تصویر بھی لگا دی[1] جائے لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔

۱۹۴۲ء میں "چند ہم عصر" کا دوسرا ایڈیشن، مینیجر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کی مختصر "التماس" کے ساتھ جمال پریس دہلی سے طبع ہُوا۔ اس میں راس مسعود اور میرن صاحب کے حالات کا اضافہ کیا گیا جو رسالہ "اُردو" میں شائع ہو چکے تھے۔ نام دیو، مالی کا تذکرہ خاص طور پر اسی ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔

یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد نظر ثانی و اضافے کے بعد ۱۹۵۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے دیباچے کے ساتھ چھپا۔ سر سید پر مولوی عبدالحق کا سیر حاصل خاکہ اسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ تین سال بعد ۱۹۵۳ء میں انجمن ہی کی طرف سے "چند ہم عصر" کا چوتھا ایڈیشن شائع ہُوا۔ اس پر تحسین سروری کا مختصر سا دیباچہ ہے۔ اور اس میں عبدالرحمن صدیقی، حسرت موہانی، پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر ری ہٹ سک اور عبدالرحمن بجنوری پر مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔

"چند ہم عصر" کا پانچواں ایڈیشن بھی انجمن ہی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس پر سالِ اشاعت کہیں درج نہیں۔ انجمن کے کتب خانۂ خاص میں نسخے کے اندراج سے سالِ اشاعت ۱۹۵۶ء قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نواب عماد الملک پر مضمون اسی ایڈیشن میں پہلی بار شامل ہُوا

"چند ہم عصر" کا چھٹا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن مولوی صاحب کے اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ اُردو اکیڈمی سندھ کراچی کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں منشی امیر احمد مینائی پر مضمون (جو مولوی عبدالحق نے امیر مینائی کی وفات ہی کے روز لکھ کر رسالہ "افسر" میں شامل کر دیا تھا) اس اعتذار کے ساتھ حذف کر دیا گیا ہے کہ:

"یہ بہت ہی سرسری مضمون ہے جس میں نہ پوری سیرت نگاری ہے اور نہ اُن کے کلام پر مکمل تبصرہ۔"

اس چھٹے ایڈیشن میں، جو مولوی عبدالحق کی زندگی میں "چند ہم عصر" کا آخری ایڈیشن ثابت ہوا۔ کل چوبیس شخصی خاکے شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق کچھ اور اصحاب پر بھی شخصی مضامین لکھنے کی فکر میں تھے۔ اس کی نشاندہی خود اُن کے اپنے ایک خط مکتوبہ

---

[1] بحوالہ: دیباچہ چند ہم عصر، طبع دوم ۱۹۴۲ء

۲۳ر اپریل ۱۹۵۶ء سے ہوتی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کو لکھتے ہیں:

آپ نے ---- محسن الملک اور حیدری صاحب پر لکھنے کی فرمائش کی ہے ---- محسن الملک پر لکھ چکا ہوں (دیکھئے: "چند ہم عصر") البتہ حیدری صاحب پر ضرور لکھوں گا۔ فی الحال اگر فرصت ملی تو گاندھی جی اور سر تیج بہادر سپرو پر لکھنے کا ارادہ ہے۔ گاندھی جی کی شخصیت بہت پیچیدہ، پُراسرار اور گہری ہے میں بعض ایسے واقعات کا اظہار کروں گا جن کا علم اب تک کسی کو نہیں اور جن کے آشکار ہونے سے تہلکہ مچ جائیگا[1]

"فرصت" نہ ملی یا کوئی اور اَمر مانع رہا صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو واقعہ بہر حال یہ ہے کہ ان ممتاز شخصیتوں پر "لکھنے" کا ارادہ شرمندۂ عمل نہ ہوا۔ گاندھی پر مولوی عبدالحق کا موعودہ مضمون خصوصیت سے بہت معرکے کا ہوتا مگر زندگی کی اُلجھنوں اور آخری ایام کی علالت نے اُنھیں اس کام کے انجام دینے کی مہلت نہ دی۔ مرض الموت میں مبتلا ہونے پر اُنھیں علاج کے لیے مری کے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں لے جایا گیا۔ گاندھی پر اپنے زیرِ قلم مضمون کی تکمیل کا خیال یہاں بھی اُنھیں ستاتا رہا۔ "مولوی صاحب کے آخری ایام" کے تحت ابن انشا صاحب نے لکھا ہے:

"ایک زمانے میں وُہ گاندھی پر لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس کے متعلق ہندوستان سے شائع شدہ دو موٹی موٹی کتابیں بھی وُہ پڑھ چکے تھے۔ مجھ سے لوئی فشر کی کتاب بھی منگوائی۔ مری میں کہنے لگے دیکھو وُہ گاندھی والا مضمون بھی پڑا ہے۔ اچھا، اب کے کراچی چل کے اِسے پورا کرتا ہوں[2]"

لیکن افسوس، وہ اِسے پورا نہ کر پائے۔ مری سے کراچی واپس آنے کے پانچویں روز بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ مضمون کا جو حصّہ وہ لکھ چکے تھے، ناتمام صورت میں، وُہ بھی ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا ---

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق (مرتبہ: جلیل قدوائی) صفحہ ۳۵۱

[2] قومی زبان (بابائے اُردو نمبر) ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۶

"چند ہم عصر" کے آخری ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں جو چوبیس شخصی خاکے شامل ہیں، اُن میں مرزا حیرت پر مضمون مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اس کی نشاندہی خود انھوں نے اپنے "دیباچہ" میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"میرے ایک ایرانی نژاد دوست مرزا حیرت کا بچا کھچا کلام لائے تھے، اور اس کے ساتھ یہ مضمون انگریزی میں لکھا ہوا مجھے دیا۔ اس کا ترجمہ اور حیرت کا کلام دونوں رسالہ "افسر" میں شائع ہوئے۔ شیخ چاند مرحوم نے یہ سمجھ کر کہ یہ میری تحریر ہے "چند ہم عصر" میں داخل کر دیا۔"

"چند ہم عصر" کے بقیہ تیئس ۲۳ خاکوں میں سب سے پرانی تحریر پروفیسر ری ہٹ سک پر ہے جو اوّل اوّل رسالہ "افسر" شمارہ جون ۱۹۰۱ء میں چھپی اور جسے تحسین سروری کے ہاتھوں "چند ہم عصر" کے چوتھے ایڈیشن میں پہلی بار شامل کیا گیا۔ آخری خاکہ خالدہ ادیب خانم کا ہے جو کتاب کے "آخری" ایڈیشن کے لیے لکھا گیا لیکن اس سے پہلے ہفت روزہ "لیل و نہار" کے سالنامے ۱۲۔ اپریل ۱۹۵۹ء (جلد: ۹ نمبر: ۱۵) میں شائع ہوا۔ اس طرح یہ شخصی مضامین ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۹ء تک مختلف مواقع پر کم و بیش ساٹھ سال کی طویل مدّت میں لکھے گئے۔

"چند ہم عصر" کے خاکے فرمائشی نہیں ہیں۔ مولوی عبدالحق نے انھیں کی سیرتیں لکھی ہیں جن سے وہ ذاتی واقفیت رکھتے تھے۔ نصیرالدین ہاشمی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ نے سرور جنگ ۔۔۔۔۔۔ پر لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ سرور جنگ کے حالات سے میں زیادہ واقف نہیں ہوں[1]"

نصیرالدین ہاشمی ہی کے نام ایک دوسرے خط میں مولوی عبدالحق نے اپنے نقطۂ نظر کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

"آپ نے سرور جنگ کے حالات کی فرمائش کی تھی، میں سرور جنگ سے زیادہ واقف نہ تھا۔ میں نے کبھی کسی ایسے شخص کے متعلق کچھ نہیں لکھا

---

[1] مکتوبات عبدالحق، ۳۵۱

جس کے حالات، خصائل اور سیرت سے مجھے پوری واقفیت نہ ہو۔ میں
نے سرور جنگ کو دیکھا ضرور ہے مگر ذاتی طور پر اُن کے حالات وغیرہ سے
ناواقف ہوں[1]۔"

"چند ہم عصر" کی سیرتیں "ذاتی اور پوری" واقفیت کی بنا پر لکھی گئی ہیں۔ اِس لیے اِس میں بعض اشخاص خصوصاً، سر سیّد، حالی، مولوی چراغ علی، مولوی سیّد علی بلگرامی اور میرن صاحب کے ایسے ضروری حالات اور بعض قابلِ عزت پہلو اس طرح یکجا مل جاتے ہیں، اور سامنے آتے ہیں کہ ان سے بہتر دوسری جگہ شاذ ہی ملیں۔ یہ "چند ہم عصر" کا ایک اہم امتیاز ہے۔

"نواب صدر یار جنگ مولوی حبیبُ الرحمٰن شروانی نے "مقدّماتِ عبدُالحق" کے دیباچے میں اِس اَمر پر حد درجہ افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہم اُس طبقے کو ابھی سے فراموش کر چکے جو سر سیّد سے شروع ہو کر وقار الملک پر ختم ہوا:

"کیسا ہی یہ عبرت ناک بیان ہو مگر واقعہ ہے کہ آج ------ سب سے زیادہ گُم ہستی سر سیّد احمد خاں مرحوم کی ہے، نام جاننے والے یا لینے والے بہت نکلیں گے مگر اُن کے حالات جاننے والا، اُن کے کارناموں سے متاثر ہو کر پیروی کا شوق رکھنے والا، مجھ کو کوئی نظر نہیں آتا۔ پس مولوی عبدالحق صاحب کی وُہ سعی جو اُنھوں نے اس طبقے کے کارنامے یاد دلانے کے لیے کی ہے، ہمارے شکر کی مستحق ہے۔"

"چند ہم عصر" میں سر سیّد کی سیرت و سوانح پر مولوی عبدُالحق کا شخصی خاکہ کم و بیش سوا سو صفحات پر مشتمل ہے، جو بجائے خود ایک الگ اور مستقل کتاب کو کفایت کرتا ہے۔ یہ بڑے خلوص اور خوبی سے لکھا گیا ہے۔ حالات و واقعات کی ضروری اور مناسب تفصیل پیش کی گئی ہے اور اُن مباحث کو الف سے صرفِ نظر کیا گیا ہے، جن کا مولوی عبدُالحق کو پورا اور ذاتی وقوف نہیں تھا۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام ایک خط میں مولوی صاحب سر سیّد سے متعلق اپنے اس مرقع کے بارے

---

[1] مکتوباتِ عبدُالحق، ۳۵۲

میں لکھتے ہیں:

"اس میں مَیں نے اُن کے مذہب اور سیاست کو نہیں چھیڑا۔ سیاست کا ذکر سَرسَری ہے۔ مذہب کے مُتعلّق اِس لیے کچھ نہیں لکھ سکا کہ اس بارے میں میرا علم جہل سے بدتر ہے ۱۔"

غرض ذاتی واقفیت، مُرقّع نگاری کے سلسلے میں مولوی عبُدالحق کی ایک بُنیادی قدر ہے جس کا اُنھوں نے ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ اس قدر کا نتیجہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کا تراشیدہ کوئی مُرقع، سَرسَری یا ہَوائی نہیں۔

مُقدمہ "مآثر الکرام" میں مولوی عبُدالحق نے ضمناً ایک بات کہی ہے۔ جس میں سیرت کشی کے لیے اُن کے میزانِ انتخاب کا اشارہ مخفی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

"پند ونصائح اور اخلاقی کُتب اِس قدر مفید نہیں ہوتیں جس قدر اُن لوگوں کے تذکرے، جو خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے ۲۔"

سر سیّد کے مُرقع میں مولوی عبُدالحق نے اپنے اِسی خیال کی وضاحت اِن لفظوں میں کی ہے:

"اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسّر آتے ہیں لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم، تعلیم نہیں رہی ------ رہا صالح ماحول اور صحبت تو وُہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ اُن بزرگ اور اُولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے، جنھوں نے اپنی قوم یا مُلک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مُصیبتیں اور دُکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہ نُمائی کا کام دیں گے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے ۳۔"

---

۱ مکتوباتِ عبدالحق، ۳۳۷

۲ مقدماتِ عبدُالحق، (مُرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی) ۲۴۲

۳ "چند ہم عصر" (اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع ۱۹۵۹ء) ۳۳۵ و بہ بعد

اِس اشارے اور اقتباس سے بجا طور پر یہ نتیجہ مُرتب کیا جاسکتا ہے کہ اُن کے نزدیک "ہیرو" کا اولوالعزم، صاحبِ ایثار، بندۂ استقلال، اخلاص مند اور بے نفس و بے ریا ہونا شرط ہے۔ مَولوی عبدالحق، شخص کے اخلاقی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ سیرت کشی کے لیے اُن کا میزانِ انتخاب بھی یہی ہے اور مطمعِ نظر بھی۔ چُنانچہ جہاں تہاں وُہ ہر سیرت سے اس طرح کا کام لینے کی کوئی صورت پیدا کرتے ہیں۔ یوں دیکھیے تو اخلاق آمیزی اور سبق آموزی مَولوی عبدُالحق کی مُرقّع نگاری کی ایک دوسری بدیہی قدر ہے۔

مَولوی عبدُالحق کے نزدیک انسان کا بہترین مُطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں وُہ امارت اور افلاس کا کوئی فرق رَوا رکھتے ہیں اور نہ ایسی کسی دوسری ہی حد بندی کے قائل ہیں۔ اُنھیں انسانیت سے پیار اور اعلیٰ انسانی اَقدار سے عشق ہے۔ وُہ سچائی، نیکی اور حُسن کو کسی کی میراث نہیں سمجھتے۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ممکن ہیں، جیسی اُونچی ذات والوں میں۔ اُن کا نقطۂ نظر بے حد وسیع ہے جو ایک اعلیٰ فنکار کی شان ہے۔ وُہ قوموں اور طبقوں کے امتیاز کو مَصنوعی سمجھتے ہیں۔ اُن کا ایمان ہے کہ کتنا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دُنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوسکتی اور اَچھے بُرے ہر قوم میں ہو سکتے ہیں۔ اِسی لیے اُنھوں نے سَر سیّد، حالی، مَولوی چراغ علی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، نواب عماد الملک نواب محسن الملک اور مَولوی سیّد علی بلگرامی ایسے مُتبحر اہلِ علم و فن —— اور سیّد محمود مَولوی عزیز مرزا، راس مسعود، خواجہ غلام الثقلین، مَولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، عبدالرحمٰن بجنوری، پروفیسر ژی ہٹ سک، عبدالرحمٰن صدیقی اور ڈاکٹر اقبال ایسے نامور اور لائق فرزندوں کے دوش بدوش، ایک غریب سپاہی نور خاں اور ایک مالی نام دیو کے مُرقّعے بھی تراشے ہیں، اور اس فہمائش کے ساتھ کہ:

"کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، اَمیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں بلکہ غریبوں (اور عامیوں) میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔[۱]"

---

[۱] چند ہم عصر، ص ۱۲۴

اِن خاکوں کے ذریعے مولوی عبدالحق نے نور خان اور نام دیو کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اور خود مولوی عبدالحق کے ادبی "نامۂ اعمال" سے اُن کی طول طویل خدمات حذف کر دی جائیں تو بھی محض اِن دو خاکوں ہی سے اُن کی انسانی دوستی، وسیع النظری اور عظمت و بزرگی اپنی جگہ مسلّم رہتی ہے اور وُہ انسانیت کے بہت بڑے علم بردار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جا سکتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کے نزدیک انسان کی بُرائیاں ہی اُس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں، بعض اوقات اُس کی خوبیاں بھی اُسے لے ڈوبتی ہیں۔ مولوی صاحب محض نیکوں ہی کے بہی خواہ نہیں، وُہ بدوں سے بھی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور دُنیا کی بہت کچھ رونق کا ذمہ دار انہیں قرار دیتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ دُنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص برائی۔ اِس طرح نہ انسان بے عیب ہُوا ہے نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ اپنے "ممدوح" کے محض حُسن ہی سے سروکار نہیں رکھتے، اُس کے عیوب و نقائص کا ذکر بھی کر دیتے ہیں۔ اور یوں اُن کی سیرت نگاری کسی مرحلے پر بھی "پروپیگنڈا" نہیں ہونے پاتی۔ حالی کو وہ "بے مثال خصائل کا بزرگ"[1] کہتے ہیں اور اُن کی پاک سیرتی کے بڑے مدّاح ہیں لیکن اُن کی کمزوری سے چشم پوشی نہیں کرتے:

> نام و نمود چھوڑ کر نہیں گیا تھا، ورنہ شہرت وہ بَد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے ۔۔۔۔۔ ہاں، شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آ گئی ہے[2]"

مولوی محمد عزیز مرزا میں مولوی عبدالحق کو وُہ تمام اوصاف دکھائی دیتے ہیں جن کی مُلک و قوم کو اُس وقت سخت ضرورت تھی[3] لیکن وُہ اُن کی خوشامد پسندی[4] کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ شمس العلما ڈاکٹر مولوی سیّد علی بلگرامی مولوی عبدالحق کے نزدیک:

---

[1] چند ہم عصر، ۱۶۱ [2] چند ہم عصر، ۱۶۸
[3] چند ہم عصر، ۶۶ [4] چند ہم عصر، ۶۵

"ہندوستان کے عہدِ جدید کے اُن نامور علماء میں سے ہیں جنھوں نے علم دانسۂ مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدّن، علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی[1]" لیکن اِس کے ساتھ وُہ اُن کی شخصی خامیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں:

"مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلوّن مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حُبِّ جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو اُن کی شان کے شایان نہ ہوتی تھیں[2]"

حکیم امتیاز الدین کو مولوی عبدالحق اپنا بے مثل دوست کہتے ہیں[3]۔ لیکن اِس محبت میں وُہ اُن کی طبیعت کی کمزوری اور اُن کے مزاج کے لااُبالی پَن کو نہیں چھپاتے[4]۔ نواب محسن الملک کی وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی کے مولوی عبدُالحق بڑے مدّاح ہیں[5]۔ لیکن اِس مدّاحی کے باوجود نواب محسن الملک کی کمزوری کو حد درجہ قابلِ افسوس گردانتے ہیں کہ وُہ گورنرِ وقت کی دھمکی پر اُردو کی حفاظت میں قائم ہونے والی انجمن سے دستبردار ہو گئے[6]۔ وُہ سرسیّد راس مسعود کی طبّاعی، ذہانت، قابلیت صلاحیت اور حافظے کے قائل ہیں[7]۔ لیکن اِس "معتقدی" کے ساتھ ہی وُہ اُن کی شخصی کمزوریوں کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے:

"مسعود میں مُقابلے کی قوّتِ مُطلق نہ تھی۔ وُہ بڑے ذکی الحس تھے، ذرا سی مُخالفت سے پریشان ہو جاتے تھے۔ خاص کر جب کسی دوست کی طرف سے مُخالفت ہوتی تھی تو اُنھیں بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ اِس میں وُہ بہت مُبالغہ کرتے تھے۔ اور اکثر عقل پر جذبات غالب آجاتے تھے[8]"

اُردو نثر میں انقلاب اور ترقی اور اس کی وسعت و ادبی صلاحیت کو وُہ سرسیّد کا طفیل گردانتے ہیں[9]۔ لیکن اِس ردّ میں وُہ اُن کی خامیوں کو نظر انداز

---

[1] چند ہم عصر، ۶۷
[2] چند ہم عصر، ۱۰۶
[3،4] چند ہم عصر، ۱۱۶
[5] چند ہم عصر، ۱۳۹
[6] چند ہم عصر، ۱۵۰
[7] چند ہم عصر، ۲۰۰، ۲۰۴
[8] چند ہم عصر، ۱۹۸
[9] چند ہم عصر، ۲۸۵

نہیں کرتے :

"اُنھیں اَدائے مَطلب میں صفائی اور سادگی کا اِس قدر خیال تھا کہ بعض اَوقات وُہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسنِ بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے اکثر اُن کی عبارت سُست اور پھُس پھُسی معلوم ہوتی ہے" [1]

مُولوی عبدُالحق، حسرت موہانی کی بے پایاں رُوحانی قوت، اخلاقی جرأت اور خُلوص و صداقت کے مُعترف اور مُعترف ہیں [2]۔ لیکن اِس عزتے میں وُہ اُن کی انتہا پسندی کو نہیں بھُولتے [3] وقاب عمادُالملک کی بے دریغ علمی سرپرستی، علمی فیض رسانی فاضلانہ استغنا، اعلیٰ سیرت اور بے لوث کردار پر اچھے لفظوں کے خراج کے ساتھ ساتھ، نئی طرزِ معاشرت اور آئے دِن کے تغیرات سے پیدا شدہ اُن کی بیزاری اور تن آسانی کا بھی ذکر کرتے ہیں [4]

اِس توازن اور غیر جانب داری کا نتیجہ ہے کہ اُن کی سیرت نگاری پر نہ صرف یہ کہ مناقب یا افترا کا الزام نہیں آتا، اُن کے کسی مُمدوح پر فرشتے یا شیطان کا گُمان نہیں ہوتا بلکہ اِس کے برعکس یہ سیرتیں جامد، یک رُخی اور نادیدہ معلوم ہونے کے بجائے مانوس، مدوّر اور مُکمل معلوم ہوتی ہیں۔ اِسی "توازن" نے مولوی عبدالحق کے تراشیدہ مُرقعوں کو سدا بہار اور اُن کی سیرت نگاری کے فن اور عمل کو کلاسیکل بنایا ہے۔

سیرت نگاری اور سوانح عمری میں پھیلاؤ اور سمٹاؤ کے امتیاز سے قطع نظر، بہ اعتبارِ فن بنیادی فرق ہے۔ سوانح عمری سے انصاف کے لیے تاریخی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ جامد واقعات اور اَٹل حقائق سے آنکھیں چار کرنا ہوتی ہیں، جس کے لیے لامحالہ ایک ٹھہراؤ اور سکون درکار ہوتا ہے۔ سیرت نگاری میں تاریخی واقفیت سے زیادہ شخصی تاثر کی دھوپ چھاؤں کو اَسیر کرنا پڑتا ہے اور چند اَہم اور خیال افزا اشارو

---

[1] چند ہم عصر، ۲۹۲

[2] و [3] چند ہم عصر، ۱۶۱ و ۲۶۳ (علی الترتیب)

[4] چند ہم عصر، ۳۵۴

اور شخصیت کی رنگارنگی میں سے کچھ نمایاں اور نمائندہ نقوش کے محتاط انتخاب سے پوری شخصیت کو اُجاگر کرنا ہوتا ہے۔ پھر اِس عمل میں ایک طرح کی تیز روی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ شخصیت کی نیرنگیاں ایک آن جھلک دکھا کر، کسی مجموعی، تیکھے اور واضح نقش کے اُبھرنے میں مُعاون ہو سکیں۔

مُولوی عبدُالحق کی سیرت نگاری میں ہمیں اِنفرادی شخصی تاثر کے ساتھ تاریخی اور واقعاتی چھینٹے بھی ملتے ہیں۔ اِس خُوش گوار امتزاج نے اُن کی مُرقّع نگاری میں تنظیم و تہذیب اور اُن کے محاکات کی فضا میں سرشاریٔ حیات کی کرامت پیدا کر دی ہے۔ "شعر اور شاعری" کے بارے میں اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کرتے ہوئے مُولوی عبدُالحق نے ایک جگہ لِکھا ہے کہ:

"شاعری کے انقلاب اور تغیرّات اپنے زمانے کے انقلابات و تغیرّات سے وابستہ ہوتے ہیں شاعر کو شاعری سے اور اُس کے زمانے سے الگ کر کے دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو اُس کے احباب اور عزیزوں اور اُس کے وطن سے جُدا کر دینا۔ جب ہم شاعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات اُس کی طبیعت، اُس کے خصائل اور عادات پر نظر ڈالیں اور اس کے بعد اُس کے عہد کے واقعات و حالات و تغیرّات و انقلابات کا ذکر کم سے کم اِس حد تک ضرور کریں جہاں تک اُن کا تعلّق شاعر اور اس کی شاعری سے ہے کیونکہ یہ مُمکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اُس کی شاعری، اپنے عہد کے حالات سے مُتاثر ہوئے بغیر رہ سکے[۱]"

یہ کچھ شاعر ہی پر مَوقوف نہیں، کوئی بھی شخص اپنے عہد کے حالات سے کم یا زیادہ مُتاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیرت نگاری کے ذیل میں بھی مُولوی عبدالحق کا میزانِ معیار بعینہٖ یہی ہے وہ اپنے "ممدوح" کو کبھی اُس کے زمانے سے الگ

---

[۱] تنقیداتِ عبدُالحق، ۸۷

کر کے نہیں دیکھتے اور نہ اُس کے عہد کے حالات سے بے نیاز ہو کر اُس کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔

فرد کو اُس کے عہد میں رکھ کر سررشتۂ "اعتدال پر رہنا اور "کم سے کم حد" کا لحاظ رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ پُرخار پگڈنڈی ہے کہ جس پر چلتے ہوئے ذرا سی بے اعتدالی سے سیرت نگاری کے منصب سے گِر کر "واقعات کی کھتونی" کے داغ مقدّر ہو جانے میں دیر نہیں لگتی۔ مولوی عبدالحق کے ہاں "کم سے کم حد" کا فن بھرپور زندگی درعنائی اور پوری آب و توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور وُہ اپنے ممدوح کو اُس کے عہد کے تغیرات و انقلابات کے پس منظر میں پیش کرتے ہوئے بڑی چابکدستی اور ذمّہ داری سے کام لیتے ہیں:

"جس زمانے میں نواب صاحب پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا مسلمانوں میں مذہبی جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس کے متعدد اسباب تھے ان میں سے شاید ایک یہ بھی تھا کہ انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ مسلمان دولت و اقبال، جاہ و ثروت سب کچھ کھو چکے تھے، ایک مذہب رہ گیا تھا۔ اس لیے یہ انھیں اور بھی عزیز ہو گیا تھا۔ ذرا سی بدگمانی پر بھی اُن کے جذبات بھڑک اُٹھتے تھے۔ اُس وقت شاید ہی کوئی ایسا مصنّف یا ادیب ہو جس نے مذہب پر قلم فرسائی نہ کی ہو۔ یہاں تک کہ وُہ لوگ جنھیں مسلمان نیچری کہتے تھے اور اپنے خیال میں بدمذہب و بدعقیدہ سمجھتے تھے، اُن کا اوڑھنا بچھونا بھی مذہب تھا------
نواب صاحب مرحوم کو ابتدا سے مذہبی لگاؤ تھا۔ پہلے وُہ میلاد پڑھتے اور وعظ کہتے تھے، نیچری ہونے پر لکچر دیئے اور مضامین لکھنے لگے، لیکن ان سب کا تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مذہب سے تھا[1]"

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے

---

[1] چند ہم عصر (نواب محسن الملک)، صفحہ ۱۴۴ و بعد

ماحول اور حالات کی رو سے اُپنی تنظیم کرنا، اِس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے ۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں میں دو چار خاندان ایسے تھے جنھوں نے کش مکش کے ابتدائی دَور میں زمانے کے تیور پہچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لیے بڑھے اور زمانے کے ساتھ دینے میں کچھ پس وپیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رُخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا[۱]۔"

مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری کی ایک اور خصوصیت اُن کی سچائی اور بے باکی ہے۔ وُہ اُسلاف کی اُس نسل کی یادگار تھے، راست گوئی اور راست بازی جس کا طرۂ امتیاز تھا۔ وُہ کسی سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے اور ہر حال سچ بات کہہ گزرتے تھے، خواہ اس کے لیے اُنھیں کتنی بڑی سے بڑی قیمت ہی کیوں نہ اَدا کرنی پڑتی۔ اظہارِ حق سے وُہ کبھی نہ جھجکے۔ اس میں اُنہوں نے دوست، دشمن کوئی اور کسی طرح کا امتیاز رَوا نہ رکھا۔ مولانا محمد علی کی سیرت اور کردار اور شخصیت کا حقیقت آفریں اور جراَت مندانہ محاکمہ مولوی صاحب نے کیا اور ۱۹۳۲ء میں اُس وقت کہ جب مولانا محمد علی کی "خانہ زاد" موت نے اُنھیں ہند کے مسلمانوں میں بہت برگزیدہ، محترم اور متبرک بنا دیا تھا، مولوی عبدالحق کی بے باکی جراَت علامت مواخذہ اور متوازن سیرت نگاری کا شاہکار ہے۔ وُہ لکھتے ہیں:

"ہندوستانِ جدید میں جو انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کا مولد ہے، مولانا محمد علی مرحوم "عجیب وغریب" شخص ہوئے ہیں۔ وُہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اَوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیئر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت وشان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔۔۔۔۔ وُہ آزادی کا دل دادہ اور جبر واستبداد کا پکّا دشمن تھا، لیکن اگر کبھی اُس کے ہاتھ میں اِقتدار آتا تو وُہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وُہ محبت ومُروّت کا پُتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اِس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دَھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اُس کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن اِس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے ۔۔۔۔۔ وُہ جب کسی کام کو اُٹھاتا تو بڑی شان وشکوہ

---

[۱] چند ہم عصر، ص ۳۸۲ و بہ بعد

سے اُٹھاتا اور بڑی بڑی تیاریاں کرتا تھا۔ لیکن تکمیل کو پہنچانا اُس کی طبیعت میں نہ تھا ----۔ محمد علی مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھا۔ اُس کے رُفقا اور اُس کے ہم عصر اُس کے سامنے بَونے تھے مگر افسوس اُسے اپنے اُوپر قابو نہ تھا اور یہی اُس کی ناکامی کی اصل تھی[1]"

مولوی عبدُالحق کی سیرت نگاری کا ایک اور اہم اور ممتاز پہلو یہ ہے کہ وُہ کبھی زیرِ تحریر شخص کے مدِّ مقابل یا فریق کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ سیرت نگار کے طور پر اُنہیں ہمیشہ اپنے منصب کی ذمّہ داریوں اور نزاکتوں کا خیال رہتا ہے وُہ اُس فن کو برتنا خوب جانتے ہیں۔ نواب حبیب الرحمٰن شیروانی نے ٹھیک کہا ہے کہ مولوی عبدُالحق نے "چند ہم عصر" میں جس طرح حالات لکھے ہیں وُہ:

"نمونہ ہیں کہ کسی مُمتاز آدمی کے اُوصاف پر مُخالف، مُوافق رائے کس طرح ظاہر کی جائے[2]"

مولوی عبدُالحق نقائص اور عیوب پر استہزا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے محاکمے کو "وعظ" بناتے ہیں۔ بلکہ ایسے مواقع پر اُن کا لب ولہجہ بطورِ خاص نہ یا وہ ہی ہمدردانہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہو جاتا ہے اور اس وصف نے، جو انسانیت پر گہرے یقین کا نتیجہ ہے، اُن کی سیرت نگاری میں انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔ مولانا محمد علی کی سیرت کے سخت محاکمے کے بعد وُہ طعن و تشنیع کے تیر نہیں چلاتے بلکہ عام فکر اور تشویش کا اظہار کرتے ہیں:

"محمد علی مرحوم اس شخصیت اور قابلیت کے آدمی تھے کہ وُہ اپنے کاموں کے لیے گھر بیٹھے ہزاروں لاکھوں روپے جمع کر سکتے تھے۔ لیکن وُہ اِس بے دردی، بے پروائی اور غیر ذمّہ دارانہ طور پر اسے صرف کرتے تھے کہ اُن کے کام بھی برباد ہو جاتے تھے اور خود بھی قلّاش ہو جاتے تھے۔ ہم میں (خاص کر یو۔ پی والوں اور خصوصًا مُسلمانوں میں) اَب تک زمینداری کی شان

---

[1] چند ہم عصر، صفحہ ۱۵۲ و ما بعد

[2] مُقدمہ، مُقدمات عبدُالحق

قائم ہے جو بادشاہی شان کی نقل ہے۔ ہم انتظام کرنا اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا بالکل نہیں جانتے۔ ہم صرف ایک ہی بات جانتے ہیں۔ لوٹنا اور لٹانا!
۔۔۔۔۔محمد علی کی زندگی بہت سبق آموز اور نہایت عبرت انگیز ہے۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں بہتر سے بہتر اور قابل سے قابل شخص بھی ابھی بہت پیچھے ہے۔ ہماری ناکامی کے اسباب خود ہم میں موجود ہیں۔ آج جس شئے کے لیے ہم لڑ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہم اس کے قابل نہیں۔ ہم جب اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام، ہماری طبیعتیں ناتربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔ جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں، اس کے لیے پختہ سیرت اور اعتدالِ طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دور ہے۔[1]

"چند ہم عصر" کی اہمیت اسی قدر نہیں کہ اردو ادبیاتِ عالیہ میں سیرت نگاری کے لیے اسے نشانِ راہ کا درجہ حاصل ہے بلکہ اس کی اہمیت بہت کچھ یوں بڑھ جاتی ہے کہ مولوی عبدالحق نے سیرت نگاری کے لیے جن بنیادوں پر کچھ یادگارِ زمانہ شخصیتوں کا چناؤ کیا، ان کی جن خوبیوں کو سراہا اور جن شخصی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے، اس سے نیک و بد کے بارے میں خود مولوی عبدالحق کے اپنے معیار، معتقدات و اولیات مرکزی اقدارِ حیات اور ان کے بنیادی انسانی زاویۂ نگاہ اور نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔"

خوش معاملگی، مہر و وفا، ہمدردی، مروت، بے نفسی، بے ریائی، رواداری، سیر چشمی اور عالی ظرفی کو مولوی عبدالحق انسانیت کا جوہر تصور کرتے ہیں۔ سچائی، اصول پرستی، وضع داری، آن بان اور خودداری کو طرۂ اشراف جانتے ہیں۔ اخلاق کو انسان کی فضیلت اور برتری کی اساس ٹھہراتے ہیں۔ انسانیت ان کے نزدیک ایثار سے عبارت ہے۔ وہ کمال کو شوق اور محنت، اور بے تعصبی کے وصف کو طبیعت کی انصاف پسندی کا خانہ زاد تصور کرتے ہیں۔ خود ہمتی کو بڑے پن کی علامت ٹھہراتے ہیں اور جلبِ زر کو عارضۂ خیال

---

[1] چند ہم عصر، ۱۴۵ ادبہ بعد

کرتے ہیں اور ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت کو عیب اور خوشامد پسندی کو انسانی ضعف سے تعبیر کرتے ہیں۔

قومی اتحاد اور یگانگت کے لیے لباس کی یک رنگی کو مولوی عبدالحق ضروری سمجھتے ہیں لیکن مذہب اُن کے نزدیک ذوقی چیز ہے جسے علم وفضل سے کوئی واسطہ نہیں صحیح ذوق کو وُہ زندگی کی جان تصوّر کرتے ہیں، اور اس کے بغیر علم وفضل کو بے نتیجہ اور بے ثمر گردانتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد اُن کے نزدیک فکر کو جِلا بخشنا ہے اور ایسی تعلیم کو جو صحت کے ساتھ واقعات پر نظر ڈالنے کی اہلیت پیدا نہ کرے، وُہ بے معنی خیال کرتے ہیں۔ زندہ دلی کو وُہ سلامتِ طبع اور رجائیت کی نشانی اور ظرافت کو دلیلِ ذہانت متصوّر کرتے ہیں۔ اور روشِ زندگی میں حُسن کاری کے لیے اُن کے نزدیک قدیم وضع اور جدید تہذیب کا امتزاج ضروری ہے۔

سادہ زبان لکھنے کو وُہ آسان نہیں سمجھتے اور سلاست کے ساتھ ساتھ لُطفِ بیان اور اثر کو بھی بُنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور اور دستگاہ ہو۔ تحریر یا تقریر کا مقصد اُن کے نزدیک یہ ہے کہ لوگ اُسے پڑھیں اور اثر قبول کریں اور جو یہ خوبیاں مفقود ہوں تو ایسی تحریر کو وُہ بیکار محض اور تضیعِ اوقات کا باعث قرار دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کسی تحریر یا ادب کی پُشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ ضبط اور اعتدال اور لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال اُن کے نزدیک ادیب اور ادب کا بڑا کمال ہے۔

کام اُن کے نزدیک اُسی وقت کام رہتا ہے جب اس میں لذّت آنے لگے۔ بے مزہ کام کو وُہ بیگار کہتے ہیں۔ اُن کا ایمان ہے کہ یہ کام اور کردار ہی ہے جو دُنیا میں اَللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتا ہے اور اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے ہی میں اُن کے نزدیک ساری بڑائی اور نیکی ہے اور نیکی کو وُہ اُسی وقت تک نیکی خیال کرتے ہیں، جب تک کہ آدمی کو اس کا احساس نہ ہو۔ چند تراشوں سے مولوی عبدالحق کے اعتقادات وایقان، اُن کے بنیادی انسانی زاویۂ نگاہ اور ادبی وفنی نقطۂ نظر کے سمجھنے میں سہولت ہوگی:

"اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ہر کوئی اس کی قدر نہیں کر سکتا۔ اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھولتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔"

(دگدڑی کا لال نور خاں، ۱۲۵)

"وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں ----- ان کی زندگی بے لوث تھی۔ اور ---- (اس کا) ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا ---- قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خان ہوتے"

(دگدڑی کالال نور خاں، ۳۸ - ۱۳۷)

"ان کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں جسے ہم کمال کہتے ہیں، وہ انھیں دونوں کا خانہ زاد ہے۔

(مولانا وحیدالدین سلیم، ۱۲۳)

"ایک بات ان کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے غدر کے ہنگامے میں ان کے استاد لاپتہ ہوگئے یا مارے گئے تھے۔ انھوں نے دو لڑکیاں چھوڑی تھیں جو بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ میرن صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو ڈھونڈ کر اپنے گھر لے آئے اور اپنی بیٹیوں کی طرح انھیں پالا پوسا اور ایسی محبت و شفقت کی کہ وہ باپ کو بھول گئیں ---- حق شاگردی شاید کسی نے اس طرح ادا کیا ہو۔ یہ وضع داری، یہ محبت و شفقت اور ایثار، اب کہاں نظر آتا ہے۔ اپنے کو مٹا کر دوسروں کی خدمت کرنا یہی جوہرِ انسانیت ہے۔

(میرن صاحب صفحہ ۲۲۳ و بہ بعد)

"تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔"

(حالی، صفحہ ۱۶۳ و بہ بعد)

"ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پُرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔۔۔۔ مولانا اِس عیب سے بَری معلوم ہوتے ہیں۔"

(حالی، ۱۷۶)

"قومی لباس کا ایک ہونا قومی یگانگت اور اتحاد کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے زبان اور مذہب کا ایک ہونا۔"

(سرسید احمد خاں، ۲۵۸)

"اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا ہے، وہ خود کبھی نہیں بڑھتا، اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اُس سے زیادہ کھوتا ہے۔"

(مولوی چراغ علی، ۱۳)

"بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ محبت اور ہمدردی اُن کی گھُٹی میں تھی۔۔۔۔۔ وہ بہت بے نفس شخص تھے۔ جلبِ زر کا عارضہ جو آج کل نئی تانتی میں عام طور پر پایا جاتا ہے، اُن میں بالکل نہ تھا۔"

(ڈاکٹر محمد اقبال، صفحہ ۳۵۷ و ۳۵۹)

"مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ درگذر کا یہ عالم تھا کہ اُن سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے اُن کے تعلقات میں فرق نہ آتا تھا۔ اِس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی۔ اَخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صُحبت میں آسکتے ہیں۔"

(حالی، ۱۸۳)

"باوجود زبردست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ نہ تھے۔ یہ ذوقی چیز ہے۔ اِسے علم سے کوئی واسطہ نہیں۔"

(مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، ۱۱۹)

"صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے، نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اِس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سُہانی سی روشنی آجاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور

اَوگھٹ گھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔"

(نواب عماد الملک، ۳۳۴)

"سیّد محمود معمولی سے معمولی بات میں وُہ شان پیدا کر دیتے تھے، جو دوسروں کو نہیں سوجھتی تھی۔ اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے ہر پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے لیے مُفید نہیں ہو سکتی۔"

(سیّد محمود، ۵)

"ظرافت، دلیلِ ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامتِ طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بارِ گراں کو ہلکا کرنے میں سب سے بڑی مُعین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن مرحلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔"

(سرسیّد احمد خاں، ۴۶۲)

"سادگی و پُرکاری کمالِ صناعی ہے۔ اِس میں اَدب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے معنی یہ نہیں کہ آسان اَلفاظ جمع کر دیئے جائیں ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لُطفِ بیان اور اَثر بھی ہونا چاہیے۔ یہ اُس وقت مُمکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو، اور اس کے ساتھ موضوعِ تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اِسی لیے کسی فن یا علم کی اِبتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے، جسے اُپنے فن یا علم پر کامل عبور ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وُہ کبھی اَپنے خیال کو صفائی اور خوبی سے اَدا نہیں کر سکتے۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کا اثر قبول کریں۔ اور لُطف اُٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار تضیعِ اَوقات ہے۔"

(سرسیّد احمد خاں، ۲۸۶ و بہ بعد)

"لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کہ لکھنے والے کے دِل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، اَدب کا بڑا کمال ہے دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر اَدب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے۔"

(حالی، ۱۶۸)

"ضبط اور اعتدال اُن کے بہت بڑے اوصاف تھے۔ اور یہ دو خوبیاں اُن کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ یہ ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ بات صرف اساتذہ کے کام میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ جوش میں آکر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے، اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے، اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلّانے لگتا ہے۔"

(حالی، ۱۷۲)

"انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اُس کی پونجی، یہی اُس کی آل اولاد اور یہی اُس کی کمائی ہے۔"

(مولوی چراغ علی، ۵۱)

"حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے سے ہی انسان بنتا ہے، اور اسی سے اُس کی سیرت بنتی ہے اور اسی سے اُس کے دماغی اور اخلاقی قوا کی جلا ہوتی ہے اِس سے مراد وُہ کام ہے، جس کے کرنے میں انسان کو لذت ملے اور شوق اُسے اور اُبھارے ورنہ کام، کام نہیں رہتا، بیگار ہو جاتی ہے۔"

(سر سید احمد خاں، ۳۲۶)

"نیکی اُس وقت تک نیکی ہے، جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وُہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی ------ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں پہنچنے کی کوشش میں ہی انسان، انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کُندن ہو جاتا ہے ــــــ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وُہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وُہ تو یہ پوچھے گا کہ مَیں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی، اُسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا۔ اور خلق اللہ کو اس سے کیا فائدہ پہنچایا۔"

(نام دیو مالی، صفحہ ۲۳۱ و بہ بعد)۔

"چند ہم عصر"، کے اِن متفرق اقتباسات سے صرف مولوی عبدالحق کے معتقدات

ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ شہ پارے داغ داغ اُن کے اعلیٰ درجہ کے مفکر ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ وہ دراصل بنیادی طور پر مفکر ہی تھے۔ لیکن زبان وادب کے پھیلاؤ اور بچاؤ کے سلسلے میں اُن کے طول طویل مجاہدے نے اُن کے اِس وصف کو ثانوی حیثیت دے دی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ زبان وادب اور شعر وفن کا مسئلہ ہو یا زندگی اور کائنات کا کوئی معاملہ فکر وعقل کا دامن کبھی اُن کے ہاتھ سے نہیں جاتا۔

اقوام وملل اور خاص طور پر مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب وعلل پر مولوی عبدالحق کی گہری نظر ہے اور تاریخی وتمدنی بصیرت وشعور ایسا پایا ہے کہ کم ہی کسی میں ہو گا۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی عقلیت پسندی، حقیقت پرستی، متوازن مزاجی، اصابتِ رائے اور منطقی استدلال وقوت کے سہارے ایسے گراں قدر نتائج اخذ کیے ہیں، جو صحت وتوانائی کی دولت سے مالا مال ہیں:

"کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلیٰ قابلیت کا ہونا ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہے اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی، تو اس کی ترقی شاہ راہِ تمدن پر بہت سست ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا میں اعلیٰ ترقی کی ہو۔"

(مولوی چراغ علی، ۲۱)

"مسلمانوں کو منظم طور سے احتجاج کرنا اور رل مل کے چلنا نہ پہلے آتا تھا، نہ اب آتا ہے اس لیے ہمیشہ خسارے میں رہے۔"

(سرسید احمد خاں، ۳۱۳)

"زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے وہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اٹھتے ہوئے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں۔"

(سر سید راس مسعود، ۱۹۷)

"چند ہم عصر" کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ شخصیتوں کا یہ انتخاب اور چناؤ محض سیرت کشی کی "خانہ پُری" ہی کے لیے نہیں تھا، وہ زندگی میں ان سے کہیں نہ کہیں متاثر رہ ہوئے۔ متاثر محض ان معنوں میں ہی نہیں کہ ان شخصیتوں کو انہوں نے اپنے تئیں

آدمیت و انسانیت کی مکمل اکائی اور عظمت و بزرگی، اور بڑائی کا معیار جانا، یقیناً اُنھوں نے ایسا سمجھا اور قدرتاً شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کی پیروی بھی کی، لیکن اِس سے قطع نظر اس انتخاب اور چناؤ کے پسِ پشت بہت کچھ ان شخصیتوں سے خود مولوی عبدالحق کی اپنی ذہنی ہم آہنگی، طبعی رجحان و میلان اور گذرانِ حیات کے ضابطوں اور اصولوں میں ایک گونہ اشتراک کو دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے نگارخانے میں ہمیں قدم قدم پر مولوی عبدالحق کی طبیعت کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ جگہ جگہ اُن کی اپنی پرچھائیاں اور جھلکیاں ملتی ہیں اور اُن کے آئینہ خانۂ فن کے عرض میں اُن کی اپنی شخصیت کا جوہر تڑپتا نظر آتا ہے ——— اور یہ "چند ہم عصر" کا بہت ہی نادر پہلو ہے۔ اِس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے یہاں اُن سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔[1]

شخصیتوں کو آڑ میں اُن کا جذبۂ بے اختیارِ شوق دیدنی ہوتا ہے، اور اُن پر "عشق پیشہ" میر کے ایسے "آفتِ زماں" کا گمان ہونے لگتا ہے، جو اپنے سارے مطلب پردے میں ادا کرے ہے۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا، غالب کے شاگردِ معنوی عبدالحق کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی اُفتاد پیش آئی۔ اُن کے دل کا معاملہ شخصیتوں کے انتخاب کے ہاتھوں کھل گیا لیکن یہ جگ ہنسائی اور رسوائی والا مضمون نہیں، جو شخص کوئی زبان بولتا اور لکھتا ہے اُس میں وہ کچھ نہ کچھ اپنی زندگی کے نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ قد اور قامت کے لحاظ سے جو جتنا بڑا ہوگا، اُتنا ہی اُس کی تحریر میں زندگی کا رچاؤ زیادہ ہوگا۔ زبان کو بولنے اور لکھنے والے لاکھوں اور کروڑوں ہوتے ہیں، لیکن چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو زبان و ادب پر اِس قدر اثر انداز ہوں، اور اتنے جذب سے لکھنے پر قادر ہو سکیں کہ تحریر میں اُن کی زندگی ہنستی بولتی، سانس لیتی دکھائی دینے لگے۔ میر، غالب اور عبدالحق ان ہی معدودے چند لوگوں میں سے ہیں۔ عبدالحق کی تحریروں سے اُن کے دل کے معاملے کا کھلنا اُن کی عظمت کا مظہر ہے ———

مولوی عبدالحق سادگی و پُرکاری پر ایمان رکھتے ہیں، اور آراستہ بیانی کو ضعفِ آدبیت کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ اُن کے انداز میں نراشں ہے نہ بانکپن، اور نہ ایسی چکاچوند ہی جو ایک ثانیے کو روشنی دکھا کر اندھیاروں کو اور گہرا کر دے بینائی کو، بصارت کو مفلوج کر دے۔ مہر و مرحمت مولوی عبدالحق کے مزاج و کردار کا جزوِ اعظم ہے۔ اُن کا اسلوب

---

[1] اِس ضمن میں ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کا مضمون "ذکرِ عبدالحق"، مطبوعہ "نقوش" لاہور۔ شمارہ ۱۰۲ صفحہ ۷۴ تا ۸۰

بھی انہیں اوصاف و صفات کا مظہر ہے۔ صدیوں کے مٹھاس سے مملو اُن کا مُشفقانہ، شگفتہ رَواں، دھیما اور ہمدردانہ لب و لہجہ ذہن کو شفاف، ہلکی سُہانی، یکساں اور مُستقل روشنی کی دولت عطا کرتا ہے۔

پروفیسر احتشام حُسین نے کہیں "چند ہم عصر" کے کسی خاکے کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے پڑھ کر ہمیں اپنے ماحول میں روشنی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ نثار احمد فاروقی نے ٹھیک کہا ہے[۱] کہ اس میں ممدوح کے کردار کی بلندی اور شخصیت کی دل کشی کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کے اندازِ نگارش کو بھی برابر کا دخل ہے —— مولوی عبدالحق کی تحریر میں مزاح کا عنصر شامل رہتا ہے، لیکن اُن کی مُسکراہٹ، وقار اور سنجیدگی سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ اس لیے ہنستے ہیں کہ ہنسنا "شئے لطیف" کا تقاضا بھی ہے، اور ایک کثیرالاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ بھی۔ لیکن بہتوں کی طرح محض ہنسانے اور ہنسنے کا کاروبار اُنہوں نے کبھی نہیں کیا۔ "چند ہم عصر" میں مولوی عبدالحق کے مزاج کی عام اور تیز جھلکیاں نہیں ملتیں۔ بایں ہمہ جہاں تہاں خاکوں میں ظرافت اور زندہ دِلی اس طرح موجود ہے، جیسے بادلوں سے چاندنی چھن رہی ہو۔ پُر وقار اور اُجیلے سے تبسم کی جھلک اُن کی تحریر میں بڑی شیرینی پیدا کر دیتی ہے[۲]۔

"چند ہم عصر" کے خاکوں میں سے کچھ تقریریں ہیں، بعض اصحاب کے حالات مولوی عبدالحق کے مکاتیب یا دوسری تحریروں سے اقتباس کر کے کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ یہ تحریریں خاکہ نگاری کے فن پر پوری نہیں اُترتیں اِنہیں فن کے مُقررہ آداب و معائر پر جانچنا ہے بھی زیادتی۔ اِس لیے کہ ان کا مقصود بالذات سیرت کشی نہیں تھا۔ یہ تحریریں خاکوں کے بطور لکھی ہی نہیں گئیں۔ یہ خاکے نامُکمل ضرور ہیں، لیکن خاکہ نگاری کی سب خوبیوں سے خالی نہیں — حکیم امتیاز الدین اور شیخ غلام قادر گرامی کے خاکے ایسے ہی ہیں۔ اِنہیں "ببر حاصل" تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن اِن میں شخصیت کے کلیدی پہلوؤں کی طرف ایسے ضروری اشارے یقیناً موجود ہیں

---

[۱] و [۲] نقوش شمارہ مئی ۱۹۵۹ء صفحہ ۸۲، ۸۳ (علی الترتیب)

جن کی بنیاد پر بھرپور خاکے لکھے جا سکتے ہیں۔

"چند ہم عصر" کی وہ سیرتیں جو خاص طور پر لکھی گئی ہیں، ہیئت و مواد دونوں کے اعتبار سے بڑی قابلِ قدر ہیں۔ ربطِ خاطر نے انہیں لکھوایا ہے، کاوش، توجہ اور سلیقے نے انہیں وقیع بنایا ہے۔ اِن میں سیرت پر محاکمہ بھی ہے اور عقیدت و محبت کا خراج بھی لیکن ہے یہ سب کچھ ایک خوش گوار امتزاج، توازن اور اختصار کے ساتھ۔ اُن کے ایک ایک جملے سے خلوص، محبت اور صداقت کا اظہار ہوتا ہے، اور اُن کے "ممدوح" ہمارے سامنے ہنستے بولتے، چلتے پھرتے اپنی واقعی شکل وصورت میں دکھائی دینے لگتے ہیں اور یہ سیرت نگاری کا بہت بڑا کمال ہے۔ نور خاں، نام دیو، میرن صاحب، سر سید، حالی، چراغ علی، سید علی بلگرامی، عماد الملک، محسن الملک اور راس مسعود کا شمار ایسے ہی خاکوں میں ہے، یہ عبدالحق کے شاہکار اور ادبِ اُردو کے جواہرِ آبدار ہیں، اِن کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔"

---

"مولانا عبدالحق کے خاکوں میں جو بیان کی شگفتگی اور شیرینی ہے، کہیں کہیں سنجیدہ بذلہ سنجی اور شوخیٔ گفتار ہے، تشبیہات واستعارات کا برجستہ استعمال، لب ولہجے کی بے ساختگی اور محاوروں کی چاشنی ہے، اس نے ان خاکوں کو اُردو انشاء پردازی کی بہترین مثال بنا دیا ہے۔"

—— ڈاکٹر خلیق انجم

# اُسلوب



○

"اُردو لکھنے کا جو مُفید، مُمتاز اور مُشکل اُسلوب مولوی صاحب کا ہے، اُسے اُردو کا بنیادی اسٹائل کہہ سکتے ہیں۔ اس اسٹائل نے اُردو کو دُنیا کی مشہور اور اہم زبانوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا ہے ——"

—پروفیسر رشید احمد صدیقی

"عبدالحق صاحب کے اسلوب میں طاقت، عصریت اور استواری پائی جاتی ہے۔ اس میں سادگی کے ساتھ ہلکی سی نمکینی ملتی ہے۔ تیزابیت کہیں نہیں مگر سنجیدہ تیکھاپن موجود ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو نثر کی صحت مندانہ روایت کو آگے بڑھانے میں بڑا اہم کام کیا ہے ——"

— ڈاکٹر اختر اورینوی

نثار احمد فاروقی

# مولوی عبدالحق کا اسلوب

اسلوب یا "طرز نگارش" کا مسئلہ ایسا نہیں جس پر کوئی فیصلہ کن اور دو ٹوک بات کہی جا سکے۔ آسان لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشیں بھی ہو اور منفرد بھی۔ اسی کو انگریزی میں (Style) کہتے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے "طرز" یا "اسلوب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی اور جدید فارسی میں "سبک" کہتے ہیں۔ ان الفاظ پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلوب میں "صناعی" (Ornamentation) کا مفہوم شامل رہا ہے،

سب سے پہلے انگریزی لفظ (Style) کو لیجیے۔ یہ یونانی لفظ (Stilus) سے نکلا ہے، جو ہاتھی دانت، لکڑی یا کسی دھات کا بنا ہوا ایک نوکیلا اوزار ہوتا ہے جس کے ذریعہ موم کی تختیوں پر حروف و الفاظ یا نقوش کندہ کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کی اصل (Stylus) بتاتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔

"۔۔۔۔ امتدادِ زمانہ سے وہ آلہ جس سے نقش بٹھا دیا جاتا تھا۔ خود اُن نقوش، جملوں یا عبارت کا مفہوم ادا کرنے کو استعمال ہونے لگا اور ایک عمل جو ابتداً میکانکی تھا، رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوّراتی بن گیا۔ یہ نقوش یا تو اُجاگر ہوتے تھے یا دُھندلے اور ناہموار جنھیں بعد کو (Stilus) کے دوسرے کند حصے سے سُدھارا جاتا تھا۔ ادب میں یہی کاٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور باریک بینی خود ادب کی اپنی ذات کی پرکھ بن جاتی ہے[۱]۔۔۔۔"

---

[۱] اثر لکھنوی: چھان بین، ۳۶۔

اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹائل میں ہمیشہ کاوش، صناعی اور مرصع کاری کا عنصر ضروری سمجھا گیا ہے۔ خیال تو خیر بنیادی چیز ہے، مگر اس کے ساتھ، قوت اظہار اور پیرایۂ بیان کی ندرت و انفرادیت بھی جب تک شامل نہ ہو، اچھا ادب وجود میں نہیں آسکتا۔

جدید فارسی اور عربی زبان میں اسٹائل کے لیے "سبک" استعمال ہوتا ہے، اصل میں یہ عربی لفظ ہے۔ سبک، یسبک (ضرب یضرب) کے لغوی معنی ہیں دھات کو پگھلانا اور سانچے میں ڈھالنا[1] چنانچہ ایسا سونا جسے کٹھالی میں ڈال کر میل سے پاک کر لیا جاتا ہے۔ سبیک یا مسبوک کہلاتا ہے اور دھات کی چیزیں ڈھالنے والی [illegible]، فونڈری کو مسبکۃ کہتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال بھی صنعت گری کا مفہوم ادا کرتا ہے اور اب اس کا مطلب کلام کو حشو و زواید سے پاک کرنا، لیا جاتا ہے۔

اب دوسرا لفظ "طرز" لیجئے۔ طرز یطرز (سمع یسمع) لباس فاخرہ استعمال کرنے کو کہتے ہیں۔ طرز اور تطرز (تفعل) کپڑے پر بیل بوٹے بنانے یا زردوزی کرنے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ الطرازہ زردوزی کے لیے اور المطرز بیل بوٹے بنانے والے یا زردوز کے لیے استعمال ہوتا ہے اسے طور، طریقہ، ہیئت یا ترتیب کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عربی میں کہیں گے: "ہذا علی طراز ذاک" یعنی "یہ اُس کے طریقے پر ہے"۔ طراز، عربیٔ جدید میں فیشن کے معنی بھی دیتا ہے۔

یہاں ضمناً یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ یہی طرز ترکی زبان میں پہنچا اور زردوز کے علاوہ، خیاط کے معنوں میں بھی منتقل ہوا۔ ت، ط اور د کی آوازیں قریب المخرج اور متبادل ہیں۔ ترکی سے اُردو میں آیا، وہاں طرزی تھا، یہاں درزی ہو گیا۔

---

[1] اس لفظ کے لغوی معنوں کے خصوصیات پر غور کیجیے تو دھات کو تپانا، اسے حشو و زوائد سے پاک کرنا، نکھارنا، پھر ڈھالنا اور ایک خوش نما شکل دیدینا، ایسا عمل ہے جو اچھے اسٹائل میں اسی طرح لفظوں کے ساتھ بھی دہرایا جاتا ہے۔ اسی میں اسلوب کی نفاست، پختگی اور پائیداری کا راز مضمر ہے۔

اب اسلوب کا لفظ دیکھئے۔ یہ طریقہ، راستہ، روش اور ڈھنگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسالیب اس کی جمع ہے۔ یہ فی الاصل متعین و متیقن روش کے لیے ہے۔ اسی لیے جب عربی میں کہتے ہیں "انفہ فی اُسلوب" یعنی "اس کی ناک ایک ہی ڈھنگ سے رہتی ہے" (یا وہ مغرور و متکبر ہے) تو اس میں انفرادیت کا تصور شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ادب میں بھی کسی کے مخصوص اندازِ نگارش کے واسطے بولا جاتا ہے، جس میں لکھنے والے کی شخصیت کے منفرد خط و خال نظر آئیں۔

کیا ہرج ہے اگر لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ ہندی میں اس کے لیے کون سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ پہلے تو لفظ "ریتی" استعمال کیا جاتا تھا اور سنسکرت ادب میں اب بھی زیادہ تر، یہی لفظ اسلوب کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن مغربی اُصولِ نقد و نظر کی اشاعت کے بعد ہندی میں "سبک" یا "طرز" کے لیے شیلی بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہندی میں (اپنے موجودہ مفہوم کے لیے) زیادہ پرانا نہیں، اگرچہ اس کی اصل لفظ شیل ہے جو اصول، برتاؤ، ڈھنگ اور ڈھب کا مفہوم ادا کرتا ہے، جیسے "پنچ شیل" میں ہے۔ شیلی کا مفہوم عین مین وہی ہے جو عربی میں اسلوب کا ہے۔

ان لفظ کی تشریح و تعبیر میں اتنی لمبی تمہید سے مدعا یہ تھا کہ (style) کے لیے ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ فی اَصلہٖ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی اسلوب بغیر "تصنع" یا آورد کے نہیں بنتا۔

یہاں یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ اُردو میں اسکے لیے ایک لفظ "انداز" بھی مستعمل ہے۔ میر تقی میر، اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے یہ لفظ ان مخصوص معنوں میں استعمال کیا:

"...... ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و اوّل محیط ہمہ صنعتہا ست تجنیس، ترصیع تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، اَدا بندی، خیال وغیرہ ایں ہا ہمہ در ضمن ہمیں است و فقیر ہم ازیں وتیرہ محظوظم ......"[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ "اُردو کے شاعروں میں سب سے پہلے میر نے طرز کو اہمیت دی اور سختی سے کاربند رہا۔ بعد ازاں دوسروں نے تتبع کیا۔"[2]

---

[1] میر: نکات الشعرا، ۱۸۰، طبع ثانی ۲۔ اثر لکھنوی: چھان بین، ۲۷

میر شاعر تھا اور اس نے طرز پر کار بندی غزل ہی میں کی لیکن ( Style ) کے لیے انداز کا لفظ میر نے بہت مناسب اور موزوں تجویز کیا۔ یہ لفظ اسلوب (شیلی) یا طرز سے زیادہ انفرادیت کا غمّاز ہے۔

اب مختصراً یہ دیکھنا چاہیئے کہ مختلف زبانوں اور زمانوں میں ( Style ) کی کیا تعریف کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور قول ڈاکٹر بوفان (Buffon) کا ہے جو اس نے سنہ ۱۷۵۳ء میں فرینچ اکادمی کے افتتاحی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

(Le Style Est L'homme meme) یعنی "اسلوب خود انسان ہے"[1] بوفان کا مطلب یہ تھا کہ مصنف کی شخصیت اپنے تمام نشیب و فراز اور رنگ و آہنگ کے ساتھ الفاظ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ ایمرسن نے یہی بات ذرا سی تبدیلی کے ساتھ کہی تھی اور ہمارا خیال ہے کہ وہ صحیح تشریح کرتا ہے:[2]

(A man's style is his mind's voice) اسلوب کو "ذہنی آواز" کہنا یوں بھی زیادہ قرین حقیقت ہے کہ اس میں انفرادیت اور افتادِ ذہنی کا پرتو اسی کی سفارش کرتے ہیں۔ ایک خیال مشترک ہو سکتا ہے۔ اس کے اظہار کے الفاظ بھی وہی ہو سکتے ہیں۔ اگر فلا بیر کا قول تسلیم کر لیا جائے کہ ایک فعل، ایک اسم اور ایک حرف ایک ہی مفہوم کے لیے وضع کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ ذہنی اختلاف ہے جو طرزِ ادا میں علیحدگی پیدا کرتا ہے، اور مصنف کی انفرادیت کو منعکس کر دیتا ہے۔ ملک الشعراء محمد تقی بہار نے یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے:

"سبک در اصطلاح ادبیات عبارتست از روش خاص ادراک و بیان افکار بوسیلۂ ترکیب کلمات و انتخاب الفاظ و طرز تعبیر۔ سبک بیک اثر ادبی وجۂ خاص خود را از لحاظ صورت و معنی القا می کند و آں نیز بنوبۂ خویش وابستہ بطرز تفکر گوینده یا نویسنده در بارۂ "حقیقت" می باشد۔" ٥

---

1. See: Encyclopaedia Britannica Vol: 21 pp: 488
2. Journals V. X pp: 457

٥ محمد تقی بہار: سبک شناسی جلد اوّل مقدمہ د (طبع تہران)

لیکن یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تھامس جیفرسن کا خیال تھا کہ بچپن میں جب انسان کا ذہن اثر پذیری کی زیادہ صلاحیتیں رکھتا ہے، ہر چیز کا نقش جلد قبول کر لیتا ہے، اور طبیعت میں بھی جولانی ہوتی ہے، اسی وقت سے اس کے طرز یا اسلوب کی نشو و نما شروع ہو جاتی ہے۔

ایبرسن کے مذکورہ بالا قول، اور جیفرسن کی رائے کو ذہن میں رکھئے، پھر غور کیجئے تو یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ اچھے اسلوب کے واسطے الفاظ پر حاکمانہ اقتدار، لکھنے پر پوری قدرت، اظہار میں کامل سہولت، در و بست کی صلاحیت اور انتخابی ملکہ ناگزیر ہے۔ تھامس گرے کی مشہور (Elegy) کا ایک مصرع:

The ploughman homeward plods his weary way.

ایک جگہ اس طرح لکھا گیا تھا کہ یہی الفاظ، قواعد کی صحیح ترتیب کے ساتھ (۶) صورتوں میں آ سکتے ہیں لیکن صرف موجودہ صورت ایسی ہے جو نہ صرف مفہوم کو پورا پورا ادا کرتی ہے بلکہ جس ترتیب سے الفاظ رکھے گئے ہیں، شاعر کا مقصود بھی اسی ترتیب اور درجہ میں کلام کا زور پیدا کرنا ہے۔ مثلاً:

His weary way the ploughman homeward plods.

مگر اس میں زور (Weary way) پر آتا ہے، جو شاعر کا مقصود نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

الفاظ کی ترتیب اور انتخاب کا سلیقہ یقیناً بنیادی اہمیت رکھتا ہے (Homer) نے کہا تھا کہ[1] (Nor can one word be changed but for a worse)

الفاظ کے انتخاب اور در و بست کا یہ کمال حافظ، سعدی، فردوسی، میر، اور انیس کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ نثر میں غالب، آزاد (محمد حسین)، عبدالحق اور ابوالکلام کی تحریروں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اردو کا کوئی نثر نگار، اردو کے شاعروں کی طرح الفاظ کے انتخاب کا اعلیٰ معیار پیش نہیں کرتا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نثر کی نسبت نظم میں فکر و تامل کے لیے زیادہ مہلت ملتی ہے۔

---

۱۔ Homer: Odyssey, Bk. VIII, 1. 192.

انتخابیت کے لیے علم اور تجربے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے میں نے شروع میں اس بات پر زور دیا کہ کوئی اچھا اسٹائل بغیر صنعت یا آورد اور محنت کے نہیں بن سکتا۔ گویا وہ مصنف کے ذہن کی گونج بعد میں ہے، محنت اور مرصع کاری کا طالب پہلے۔ میرے اس خیال کی تائید ایڈورڈ گبن کی تشریح سے بھی ہوتی ہے[۱]۔

اور سوئفٹ (Swift) کے نزدیک تو (Style) عبارت ہی انتخاب سے ہے۔ وہ اسلوب کی تعریف (Proper words in proper places) کرتا ہے[۲]۔ الفاظ کے انتخاب میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ خیال کو مصور کر دیں۔ اگر ان کی صوتی کیفیت کا پورا خیال رکھا جائے تو عبارت میں زور، دل نشینی، اور اثر انگیزی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ظفر علی خاں کا یہ شعر، جس میں جنگل کے سنسان ہونے کا نقشہ ایسے مناسب لفظوں میں کھینچا گیا ہے کہ شاید اس سے بہتر پیرایہ ممکن نہ ہو:

ہُو کا عالم تھا وہاں، کرتا تھا جنگل بھائیں بھائیں!
سنسنی اٹھتی تھی، سن سن کر ہوا کی سائیں سائیں!

اس میں "ہُو"، "بھائیں بھائیں"، "سنسنی"، "سن سن کر"، "سائیں سائیں" یہ سب الفاظ بھرپور صوتی کیفیت رکھتے ہیں۔ یا مثنوی سحرالبیان کا یہ شعر:

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

اور گلزارِ نسیم کا یہ موقع:

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی
خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

اسی طرح فارسی کا یہ شعر:

ز نقارہ آواز آمد بروں
کہ دون است دون است گردون دوں

اسی طرح میر کے وہ اشعار جو "تصویریت" لیے ہوئے ہیں[۳]۔ یہ سب اچھے نمونے

---

۱. Gibbon: Miscellaneous Works, V.I p.145
۲. Swift: Defination of a Good Style.

۳۔ مزید تفصیل کے لیے: اثر لکھنوی: مقدمہ مزامیر جلد اول
شبلی نعمانی: شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر

ہیں۔ الفاظ کی یہ اہمیت اتنی بات سمجھانے کے لیے ظاہر کی گئی کہ اچھے خیال کا حسن پوری طرح دوسرے کے ذہن میں منتقل کرنے کے واسطے اچھے الفاظ بہت ضروری ہیں۔ الگزنڈر پوپ کا یہ مشہور قول ایک بار لارڈ چسٹر فیلڈ نے بھی اپنے خط میں (۲۶۔ نومبر ۱۷۴۹ء) لکھا تھا کہ[1]

Expression is the dress of thought;
And still appears more decent as more suitable.

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فلابیر نے کہا کہ طرز و اسلوب، خیال کا لباس ہی نہیں، اس کی کھال ہے، یعنی اگر وہ نہیں تو نرا خیال "جذامی" معلوم ہوگا۔ اسٹائل کی اہمیت پر زور دینے والوں میں الگزنڈر اسمتھ یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتا کہ "خیال سے زیادہ پائدار اور لازوال شئے ادب میں اسلوب ہے۔"

لیکن اس تمام بحث کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اسٹائل محض صنعت گری، ترصیع، محنت انتخاب الفاظ، یا بازئ الفاظ ہے۔ (Joubert) کی یہ بات توجہ کی مستحق ہے کہ الفاظ کا صحیح استعمال، مناسب خیال کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ "کوئی اچھا لفظ استعمال کرنے سے پہلے اس کی اچھی جگہ تلاش کرو۔"

بعض مخصوص الفاظ کسی مصنف کے ذہن کا آئینہ ہوتے ہیں[2] یہ بھی دو طرح کے ہیں۔ یا تو وہ عام استعمال کے الفاظ ہوں گے مگر ایک مصنف کی تحریر میں اتنے استعمال ہوں گے کہ اس کی مخصوص افتادِ ذہنی، طبعی رجحان اور زاویۂ فکر کا نشان بن جائیں گے، یا بعض مصنفوں کے فن پاروں میں نئے اور غیر مانوس الفاظ ایسی خوبی اور خوبصورتی سے استعمال ہوں گے کہ نہ صرف اس کے اسٹائل کو دل پسند اور دل نشین بنا دیں گے بلکہ اس کی انفرادیت کو زیادہ نمایاں کر دیتے ہیں۔ اردو میں اس کی مثال مہدی افادی، سجاد انصاری عبدالحق اور ابوالکلام کی تحریروں سے دی جا سکتی ہے۔ مہدی اور سجاد، الفاظ وضع کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ ابوالکلام اکثر پرانے سکوں کو نیا صیقل دے کر چلاتے ہیں مگر عبدالحق سکۂ رائج الوقت کی قیمت کے شناسا ہیں۔ وہ مانوس الفاظ سے اپنی تحریر میں وزن پیدا نہیں

---

1. Pope; Essay on criticism pt. ii. l. 118 (1712)
2. اس کی وضاحت کے لیے سید عبداللہ: بحث و نظر

کرتے۔ اس لحاظ سے مہدی افادی کا اختراعی کارنامہ لائقِ تحسین ہے مگر نئے الفاظ کی وضع وتراش بہت نازک معاملہ ہے۔ ( Ben Jonson ) نے کہا تھا کہ "نئے الفاظ وضع کرنا اور انہیں رواج دینا، بہت محنت اور کم فائدے کا کھیل ہے کیونکہ اگر وہ نئے الفاظ قبول عام کی عزت پا گئے تو واضع کو اس کا کریڈٹ شاذونادر ہی ملتا ہے، لیکن اگر نامقبول ہوئے تو نفرت وحقارت بھی یقینی ہے۔"

مولوی عبدالحق کا تعلق، سرسید تحریک سے ہے۔ اور وہ حالی کے سچے وارث و جانشین ہیں۔ اس لیے اُن کے اسلوب نگارش کے محاسن اور عناصر ترکیبی سے بحث کرتے ہوئے ان کے پیشرو حضرات پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں نشاۃ ثانیہ کا جو زبردست کام ہوا اس کے کرتا دھرتا سرسید احمد خاں مرحوم تھے سرسید کے مقابلے میں، کوئی دوسری ہستی اتنی جامع حیثیات پیش نہیں کی جا سکتی۔ سرسید ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی اصلاحی کوششوں کا آغاز ۱۸۵۸ء سے ہوتا ہے جب انہوں نے "رسالہ اسبابِ بغاوت ہند" لکھا۔ یہ مسلمانوں کی وکالت میں پہلا قدم تھا جو مثبت انداز میں نہایت دور اندیشی اور عاقبت بینی کے ساتھ اٹھایا گیا۔ اس کے بعد ہی سرسید کا رابطہ عوام سے قائم ہوا اور انھیں سادہ، عام فہم اور سلیس عبارت لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلوب وانداز میں سرسید کی نثر آرٹ کا نمونہ نہیں ہے لیکن وہ کلاسکی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے قوم کا ذہن بنایا، اس میں وسعت اور گہرائی پیدا کی اور اس کے اثر سے بہت سے اعلیٰ درجے کے نثر نگار اُردو کو نصیب ہوئے۔ تعلیم اور سیاست کے میدان میں سرسید کی جتنی خدمات ہیں، ادب میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان کے اثرات بہت دیرپا ہیں۔[۱]

اس دور میں ہندوستان کے مسلمان کسی ایک فرد کے افکار سے اتنے متاثر نہیں ہوئے جتنا سرسید نے اُن کے ذہنوں کو جھنجھوڑا۔ اُن کی تحریک نے اُردو کو حالی، شبلی، وقارالملک، محسن الملک، وحیدالدین سلیم، نذیر احمد، ذکاءاللہ، چراغ علی، ظفر علی خاں،

---

۱۔ تفصیل کے لئے: Syed Abdullah: Spirit + Substance of Urdu prose under the Influence of Sir Syed Ahmad Khan. (1940)

خوشی محمد ناظر، سید علی بلگرامی جیسے فاضل خطیب، ادیب، مقرّر اور انشا پرداز، شاعر اور مفکر دیئے۔ مولوی عبدالحق اس سلسلۂ طلائے ناب کی آخری کڑی ہیں۔

"۔۔۔۔۔ سرسید اپنے دَور کے منفرد شخص ہیں ۔۔۔۔ اُن کی زندگی کے (۴۵) برس ہیں بلکہ پوری انیسویں صدی میں کوئی دوسرا مصنف ایسا نہیں ہے، جس نے تعداد میں اتنی زیادہ، مضامین میں اتنی مختلف، ضخامت میں اتنی گراں، خوبیوں میں اتنی اعلیٰ فوائد میں اتنی کثیر، اثر میں اتنی وسیع تصنیف کی ہوں۔ یہ تمام محاسن و فضائل کسی ایک مصنف میں جمع نہیں ہیں۔"[1]

سرسید اسکول نے جن لوگوں کو پیدا کیا ان میں اسلوبِ نگارش کی انفرادیت کے لحاظ سے اوّل نمبر پر شبلی نعمانی کا نام آتا ہے۔ دوسرے نذیر احمد ہیں، پھر الطاف حسین حالی بقول حامد حسن قادری: "علامہ شبلی اپنے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُسلوبِ تحریر کی اہمیت کو سمجھا"[2]۔ شبلی کا اسلوب کیا ہے، نثر میں شاعری ہے۔ کہیں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ کبھی نازک تشبیہیں اور لطیف استعارے لاتے ہیں۔ کہیں خطابت کا جوش اور بیان کا سحر دکھاتے ہیں۔ الفاظ کے دروبست اور ان کی نشست سے جتنا شبلی واقف ہیں ان کے عہد میں کوئی نہیں۔ پھر یہ کہ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ الکلام، المامون، الفاروق، شعر العجم، موازنہ، مقالات، سیرت النبی۔ اِن سب کے موضوعات مختلف ہیں تو اسلوبِ بیان بھی جدا ہے۔[3] کہیں نرے جذباتی ہیں کہیں پورے منطقی۔ کبھی دِل میں چٹکی لیتے ہیں، کبھی ذہن کو جھنجھوڑ دیتے ہیں۔ حالی کے اثر نے مولوی عبدالحق کو پیدا کیا اور شبلی کے اسلوب میں ہمیں ابوالکلام کے طرز کا نقشِ اوّلین ملتا ہے۔

حالی اپنی زندگی میں جتنے متین، مہذّب، سنجیدہ اور نستعلیق تھے۔ اتنی ہی ان کی تحریریں سادہ، صاف، شایستہ و دلآویز ہیں۔ ان کا نمایاں وصف، سادگی، متانت اور اثر انگیزی ہے، حامد حسن قادری نے لکھا ہے:

---

[1] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اُردو (۳۱۲) [2] ایضاً (۶۳۰) [3] شبلی کے اسلوب پر تفصیلی مطالعے کے لیے: سید عبداللہ: بحث و نظر (۱۲۳) و بمعد نیز خورشید الاسلام: تنقیدیں (۲۸۳) و بعیدہ۔

"انہوں نے غور و کے ساتھ اُردو زبان وادب کا جائزہ لے کر اس کی خامیوں کو دیکھ کر، ضرورتوں کو سمجھ کر، دوسری زبانوں سے مقابلہ کر کے، جدید موضوعات کی کتابیں لکھدیں لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے لیے کوئی روشن خاص پیدا نہ کر سکے۔ صاحب طرز بننے کے معنی ہیں، تقلید چھوڑ کر موجد بننا۔ موجودہ روش سے بغاوت کرنا اور اپنی راہ الگ نکالنا۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اُپج ہو ...... اور اسی صفت کے نہ ہونے سے مولوی ذکا اللہ اور مولانا حالی "صاحب طرز" نہیں ہیں۔ ..."[1]

نثر کی حد تک نہ سہی لیکن ادبی روایات کا طلسمی حصار توڑنے میں حالی نے فکری جہاد بھی کیا اور اپنا الگ راستہ بھی نکالا۔ سرسید کی طرح ان کے پیش نظر بھی یہ نہیں تھا کہ کس طرح کہا جائے بلکہ وہ "کیا کہا جائے" پر نظر رکھتے تھے۔ شاعری کے بارے میں اُن کے خیالات نے نئی نسلوں کو بہت متاثر کیا اور آج ادب جدید کا نقشہ حالی کی فکر ہی سے استوار ہوا ہے۔ اسی طرح نثر میں انہوں نے سادہ و سہل نثر کو رواج دیا۔ حالی نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی، وہ تصنع، تکلف، بناوٹ اور سجاوٹ کا زمانہ تھا۔ اس لیے حالی کی نثر کے دیرپا اور دُور رس اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولوی عبدالحق، حالی کے سچے جانشین ہیں۔ وہ بے شبہ ایک "صاحب طرز" انشاپرداز ہیں۔ ان کی تحریر میں حالی کی حلاوت اور سادگی متانت اور وقار، شبلی کی رنگینی اور ادا سنجی مہدی کی لطافت و نظافت، نذیر احمد کی محاورہ بندی، رشید احمد صدیقی کی رعایت لفظی اور صوتی توافق کا لحاظ، عبدالماجد دریا بادی کے طنز اور فرحت اللہ بیگ کے مزاج کا نہایت دلنشین اور خوش گوار مرکب ملتا ہے۔ وہ اس طرح لکھتے ہیں کہ اسٹائل کے سامنے موضوع کی اہمیت کم نہیں ہوتی صحیح، صاف، سادہ، دل نشیں اور سنجیدہ نثر لکھنے کی جو روش عبدالحق نے ایجاد کی ہے، اسے اردو کی معیاری نثر کہا جا سکتا ہے انہوں نے اردو کو ایسا لب و لہجہ دیا ہے جو ذاتی خطوط، تقریر، خطبات، علمی مضامین، تنقید و تحقیق اور تاریخ و سیرت نگاری سب اصناف نثر کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ عبدالحق کی شگفتگی، ان کے

---

[1] داستان تاریخ اُردو (۵۵۰)

خطوں میں اپنے شباب پر ہوتی ہے اگر ان کے بے تکلف خطوط کا ایک عمدہ انتخاب شائع کیا جائے تو وہ غالب، مہدی افادی اور محمد علی ردولوی کے خطوط کا نہایت نفیس مرکب ہوگا۔ ان کا اسٹائل اظہار و ابلاغ کے لئے بہت موثر ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، بھرپور لفظوں میں بے تکلف کہہ دیتے ہیں اور یہی اسٹائل کا مقصد و منتہی ہے۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں اسلوب کے لغوی معنوں سے بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس میں مرصع سازی، محنت اور صناعی کا مفہوم شامل رہا ہے لیکن یہ بات کم سے کم اُردو کی حد تک صرف کلاسکی سرمائے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ دورِ حاضر میں انگریزی ادبیات کے مفکروں نے اسٹائل کے تصور اور عناصر ترکیبی پر جو کچھ لکھا ہے، وہ قدیم تصورات سے قدرے مختلف ہے۔ جدید نقادوں میں (F.L. Lucas) نے اسٹائل کے موضوع پر بہت اچھی کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ تمام عناصر کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ اچھے اسلوب کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں۔ سلاست (Clarity) بلاغت (Brevity) متانت (Urbanity) اور سادگی (Simplicity)۔

مگر اس کے ساتھ ہی لوکس (Lucas) نے لب و لہجے کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا۔ شخصیت یا انانیت کا پَرتو دراصل لہجے ہی میں محسوس ہوتا ہے۔ سادہ نثر میں اتنا واضح لہجہ پیدا ہونا بہت مشکل ہے جتنا ہمیں ابوالکلام کی تحریروں میں ملتا ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق کے اسلوب کی یہی خوبی ہے کہ اس کا منفرد لب و لہجہ ہے۔ ان کے خطبات مقدمات، مضامین اور خاکوں میں یہ لہجہ، مَوجِ تہہ نشین کی طرح سرایت کرتا رہتا ہے۔ اس میں خطیبانہ جوش یا واعظانہ "سرپرستی" نہیں بلکہ ایسا پُرسوز انداز ہے جیسے کوئی صاحب دِل "نجد و یارانِ نجد" کی حکایت کہہ کر در و دیوار کو وجد میں لا رہا ہے۔

ان کے علاوہ بھی عبدالحق کی نثر کے کچھ بنیادی اوصاف ہیں جو ان کی تحریر میں اس طرح رچے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے متمائز کرنا بہت مشکل ہے۔

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست
اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

وہ ابوالکلام یا شبلی کی طرح "انتخابِ الفاظ" پر زیادہ زور نہیں دیتے، جس سے تحریر میں حسن تو پیدا ہو جاتا ہے، گفتگو میں جاذبیت بھی آسکتی ہے، مگر بسا اوقات اثر انگیزی میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور سامع پر براہِ راست اثر نہیں ہوتا لیکن انتخابِ الفاظ کی بات بھی ایک درجے میں آ کر اضافی و اعتباری ہی ہو جاتی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ کسی زبان میں کوئی دو لفظ مترادف نہیں ہوتے، تو اس کا مقصد یہی ہے کہ ان میں کوئی نہ کوئی لطیف فرق ضرور ہوتا ہے۔ اُنس، محبت، عشق، جنوں، اُلفت، شیفتگی، وارفتگی یہ سب ایک ہی جذبے کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں اور ان سب میں بہت ہی نازک فرق ہے۔ جسے محلِ استعمال میں صرف وجدان ہی محسوس کر سکتا ہے۔

دراصل خیال ایک مجرد (Abstract) شئے ہے۔ الفاظ کے قالب میں ڈھل کر ہی وہ دوسروں تک پہنچ سکتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی ایجاد، اس بات کی شاہد ہے کہ انسان کبھی اپنے خیالات اور محسوسات و مدرکات کی تبلیغ کما حقہ نہیں کر سکا۔ رقص و سرور، موسیقی، نقاشی، مصوری، تمثیلیں اور شاعری یہ سب اظہار و تبلیغِ احساس ہی کے ذرائع ہیں، رقص میں حرکات و سکنات کے ذریعے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی میں ہوا کی لہروں کو چھیڑ کر وجدان کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ نقاشی میں یہی کام بے جان نقوش سے لیا جاتا ہے۔ مصوری میں موقلم اور رنگ مل کر جذبے کی تصویر بناتے ہیں۔ شاعری، ان سب کا لطیف مرکب ہے۔ اس میں موسیقی، حرکت (رقص)، مصوری اور نقاشی سب فنون کا امتزاج ہوتا ہے۔ اچھا شعر بھی وہی ہے جس میں یہ سارے اوصاف موجود ہوں، اور جذبہ پوری طرح الفاظ میں ڈھل گیا ہو۔ بعض شعر ایسے ہوتے ہیں جن کا خیال نہ رقص میں پیش کیا جا سکتا ہے، نہ موسیقی سے ادا ہو سکتا ہے، نہ مصور کا موقلم اس میں رنگ بھر سکتا ہے۔ مثلاً میر کا یہ شعر دیکھئے:

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

سوائے شعر کے، فنونِ لطیفہ کی اور کون سی صنف اس خیال کی متحمل ہو سکتی تھی! جوش ملیح آبادی کی ایک نظم کا تھیم (Theme) یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں افکار کی جو اصلی (Original) شکل اور لطیف نوعیت ہوتی ہے، وہ شعر کی صورت میں ڈھلتے ڈھلتے

اور لفظ و عبارت کے قالب میں آتے آتے بالکل ہی مسخ ہو جاتی ہے۔ وجدانی لطافت اور نزہت لفظوں کے کھُردرے پیکر میں سما ہی نہیں جا سکتی۔ جوش نے اظہارِ واقعہ میں تھوڑا سا شاعرانہ مُبالغہ بھی کیا ہو تو بھی اس میں شک نہیں کہ ہزاروں لکھنے والوں میں سے کسی ایک ہی کو یہ مَنصب ملتا ہے کہ وہ اپنے احساس کو دوسروں تک پہنچا سکے اور اپنے افکار کو الفاظ کے قالب میں جوں کا توں مُنتقل کر دے ورنہ عمُوماً یہی احساس باقی رہ جاتا ہے کہ :

زبان زنطق فرو ماند و رازِ من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

اسی لیے الفاظ کے انتخاب کا معاملہ کسی ضابطے یا اصُول کا پابند نہیں۔ اگر لکھنے والے کا خیال پختگی کی منزل تک آگیا ہے تو وہ جزداً ظاہر ہو کر بھی گہرا تاثر چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر ذہن ناپختہ تھا، خیال خود ہی مبہم و موہوم تھا یا اس کی لطافت میں کثافت کی ناپختگی باقی رہ گئی تھی تو وہ بار بار اور طرح طرح سے ظاہر کرنے پر بھی تاثر کی گرمی اور تاثیر کے گداز سے محروم رہتا ہے۔

شاعری میں فن اور قواعد کی قیود کے ساتھ کچھ سہولتیں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ شاعر اپنے خیال کو بلا واسطہ (Direct) ظاہر کرنے کا پابند نہیں۔ اگر وہ رمز و ایما کے پردے میں کہے یا بالواسطہ (Indirect) اظہار کا طریقہ اختیار کرے تو یہ اکثر پسندیدہ ہوتا ہے۔ لیکن نثر نگار جتنی وضاحت سے اور بلا واسطہ اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکے اتنا ہی وہ قابلِ ستایش ہے مولوی عبدالحق کی تحریریں پڑھ کر ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تحسینِ کلام کے لیے، یا عبارت کو دلچسپ بنانے کے لیے کبھی ادھر اُدھر نہیں دیکھتے۔ نہ وہ اپنی نثر میں غیر ضروری تشبیہات استعمال کریں گے۔ نہ استعارے سے کام لیں گے۔ نہ عربی فارسی کی بھاری بھر کم ترکیبوں سے اسے سجھائینگے اَبوالکلام کی طرح وہ الفاظ کے جوڑے بھی نہیں لاتے، نہ محمد حسین آزاد کی طرح مُجرّد (Abstract) تصوّرات کو متحرک کرتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ جیسا مُبالغہ بھی نہیں کرتے۔ نہ استفہام انکاری و اقراری سے نثر میں خطیبانہ آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ اُنہیں اپنے قلم پر اعتماد ہے، اپنے خیال پر اعتماد ہے، اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اُسے بے تکلف ادا کر دیتے ہیں۔ ان کی نثر کا یہ حال بھی نہیں کہ مبتدا کہیں ہے، خبر کہیں۔ اس میں عمُوماً تعقید، ابہام یا لف و نشر بھی نہیں ہوتا۔ اِس کی مثال میں اَبوالکلام کی یہ عبارت دیکھئے :

"وہ ذلت کا زخم نہ تھا، بلکہ نامرادی کا زخم لگانے والا ہاتھ تھا۔ وہ مظلومی کی تڑپ نہ تھی بلکہ ظلم کو تڑپانے والی شمشیر تھی۔ وہ مسکینی کی بے قراری نہ تھی بلکہ دنیا کو بے قرار کرنیوالوں نے قراری پائی۔ وہ درد و کرب کی کروٹ نہ تھی، بلکہ درد و کرب میں مبتلا کرنیوالوں کو اس سے بے چینی کا بستر ملا۔ وہ جو کچھ لایا، اس میں غم گیتی کی چیخ نہ تھی، ناتوانی کی بے بسی نہ تھی، اور حسرت و مایوسی کا آنسو نہ تھا، بلکہ یکسر شادمانی کا غلغلہ تھا، جشن و مُراد کی بشارت تھی، کامیابی و عشق فرمائی کی بہار تھی، طاقت اور فرمان رَوائی کا اقبال تھا، اُمید اور یقین کا خندۂ عیش تھا، زندگی اور فیروزمندی کا پیکر و تمثال تھا، فتح مندی کی ہمیشگی تھی، اور نصرت و کامرانی کی دائمی۔"[1]

اِتنی طویل عبارت میں جو تقریباً (۱۲۵) لفظوں پر مشتمل ہے، ایک ہی بات بار بار کہی گئی ہے اور اسے اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ ذہن میں اچھی طرح مرتسم ہو جائے۔ اس کے برعکس مولوی عبدالحق کی یہ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

"وہ حساب کے سے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے، وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ اُن کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا ہے اور اُن کی مُستعدی کو دیکھ کر دل اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے۔"[2]

اِن دونوں عبارتوں میں "اسٹائل" موجود ہے مگر فرق یہ ہے کہ پہلی عبارت میں الفاظ زیادہ ہیں، مضمون کم ہے اور دوسری میں مفہوم زیادہ، الفاظ کم ہیں۔ پہلی عبارت خوبصورت ہے مگر دوسری سائنٹیفک ہے۔ وہ کبھی دور از کار، پادر ہوا اور مُغلق بات نہیں کرتے، نہ حشو و زوائد سے ہیچی کاری کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم نے محمد حسین آزاد کے طرزِ نگارش کی تعریف کرتے

---

[1] ہفتہ وار پیغام کلکتہ جلد (۱) شمارہ (۸) سنہ ۱۹۲۱ء ۲ چند ہم عصر (۱۱۵)

ہوئے لکھا تھا:

"توصیفی اور تشبیہی ترکیبوں سے جو حشو کے طور پر جملوں میں اضافہ کر دی جاتی ہیں، اُدنیٰ سا فقرہ، حسن و لطافت کی تصویر بن جاتا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے کا ابتدائی فقرہ ہے: "آزاد ہندی نہاد کے بزرگ، فارسی کو اپنی تیغِ زبان کا جوہر جانتے تھے"۔ اس فقرے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی نہاد ترکیب صفتی ہے۔ زبان کو تیغ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کا لازمہ جوہر لایا گیا، اِن زوائد کو نکال دینے سے اصل جملہ یہ رہ جاتا ہے: "آزاد کے بزرگ فارسی کو اپنی زبان جانتے تھے" اور اِس حالت میں یہ جملہ بالکل روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ مگر صرف چند زوائد کے لانے سے جنھیں نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں، سارا جملہ چمک اُٹھتا ہے۔"[۱]

جملہ چاہے چمک اُٹھے اور یہ اسلوب لاکھ محاسن رکھتا ہو لیکن اسے (Oliver Wendell Holmes) کے الفاظ میں "دلیل سوز" کہنا چاہیئے۔ اس نے صحیح کہا ہے کہ (Eloquence may set fire to reason) اس لیے یہ اندازِ نگارش تحقیقی و تاریخی کتابوں کے لیے موزوں نہیں ہے اور قدم قدم پر گمراہ کرتا ہے۔ شبلی کی رنگینیٔ بیان کا منکر کون ہو سکتا ہے مگر یہی محمود شیرانی جو محمد حسین آزاد کے اسلوب کو "اپنے انداز کے آپ ہی موجد اور آپ خاتم" بتا رہے ہیں، شبلی کی شعر العجم میں ہزاروں تاریخی غلطیاں شمار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اِن میں بیشتر غلطیاں وُہ ہیں جو زورِ بیان اور فصاحت نے کرائی ہیں۔ پھر محمد حسین آزاد بھی ایک خیالی دُنیا کے باشندے ہیں۔ اُن کا اسٹائل اُردو میں بے عدیل و نظیر سہی مگر تاریخ و تحقیق کا دشمن ہے۔ چنانچہ "دربارِ اکبری" "سخندانِ پارس" "نگارستانِ سخن" اور "آبِ حیات" میں ان سے ہر قدم پر عبرت ناک غلطیاں ہوئی ہیں، کچھ انہوں نے زیبِ داستان کے لیے اضافے بھی کر دئے ہیں۔ مولوی عبد الحق کی نثر چونکہ سائنٹیفک ہے اور حشو و زوائد سے مُعرّیٰ ہے، اس لیے وہ تنقید و تحقیق اور تاریخ یا علمی مضامین کے لیے نہایت مناسب واقع ہوئی ہے۔ تحقیق میں غلطی عبد الحق سے بھی ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے، لیکن اس کی ذمہ داری اُن کی سحر طرازی یا طلاقتِ لسانی پر عائد نہیں ہوتی۔

الفاظ بھی، من جملہ اسرارِ کائنات ہیں۔ لفظ اپنی جگہ کوئی چیز نہیں، ایک مہمل آواز

---

[۱] اورئینٹل کالج میگزین لاہور جلد ۱۷، شمارہ (۴)، اگست ۱۹۴۱ء صفحہ (۴۹-۵۰)

اور بے معنی صوتی حرکت یا ارتعاش اور بے جان وغیر مرئی سی شئے ہے۔ ایک لفظ کا وہی مطلب ہے جو ہم نے ٹھیرا لیا ہے یعنی وہی ہیوم (Hume) والا فلسفۂ اشیاء ہے کہ سلسلۂ کائنات ہمارے خیال پر قائم ہے، ہمارا خیال کائنات سے نہیں۔ الفاظ تابع ہیں خیال کے، اور خیال آزاد ہے۔ وہ کسی قید میں نہیں سما سکتا۔ فنِ تحریر کی ایجاد نے یہ سہولت پیدا کی تھی کہ ہم دور بیٹھ کر بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکیں یا اپنے خیال کو محفوظ کر سکیں۔ ابتدا میں یہ کام نقوش و تصاویر سے لیا گیا اور رفتہ رفتہ حروفِ تہجی وجود پذیر ہوئے۔ پھر ان سے الفاظ بنتے گئے۔ اس طرح ہم نے اپنے خیالات کو اشاروں میں ظاہر کرنے اور دوسروں تک پہنچا دینے کا ایک وسیلہ ایجاد کر لیا۔ اسی لیے الفاظ صرف خیال کا "آلہ" ہیں، خیال ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چند انسان ایک ہی خیال کو مختلف لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جملہ لیجئے کہ "آسمان پر تارے چمک رہے ہیں"۔ یہ ایک خیال ہے، جو الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔ ہندی، سنسکرت، انگریزی، لاطینی، فرانسیسی، اطالوی، ایرانی سریانی، عربی، فارسی، ہر زبان میں مختلف الفاظ یہ خیال ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوں گے، ان کے لب و لہجہ میں، آواز کے زیر و بم میں، قواعد کی ترتیب میں بھی فرق ہوگا۔ لیکن "خیال"، جو اصل شئے ہے، ہر جگہ مشترک ملے گا۔

الفاظ بدلتے جائیں گے۔ الفاظ بدلتے جائیں گے۔ یہ نہیں کہ ہمارا یہ اُردو کا جملہ ہر ملک اور ہر زبان والے کی سمجھ میں آجائے۔ وہ جب اس خیال کو ادا کرے گا تو اپنے الفاظ استعمال کرے گا۔ اسی معمولی سی مثال سے واضح ہو گیا کہ خیال، الفاظ کا تابع نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک خیال، ایک مخصوص لفظ کا تابع ہوتا اور زبانوں کا اختلاف اس میں حائل نہ ہو جاتا۔

پھر دوسری دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ انسان کی شخصیت اور سیرت، ذہن اور مزاج کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کسی خیال کی گہرائی میں اُتر جائیے اور کہنے والے نے جن لفظوں میں اس بات کو ادا کیا ہے، اس کا تجزیہ و تحلیل، جذبات کی حد تک کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس شخص کی اُفتادِ ذہنی کیا ہے اور کیسی "شخصیت" کا انسان ہے[۱]۔ اس مطالعے

---

[۱] تفصیل کے لیے: Lucas: Style. London 1956.

کے بعد ہی اندازہ ہوگا کہ بوفان نے کتنی سچی بات کہی تھی جب یہ کہا تھا کہ "اُسلوب خود انسان ہے"۔

دو باتیں اَور ہمارے سامنے آتی ہیں۔ جب ہم کسی بات یا کسی خیال کو دوسروں تک منتقل کرنا چاہتے ہیں اور زور ہمیں خیال پر دینا ہوتا ہے تو نئے نئے اَسالیب تراشتے ہیں۔ کہیں ابہام، کہیں تشریح، کبھی تکرار، کبھی اطناب، کہیں ایجاد، کہیں تشبیہہ واستعارہ۔ مُراد صرف یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ ہمیں کہنا ہے، وُہ سننے والے یا پڑھنے والے تک پہنچ جائے۔ کبھی "خیال" پر زور نہیں دیتے اور صرف لفظی پینترے (Play of words) مدِّنظر ہوتے ہیں تو نئی نئی صنعتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ پُرتکلف عبارتیں اسی لیے وجود میں آئی ہیں، کہ لکھنے والا، خیال سے زیادہ الفاظ کی اہمیّت سمجھتا تھا۔

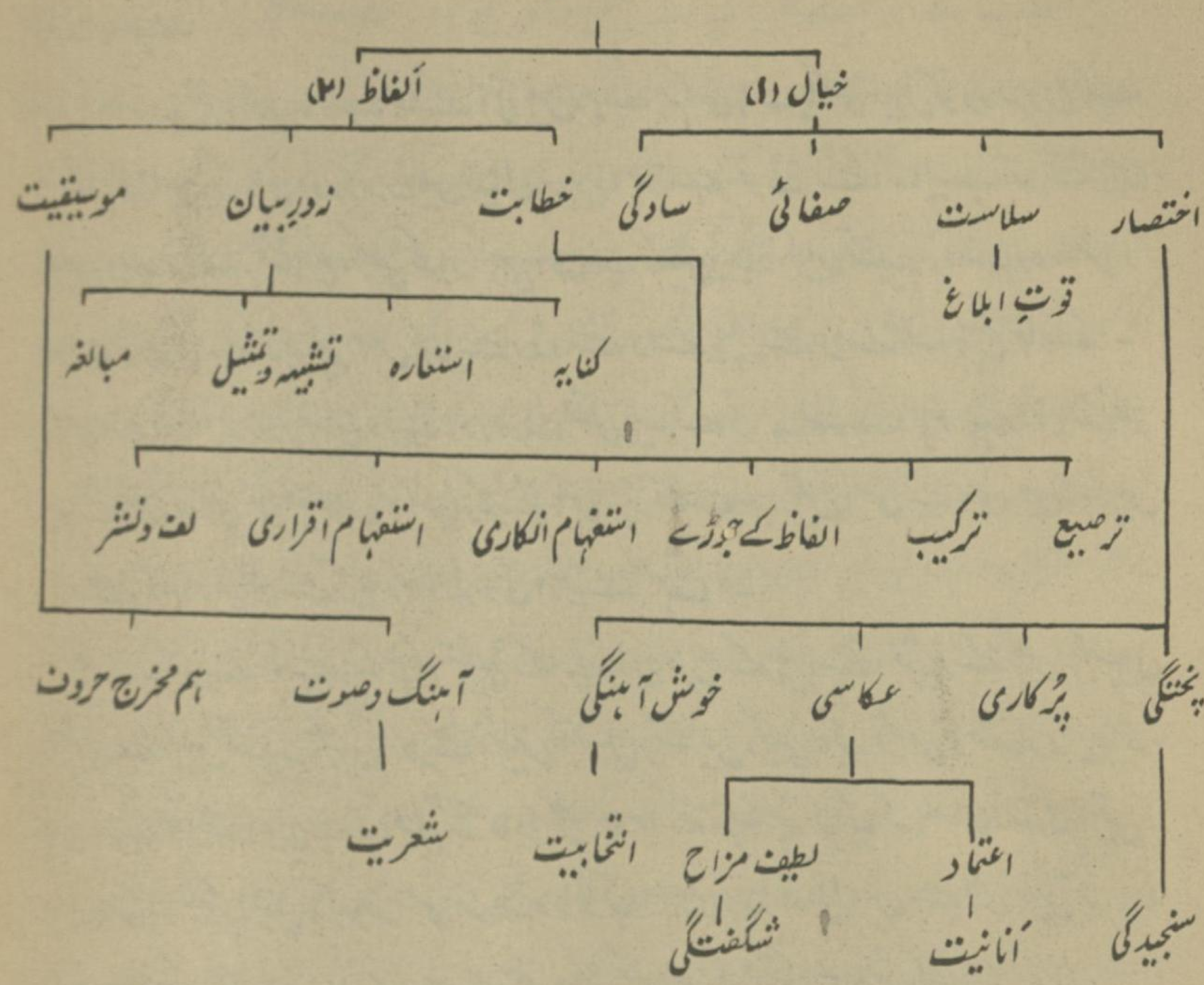
قرآن نے اَپنے احکام کی تبلیغ کے لیے طرح طرح کے پیرائے اختیار کئے ہیں۔ کہیں تمثیل ہے، کہیں تشبیہہ، کہیں حکایت، کہیں تفصیل وتشریح، کبھی تاکید، کبھی اختصار وایجاز۔ اِن سب کا مقصد یہی ہے کہ اصل مُدّعا واضح ہو جائے۔ چنانچہ کہا گیا کہ: "ان اللّٰہ لا یستحیی ان یضرب علیکم المثل ما بعوضۃ من عند اللّٰہ وما فوقہا۔" یعنی اَللّٰہ تعالیٰ اس سے بھی نہیں شرماتا کہ تم پر مچھر کی مثال دے یا اس سے بھی حقیر وکمتر کسی چیز کو تمثیل میں پیش کرے۔

اگرچہ اچھے اسلوب کی تشکیل میں بہت سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی کی اہمیّت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن عہدِ جدید کے نظریات، اَساتذۂ قدیم سے بُنیادی طور پر مختلف واقع ہوئے ہیں۔ آج کے نقاد الفاظ پر خیال کو ترجیح دیتے ہیں اور اُسی اسٹائل کو سائنٹیفک تسلیم کرتے ہیں جو اظہارِ خیالات کے لیے آسان، ایک سادہ اور مختصر ہو۔ ذیل میں ہم اسلوب کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کے مختلف عناصر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے[1]۔

---

[1] اُسلوب کا یہ خاکہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمایئے۔

# اُسلوب




مولوی عبدالحق کا اسٹائل جدید نظریۂ اسالیب سے زیادہ قریب واقع ہوا ہے۔

وہ اپنی نثر میں نذیر احمد کی طرح بے جا محاورہ نہیں ٹھونستے لیکن آسان اور سادہ ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی کتاب "چند ہم عصر" سے بعض عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں، اِن میں خط کشیدہ الفاظ خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں جنھوں نے ان کی نثر کو مؤثر اور شگفتہ بنانے میں حصّہ لیا ہے۔

(۱) "منشی صاحب، سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ کے دربار میں بھی باریاب ہوئے۔ اِس باریابی کی وجہ غالباً اُن کی دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدیۃ السلطان ہوئیں۔ یہ دو کتابیں آج کل کہیں نہیں ملتیں اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں لکھا کیا ہے۔ غالباً یہ بادشاہ کی کتابوں کی شرحیں ہیں۔ واجد علی شاہ کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور اِدھر اُدھر سے چند کتابیں اُٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر دیے۔ اِسی طرح جو کتاب سامنے آئی اُس میں سے کچھ حصّہ نقل کر لیا۔ وہ اِس بات کا مُطلق

لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا مَیں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کر دیئے ہیں۔ غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز اُن کے درباری اُن کتابوں کو اعلیٰ تصانیف میں سے خیال کرتے تھے، ایسی انمل بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنا اور اُن میں ربط و سلسلہ قائم کرنا، منشی صاحب مرحوم ہی کا کام تھا۔،،

(۲) " اس کا علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا وہ زندہ انسائیکلوپیڈیا تھا اور اس لیے اُس کی باتیں اور گپ شپ نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھیں۔ کسی قسم کا مسئلہ اور کسی فن کی بحث اس کے سامنے پیش کیجیے، وہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سمجھا دیتا تھا۔ اور اس کی ظرافت بھی عجیب شان کی ظرافت تھی۔ اس کے ایک ٹھٹول میں وہ وہ مضمون و نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مطالعہ اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔،،

اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں اکثر روز مرہ کے الفاظ بڑا حسن پیدا کر دیتے ہیں مثلاً " اس کے ڈھے جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا ایک کھنڈر کے گر جانے کا۔" "وہ اپنے تھا و بیں رعایا کے حق میں اسے عین انصاف اور نیکی سمجھتے تھے، گویا وُہ رائے، پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔" "مولوی صاحب مرحوم پھر چُپ سادھ گئے"۔ "مگر مولوی صاحب مرحوم ٹس سے مس نہ ہوئے"۔ "جب دیکھا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی" "اس کے نیچے ایک تہ خانہ بنا ہوا ہے جس میں کاٹ کباڑ اور ڈیرے خیمے پڑے رہتے تھے۔" "تحقیق و تفتیش کی چینٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اُس کی تہہ تک پہنچتے اور مالہٗ و ماعلیہ کے سُراغ میں پتّے پتّے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پاتال تک کی خبر لاتے۔"

مَیں سمجھتا ہوں، یہ چند مثالیں اور اِتنی وضاحت مولوی عبدالحق کے اسلوب نگارش کی بنیادی خوبیوں کو سمجھنے کے لیے کافی ہوگی۔ مَیں نے مثالوں کا انبار لگانے کے مقابلے میں یہ ضروری سمجھا کہ اسٹائل کے محاسن اور عناصرِ ترکیبی سے بحث کروں اور چند ایسی بنیادی باتیں کہہ سکوں جن کی روشنی میں بابائے اردو کے اسلوب کا واضح خاکہ، اُن کی تحریریں پڑھنے والے کے ذہن میں بن جائے۔

o

"اُردو اور بابائے اُردو آپس میں لازم و ملزوم ہیں — اُردو ان کی آنکھوں کا تارا اور وُہ خود اُردو کی زندگی کا سہارا ہیں۔ وُہ بچّے تھے تو اُردو کے گہوارے میں پلے، جوان ہوئے تو اُردو سے عشق کیا اور بڑے بوڑھے ہوئے تو اُردو اُن کی پروردہ قرار پائی ...۔ اُنھوں نے کم و بیش ساٹھ سال اُردو کی خدمت کی ہے اور زبان و ادب کے بہت سے گوشے روشن کئے ہیں۔ اِس خصوص میں اُن کا ایک ایک لفظ، سند کی حیثیت رکھتا ہے اور حرفِ آخر کی مہر ثبت کرتا ہے۔ اُردو کا مؤرّخ اُن کے آگے کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتا اور کسی ادیب کا چراغ اُن کے آگے نہیں جلتا"

——— ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

# مولوی عبدالحق کا اسلوبِ بیان

---اس مضمون کا مقصد مولوی عبدالحق کی انشاپردازی کے مخصوص اسلوب پر روشنی ڈالنا ہے۔ مولوی صاحب کے تحقیقی اسلوب کے بارے میں ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اُن کا انداز، سرد مہرانہ اور کیٹلاگ سا نہیں ہے، بلکہ تحقیقی مضامین بھی وہ سلاست اور شگفتگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اس طرح کے مضامین میں بھی انکا انداز بات چیت کا سا ہوتا ہے، حوالوں کے سہارے قلم اُٹھانا اُن کی عادت کے خلاف ہے۔ اس لیے بعض وقت ان کے تحقیقی مضامین کے پڑھنے والوں کو اُلجھن سی ہوتی ہے۔

میرے خیال میں، مولوی عبدالحق میں طبع زاد اور اپچی ادبی تصانیف پیش کرنے کی جیسی اعلیٰ صلاحیتیں ہیں، وہ اُن کی مصروف زندگی کی وجہ سے پوری طرح بروئے کار نہ آسکیں چنانچہ وُہ کوئی مستقل ادبی تصنیف پیش نہ کرسکے۔ مولوی صاحب کا اصلی جوہر، اُن کے اسلوبِ بیان کی خوبی میں پوشیدہ ہے۔ وہ نثر نگاروں کے اُس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا آغاز سر سید احمد خاں سے ہوتا ہے، اور جس کی اٹھان میں مولانا حالی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس اسلوبِ بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں عبارت آرائی اور محاورہ کے جا و بیجا استعمال سے زیادہ نفسِ مضمون کی سادگی اور وضاحت پہ زور دیا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی تحریروں میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

حالی کے مقابلے میں مولوی عبدالحق صاحب کا اسلوب زیادہ سلیس اور واضح ہوتا ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ مولوی عبدالحق، حالی کی طرح مسائل سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ جب کبھی ایسے موقعے آتے ہیں، وہ بڑے سلیقہ سے ان سے گزر جاتے اور اپنے انداز بیان کو گرانبار نہیں ہونے دیتے۔

اُن کی تحریروں میں سرسید کی سادگی ہے، لیکن سرسید کے اسلوب کا نشیب وافراز نہیں ہے۔ سرسید کبھی کبھی عام پسندی کی سطح پر اُتر آتے ہیں، لیکن مولوی عبدالحق کے پاس سادگی اور سلاست میں بھی ایک سنجیدہ معیار شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔

مولوی صاحب کے اسلوب کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ عربی فارسی کے اَدق الفاظ سے حتی الامکان احتراز ہے۔ اس کے مقابلے میں عام بول چال کی زبان کے عناصر ان کے یہاں زیادہ ہوتے ہیں۔ خوبی دراصل اُن کے استعمالِ الفاظ، جملوں کے دَروبست اور کہیں کہیں شگفتہ ترکیبوں کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن شگفتہ ترکیبوں کے استعمال کے موقع وہ قصداً پیدا نہیں کرتے بلکہ اُن کا جمالی ذوق جب بلند ہوتا ہے تو وہ الفاظ اور ترکیبوں کو بڑے شاطرانہ انداز میں برت جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی سادگی میں پُرکاری اور پُرکاری میں سلاست، سلاست میں رنگینی و بے تکلفی اور بے تکلفی میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہی مواقع ہوتے ہیں، جب قلم پر اُن کا قابو، بیان پر ان کی دسترس اور خوش گفتاری میں ان کی طبیعت کا رچاؤ، نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی درحقیقت مولوی عبدالحق صاحب کی تحریر کا جادو ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے طبع زاد انشائیے کم لکھے، حالانکہ اُن میں انشائیہ نگاری کی بڑی رچی ہوئی صلاحیتیں موجود ہیں۔ چنانچہ ٹھیٹ انشائیہ کی قسم کی تحریروں میں ان کا ایک مضمون، بہت دن ہوئے، "چندہ" کے عنوان سے اورنگ آباد کالج کے رسالہ "نورس" میں شائع ہوا تھا، شگفتگی اور سنجیدہ مزاح کا اُردو میں شاید یہ بہترین نمونہ ہے۔ اس سے ہٹ کر "اچھی کتاب کا مطالعہ" بھی اُن کا بڑا عمدہ انشائیہ کہا جا سکتا ہے۔

اسلوب، ایک سماجی اور جمالی مظہر ہے۔ ادیب اسی کے توسط سے اپنے پڑھنے والوں تک رسائی حاصل کرتا، ان کے دل میں گھر پیدا کرتا اور اُن کی جمالی حس کو متاثر کرتا ہے۔ ادیب میں کم سے کم اتنی صلاحیت ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ذہنوں کو مطمئن کر سکے اور انھیں آسودگی بخش سکے۔ یہ خصوصیت جیسی مولوی عبدالحق کے یہاں نمایاں ہے اس کے نمونے کم ہی نظر آتے ہیں۔

جس کسی موضوع پر اُنھوں نے قلم اٹھایا ہے۔ اس کے لیے ان کی معلومات کا خزانہ وسیع ہے۔ ان کے مقدمات ہوں، یا خطبات، تنقیدات ہوں یا انشائیے، کسی بھی میدان

ہیں ان کے قلم کی روانی سُست نہیں ہونے پاتی اور ان کی طبیعت کی جولانی میں فرق نہیں آتا۔ اُن کو اپنے مسائل کا واضح شعور ہے۔ یہی دراصل مولوی صاحب کے اسلوب کی انفرادی خصوصیت ہے۔ ان کے لکھے ہوئے مقدمات کو دیکھ کر اُن کے نکتہ رس دماغ اور ان کی باریک بین نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موضوع اور مظاہر کے تو بر تو نقابوں کو اُلٹ کر اُن کا دو دو دو نظارہ کرنا مولوی صاحب کو پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کوئی تخلیق محض خانہ پُری کے لیے نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں مولوی عبدالحق کے مقدمات، اُن کی ساری اَدبی تصانیف پر بھاری ہیں۔ مولوی صاحب کی تحریر کے ایک ایک خم اور ایک ایک خط سے اُردو زبان و ادب کے لیے اُن کا خلوص نمایاں ہے۔ زبان و ادب کے پائدار اقدار کی حفاظت اور نگہ داری میں وہ گویا بے قرار ہو کر، بے اختیار لکھتے ہیں۔ چنانچہ پارینہ تذکروں کے ڈھیر سارے اَوراقِ پریشان کی شیرازہ بندی اُردو کے سلسلہ میں اُن کے اِسی احساسِ نگہداری کو ظاہر کرتی ہے۔

اِنھیں مقدمات میں اُن کا وہ تنقیدی شعور بھی نہایت واضح نظر آتا ہے جس سے ان کی تحریروں کا رنگ چوکھا ہو گیا ہے۔ شروع سے آخر تک ایسا سیدھا سادہ اور رواں اسلوب اختیار کیا ہے جو کبھی اصطلاحات کے پیچ وخم میں نہیں اُلجھتا۔ بے تکلفی اور بے ساختہ پن میں، وہ کبھی کبھی انگریزی استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً سوشیل ریفارم، سلف ہلپ، ہیر کٹنگ سیلونوں بیوٹی کلچر ایوانوں وغیرہ۔ بعض وقت ان کی تحریروں کے خدو خال پر سرسید اور مولانا حالی کا دھوکا ہوتا ہے۔ اُن کے قلم کی کرشمہ سازیاں، یہیں پر ختم ہونے نہیں پاتیں۔ وہ بول چال کے بعض مخصوص اَلفاظ کو بھی ادبی معیار بخش دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر چھچھورے، کٹ حجت اور بہرا پتھر وغیرہ جیسے الفاظ جو ان کے بعد سے اب تک ادبی اغراض کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوتے اور شاید استعمال بھی نہ ہوں، مولوی صاحب کی تحریر میں بندھنے کی بعد، ایک مزہ دے جاتے ہیں۔ ہر بڑے ادیب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وُہ زبان اور الفاظ کے معاملے میں روایات کا غلام نہیں ہوتا بلکہ کچھ اپنی روایات بھی دے جاتا ہے۔ مولوی صاحب بھی اسی طرح سارے جتن اپنی ذہنی آسودگی کے لیے کرتے ہیں۔

مولوی صاحب کے "خُطبات" کو سرسید کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیئے۔ اُن کے خطبات کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اُن کی تقریر زیادہ بے ساختہ

ہے یا اُن کی تحریر۔ لفظ لفظ میں ایسی سادگی ہوتی ہے جو ذہن کے گوشہ گوشہ میں اُتر جاتی ہے۔ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے وُہ کبھی بھاری بھر کم اور گمبھیر لفظوں کا سہارا نہیں لیتے بلکہ آغازِ تقریر ہی سے ایک جنچا تلا انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ سادگی جو مولوی صاحب کی زندگی کا اسلوب بن چکی ہے، اس کا اثر ان خطبات اور ان کے تمام ادبی کارناموں میں حسن بن کر جھلک رہا ہے۔ مولوی صاحب کی اس سادگی کو تاریخی جبر پٹ کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ اُن کے لیے عین فطرت ہے کہ طرزِ ادا کی جاذبیت کے آگے وہ کبھی نفسِ مضمون کو قربان نہ کریں "تقریر کی لذت" یا اس کی جادو بیانی کا وہ اہتمام نہیں کرتے اور نہ ہی خیال آرائی سے کام لیتے ہیں۔ خیال آرائی کا پردہ دیر سویر فاش ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس کے برخلاف مولوی صاحب کے خطبات کے بعض حصے، اب بھی اثر پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کے سوانحی انشائیوں کے مجموعہ "چند ہم عصر" کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈگر ڈگر پر ہم ان کے ہم قدم ہو جاتے ہیں۔ معاصرین میں بعض عزیز ہستیاں بھی ہوتی ہیں اور جتنی زیادہ عزیز ہوتی ہیں، اُن کے بارے میں کچھ لکھنا، اُتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ مگر مولوی عبدالحق کی یہ صداقت پسندی ہے کہ جس کے بارے میں جو خیال ان کے ذہن میں ہوتے ہیں، برملا وہ ان کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اظہار میں اُن کے دِل اور اُن کے دماغ، دونوں کی یگانگت بھی ہوتی ہے۔ اِسی لیے اُن کے ایسے انشائیے محض خراجِ عقیدت نہیں بن جاتے بلکہ اُن کے ذاتی تاثرات معلوم ہوتے ہیں، وہ تاثرات جو افراد کو اُن کی شخصی اور سماجی زندگی کی کسوٹی پر کسنے کے بعد ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِن تاثرات میں وُہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔

جھوٹی رنگ آمیزی کی جگہ اُنھیں بے رنگ حقیقت نگاری زیادہ پسند ہے۔ لیکن معاصرین کی زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی ترجمانی اور ان کا تجزیہ کچھ ایسا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے گہرے اور ہمہ جہتی نفسیاتی مطالعے کی بھی ضرورت ہے۔ تاہم جب وہ یہ کام انجام دے جاتے ہیں تو سوانح نگار سے زیادہ زندگی کے نقاد معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کے اسلوب میں ایک توازن، ایک وقار اور ایک رکھ رکھاؤ آجاتا ہے۔

مولوی صاحب کے سوانحی انشائیوں کا مقابلہ اور موازنہ رشید احمد صدیقی کے "گنج

ہائے گرانمایہ" اور" ہم نفسانِ رفتہ" سے کیا جا سکتا ہے۔"گنج ہائے گرانمایہ" اور" ہم نفسانِ رفتہ" کی سطر سطر میں گھلاوٹ جیسے اجنتا کی نقاشی، " چند ہم عصر" میں سادگی ایک معیار جیسے ایلورہ کی صورت گری۔ رشید احمد صدیقی کے ہاں اپنے معاصرین کے ساتھ ایک رچے ہوئے خلوص کا اظہار، مولوی عبدالحق کے پاس معاصرین کے ساتھ ایک ادیبانہ رکھ رکھاؤ اور عالمانہ لپندیدگی نمایاں ہے۔

مولوی عبدالحق کی مستقل سوانحی تنقید "نصرتی" شراب کہنہ کا نشہ پیالوں میں چھلکا ہے تفصیلات کی عدم موجودگی کے باوجود مؤلف نے اپنے اسلوب کے اعجاز سے، نصرتی کی تصویر کے خاکے میں جو رنگ بھرے ہیں، وہ قابلِ دید ہیں۔ نصرتی کی زبان اور اس کی شاعری کی قدامت کا اندازہ کرتے ہوئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خم کدۂ ادب کے پیرِ مغاں نے شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

مولوی عبدالحق اپنی ذات سے ایک انجمن، ایک ادارہ ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہی ایک کام اُن کے کرنے کا تھا۔ اُردو زبان اور ادب کے بارے میں اُن کی معلومات وسیع اور جامع ہیں۔ زبان کے سلسلے میں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر یہ ہے کہ مولوی صاحب کا نقطہ نظر لسانی سے زیادہ سماجی ہوتا ہے۔ وہ زبان کے انھیں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں جو ہماری سماجی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ اُردو کے ماخذ، اس کے آغاز اور ارتقا کے بارے میں اُن کی تحریروں کو ممکن ہے کہ ہمارے جدید محقق، لسانی بنیادوں پر تسلیم نہ کریں — اور سائنٹیفک نہ مانیں، لیکن اِس میں کچھ کلام نہیں کہ ان کا ایک سماجی اور ترغیبی پہلو ہے، کیونکہ تمدن کا بہاؤ جو رخ اختیار کرتا ہے، اس کی طرف ان کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ اِن بیانات میں بھی اُن کا عالمانہ پن نمایاں ہے اور مسائل کے اظہار میں وہ چابک دستی ہے جو روایت کو دِرایت کر دکھاتی ہے۔

گذشتہ دس بارہ سال کے عرصے میں مولوی صاحب کی کوئی مستقل تصنیف منظرِ عام پر نہ آ سکی، لیکن اُن کے خطبات اور اپنے معاصرین کے بارے میں اُن کے سوانحی انشائیے شائع ہوتے رہے۔ انھیں دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے قلم کی روانی اور بیان کی شگفتگی میں ماہ و سال نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اس کا ثبوت اُن کے وہ مضامین ہیں جو" قومی زبان" میں احسن مارہروی اور دوسرے ادیبوں کے بارے میں نکلتے رہے۔ اس کے علاوہ "یادوں کے چراغ"

بھی ان کے یادگار مضامین میں سے ہے۔

اِس مضمون کے آخر میں، اُن کی گذشتہ دس بارہ برس کی زندگی کے ہنج پر نظر رکھتے ہوئے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ آیا وہ زمانہ اور زندگی کی ساری ناسازگاریوں سے بے نیاز ہوکر اُردو کا حق ادا کرتے رہے یا نہیں، اور اُردو زبان کی خدمت بغیر کسی پُشت پناہی کے انجام دینے کی وہ اپنے آپ میں کہاں تک ہمت رکھتے ہیں، کیونکہ ناسازگار ماحول اور ناساعد حالات میں جھوٹی محبت کا مُلمع اُتر جاتا ہے۔ اِس ماحول میں جہاں تک مولوی صاحب کے کارناموں پر نظر جاتی ہے، ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں بھی اُردو زبان ہی اُن کا سب کچھ رُہی اور اِسی سہارے وُہ جیتے رہے۔

---

مولوی عبدالحق کے کارنامے اس درجہ بلند، گراں مایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک و ہند کے آسمان کے نیچے کوئی دُوسرا شخص علم و ادب اور زبان کے دائرے میں اُن کی ہم سَری کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور نیز ہ ذوقی و اغراض جوشی کے جس دَور سے ہم گزُر رہے ہیں اُس میں مَولانا جیسے کسی فرد کا پَیدا ہونا بظاہر مشکل ہی نظر آتا ہے

——— مَولانا غلام رسول مہر

سید قدرت نقوی

# غالبؔ سے مولوی عبدالحق تک

## (نثری اُسلوب کا ارتقا)

مولوی عبدالحق نے عمر کے لحاظ سے تقریباً ایک صدی گزاری اور ان کی شعوری زندگی اسی برس سے کم نہیں تھی۔ اس لیے اگر ان کو تاریخ کی ایک زندہ کتاب سے تعبیر کیا گیا ہو تو حقیقت کے عین مطابق ہے، انہوں نے قدیم و جدید تہذیب کے جلوے دیکھے۔ اس لیے ان کی زندگی میں قدیم و جدید اقدار کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کی ایک باکمال شخصیت تھے، خلوص ایثار، ہمدردی اور محبت کا مجسمہ تھے، اُنہوں نے زبان و ادب کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ اُن کا اپنا ایک خاص اسلوب تھا۔ اس اُسلوب کو سمجھنے اور پیش کرنے کے لیے اُردو نثر پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔ کیونکہ مولوی عبدالحق کا دورِ حیات، سرسیّد کے دَور سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ سرسیّد سے پہلے نثر کی کیا حالت تھی اور ان کے عہد میں کیا رہی؟ مولوی عبدالحق پر کن کن ہستیوں کا اثر ہے؟ اور مولوی عبدالحق کی نثر میں کیا کیا خصوصیتیں پائی جاتی ہیں؟

اُردو نثر کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج اور جان گلکرسٹ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ دَور ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتا ہے جس میں اُردو سادہ نویسی کی داغ بیل پڑی۔ اس دَور کا شاہکار میر اَمنؔ کی "باغ و بہار" ہے۔ کیونکہ وہ اُردوئے معلّیٰ میں لکھی گئی ہے، اُس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زبان روزمرّہ کے مُطابق نہایت سادہ اور بے تکلّف ہے، گو کہیں کہیں مسجّع مقفّیٰ نثر کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر وہ بھی بوجھل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں باغ و بہار بہر اُس دَور کی تہذیب کی نمائندگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے مگر میر اَمنؔ کی سادہ نویسی کا اثر عام نہ ہو سکا اور پُر تکلّف نثر کا چلن برابر رہا۔ بلکہ ردِّ عمل کے طور پر مرزا رجب علی بیگ سرؔور

نے نہایت مسجّع و مقفّیٰ عبارت میں "فسانۂ عجائب" تصنیف کی۔ میر امّن کی تصنیف کا خاکہ بھی اُڑایا۔ اس زمانہ میں معیارِ قابلیت ہی مسجّع و مقفّیٰ نثر خیال کیا جاتا تھا۔

سَر سیّد احمد مرحوم نے دُرست فرمایا تھا کہ "میر امّن کو نثر میں وہی مقام حاصل ہے جو میر تقی میرؔ کو نظم میں ہے"[1]۔ میر امن کے بعد اُردو نثر میں گو سادگی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ مگر مقبولیت کی حد تک نہیں۔ اُردو نثر و نظم میں ترقی ہو رہی تھی۔ زبان حشو و زوائد سے پاک کی جا رہی ہے۔ اہلِ زبان اسکے ارتقا میں کوشاں نظر آتے ہیں، مگر زبان کو کسی نابغہ کی ضرورت تھی جو نظم و نثر کے جسد میں روحِ تازہ پھونکے میر و مرزا کی زبان اور طرزِ بیان کو ترقی دے۔ یہ کام مشیتِ ایزدی میں غالب کی قسمت تھا۔ غالبؔ نے نظم کو اَوج و عروج بخشا اور نثر کو مقبولِ عام بنایا۔ میر امن کی سادگی، روزمرّہ اور محاورہ تک محدود تھی۔ اس میں توانائی و دِل رُبائی غالبؔ نے پیدا کی۔ غالبؔ کی نثر میں بے اندازہ خصوصیات ہیں جن کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ کی نثر "سہل ممتنع" ہے۔ یہاں غالبؔ کی نثر کا ایک اقتباس مُلاحظہ فرمائیے۔ "سہل ممتنع" میں ہے:

"میری جان! کن اوہام میں گرفتار ہے؛ جہاں باپ کو پیٹ چکا۔ اَب چچا کو بھی رو۔ خُدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورتِ وقوعی دے۔ یہاں خُدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بَن نہیں آتی، اَپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں رنج و ذلت سے بھی خوش ہوتا ہوں۔ یعنی مَیں نے اَپنے کو اَپنا غیر تصوّر کیا ہے، جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو! غالبؔ کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ مَیں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں، لے: اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے۔ غالبؔ کیا مَرا، بڑا مُلحد مرا، بڑا کافر مَرا۔ ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے "جنت آرام گاہ" "عرش نشین" خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو "شاہ قلمرو سخن" جانتا تھا "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے! نجم الدولہ بہادر "ایک قرضدار بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں؛ اَجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حُرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسا! کچھ تو بولو! بولے کیا؛ بے حیا، بے غیرت کوٹھی سے شراب۔ گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صرّاف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا۔ کہاں سے دُوں گا۔"[2]

---

[1] تاریخ ادبِ اُردو، صفحہ - ۵۸

[2] خطوطِ غالب، صفحہ - ۱۱۱

یہ خط روزمرہ، محاورہ، مکالمہ، محاکات، جذبات نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں مقفیٰ اور مسجع جملے آگئے ہیں۔ مگران میں "آورد" یعنی عمد کو دخل نہیں بلکہ آمد و بےساختہ پن کے حامل ہیں غالبؔ کی نثر میں سادگی کے ساتھ ساتھ، تشبیہہ اور استعارے کی لطیف آمیزش پائی جاتی ہے۔ غالب کی سادہ نویسی کو قبولیتِ عامہ حاصل ہوئی اور اس روش کو سب سے پہلے سرسید نے اپنایا مگر سرسید کی نثر صرف سادہ تھی۔ اسی طرح اُن کے معاصرین نے بھی سادہ نویسی اختیار کی مگر بقول رام بابو سکسینہ: "مولانا حالیؔ "سرسید، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد اور اُن کے علاوہ دیگر اربابِ قلم مثلاً امیر مینائیؔ اکبرؔ وغیرہ نے بھی سادگیٔ عبارت کو پسند کیا اور اپنے اپنے طریق پر نثر میں لکھیں۔ مگر یہ حق ہے کہ مرزا کی سادگی و دلکشی، شوخی ظرافت جذبات نگاری، اظہارِ مافی الضمیر میں کوئی اُن کا مدِ مقابل نہ ہو سکا۔[1] اور آگے چل کر سرسید کے متعلق ان کا بیان ہے۔" مگر سرسیدؔ اور غالبؔ کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرزِ عبارت کا سرسید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے۔ اس کا نقشِ اوّل غالبؔ کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔ اسی لیے میں نے لکھا ہے کہ اگر غالبؔ نہ ہوتا تو سرسیدؔ احمد سب کچھ بن سکتے تھے، مگر سرسید نہ بن سکتے۔"[1]

غالبؔ کے بعد جو دَور شروع ہوتا ہے، اُس کے امام سرسید ہیں۔ حالی، شبلی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کو اُردو کے ارکانِ خمسہ کا مرتبہ دیا گیا ہے، بلاشبہ سرسید نے سادہ نویسی کو فروغ دینے میں بڑا کام کیا ہے لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سرسید کی نثر صرف سادہ اور بے تکلف تھی اور یہ بھی غالبؔ کا اثر تھا، کیونکہ ۱۸۴۵ء کی تصنیف "آثارُ الصنادید" اس بات کی شاہد ہے کہ سرسید نے ابتداً قدیم طرز کی پیروی کی تھی۔ مولانا حالیؔ، جوشِ عقیدت میں اپنے ممدوح کے متعلق لاکھ کہیں کہ "آثارُ الصنادید" مولانا صہبائیؔ کے قلم سے لکھی گئی، مگر محققین کا بالاتفاق قول ہے کہ سادہ نویسی غالبؔ ہی کے زیرِ اثر اختیار کی تھی، سرسید سادہ نویسی کے امام سہی لیکن اُن کی نثر میں شگفتگی خال خال ہے مولانا حالیؔ اور رام بابو سکسینہ دونوں کا اس امر میں اتفاق ہے کہ سرسیدؔ زبان کے اُصول و قواعد و انشا کا مطلق خیال

---

[1] تاریخِ ادب اُردو ص۳۴۱

نہ رکھتے تھے۔ اُن تک تو یہ روش قابلِ مواخذہ نہ تھی کہ کثرتِ اشغال کی وجہ سے نظرِ ثانی کرنے کی رحمت نہ ملتی ہو مگر اُن کے مُقلدین نے اس اُصول کو عام کرکے یقیناً زبان کو نقصان پہنچایا اور سنہ ۱۹۳۶ء سے ترقی پسندی کی تحریک نے اِس کو اور تقویت بخشی۔ موجودہ نسل کا یہ رُجحان محنت سے گریز کی وجہ سے ہے۔ بہرحال سرسیدؒ نے سادہ نویسی کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا۔ اُن کی نثر کا ایک اقتباس ؎ ملاحظہ فرمائیے:

"سعدی علیہ الرحمۃ کسی مقام پر اپنے ایک دوست کے ہاں مقیم رہے اُن کے دوست نے بہت اہتمام سے اُن کی مہانداری کی۔ بڑے تکلّف کے کھانے پکوائے اور بڑی شان کے ساتھ دسترخوان چنا گیا۔ شیخ نے جب یہ سامان دیکھے تو بے اختیار اُن کی زبان سے نکلا "ہائے دعوتِ شیراز"! صاحبِ خانہ نے یہ سمجھا کہ دعوت کے اہتمام میں کچھ کمی رہی، اس لیے اس نے دوسرے تیسرے وقت میں بیش از بیش اہتمام کیا۔ لیکن شیخ نے وہی افسوس ظاہر کیا۔ آخر شیخ نے جب دیکھا کہ اب میزبان کو بہت تکلیف ہوتی ہے تو اُس نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور یہ میزبان سے رُخصت ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس میزبان کا گذر شیراز میں ہوا اور شیخ کے ہاں اُترا اور اپنے دل میں اس بات سے بہت خوش تھا کہ اب شیراز کی دعوتوں کے اہتمام دیکھنے میں آئیں گے۔ جب کھانے کا وقت آیا تو شیخ اپنے گھر میں گیا اور وہاں سے وہی روزمرہ کا سیدھا سادہ کھانا لے آیا اور اپنے دوست کے سامنے رکھ دیا اور کہا "بسم اللہ کیجیے!" اس وقت شیخ کے دوست کو بہت حیرت ہوئی اور اس نے آہستہ آہستہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھانا شروع کر دیا۔ شیخ نے اس کی حیرت دیکھ کر کھانا کھا چکنے کے بعد اس سے کہا "دوست! دعوتِ شیراز سے میرا یہی مطلب تھا تم نے میرے واسطے بہت سا تکلّف کیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر میں زیادہ قیام کرتا تو تم کو سخت ناگوار گذرتا اور میری مہمانی سے بجائے خوشی کے ملال حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اس وقت مجبور ہو کر اپنی مدّتِ قیام کو مختصر کیا اور جس غرض سے وہاں گیا تھا، وہ بھی پوری نہ ہوئی۔ نہ میں اچھی طرح وہاں ٹھہر سکا، نہ سیر کر سکا۔ جلدی سے واپس چلا آیا۔ یہاں آپ جتنی مدّت تک چاہیں قیام کریں جتنے روز آپ یہاں رہیں گے۔ خوشی بڑھتی جائے گی۔"؎

---

؎ ماہِ نو فروری سنہ ۱۹۶۱ء

یہ اقتباس غالب کی نثر سے قریب تر ہے، دلچسپی اور رنگینی یہاں پیدا ہو سکتی تھی، مگر بات وہی ہے کہ سادگی ہے قوتِ متخیلہ کی رنگ آمیزی اور سحر کاری نہیں۔ سرسید کے بعد محمد حسین آزاد بھی سادگی اختیار کرتے ہیں۔ مگر اُن کی عبارت میں دلچسپی اور رنگینی کمال کے درجہ پر پہنچی ہوئی ہوئی ہے۔ اُن کی عبارت کو "انشائیہ" کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ سکسینہ کا خیال ہے کہ:

"اُن کی طرزِ تحریر کی یہ خاص صفت ہے کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اور دُوراز کار صنائع بدائع جن کا آج کل بہت رواج ہے اس میں نہیں پائے جاتے۔ اُن کی عبارت کی یہ خاص شان ہے کہ بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی حسن و خوبصورتی اس میں ملی جلی ہوتی ہے۔ وُہ تکلفات و تضعات سے گو کہ عاری ہے مگر لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اس کے حسن کو دو بالا کرتی ہیں۔ وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے۔"[1]

محمد حسین آزاد کے متعلق یہ رائے صحیح ہے ۔ اور اُنہوں نے یہ لوازمات ہر قسم کی تصانیف میں برقرار رکھے ہیں۔ آبحیات تو اُن کا شاہکار ہے ۔ اور نیرنگِ خیال اُردو میں اپنی نوعیت کی واحد تصنیف مگر اسی کے ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی نثر میں دہلی کے روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی بھی ہے جو اُستاد ذوق کی صحبت کا اثر ہے۔ نیز انگریزی الفاظ کا استعمال جا و بے جا اُن کے ہاں نہیں ہے جو اس دور کے اکثر حضرات کا وتیرہ تھا۔ نیرنگ خیال کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

"عالم صورت چند روز میں رنگ نکال لایا۔ مگر نئے ڈھنگ سے، یعنی ساری زمین، شہر قصبوں اور گاؤں سے بھر گئی۔ کھیت اناج سے اور باغ میوؤں سے مالا مال ہو گئے۔ شہروں میں بازار لگ گئے۔ عمارتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ گھر آباد ہو گئے۔ جدھر دیکھو، ڈالیوں اور گلزاروں میں میوے دھرے، دسترخوان گھروں میں سجے، ذخیرے غلوں سے بھرے۔ کیا گھر کیا باہر، اس کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔"[2]

---

[1] تاریخ ادب اُردو ص۲۲۶ [2] نیرنگِ خیال ص۲۱

**دیگر:** "غالبؔ اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔"[1]

مولانا محمد حسین آزاد کے بعد اُن کی طرز خاص کو کوئی نہ نبھا سکا۔ بالخصوص تمثیل نگاری کو۔ البتہ مولانا شرر ....... کے ہاں کہیں کہیں اُن کا رنگ اور تمثیل نگاری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے مولانا آزاد کے رنگ کو اختیار کیا اور ایک حد تک نبھایا ہے۔ آزاد کے ساتھ مولانا شبلی بھی سادہ نویس ہیں۔ اگرچہ اُن کا میدان تنقید و تاریخ ہے، مگر اُردو نثر میں بھی ان کا خاص مقام ہے۔ سادگی کو انہوں نے بھی اپنایا۔ لیکن بھاشا کی چاشنی جو اُردوئے معلیٰ کی امتیازی خصوصیت ہے ان کے ہاں نہیں بلکہ عربی و فارسی الفاظ کی بہتات ہے اور انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن زیادہ نہیں۔ اُن کی نثر میں لکھنوی خصوصیات کا پر تو ہے۔ اگرچہ سر سید کی صحبت میں رہے اور شمالی ہند کے مختلف اضلاع میں تحصیل علوم میں زندگی بسر کی، مگر نثر میں اس علاقہ کی خصوصیات کا اثر نہیں۔ اگرچہ سر سید کا قول ہے کہ "مولانا شبلی کی تحریر میں لکھنؤ اور دہلی دونوں کی جھلک موجود ہے۔" مگر ہمیں اس سے اختلاف ہے کیونکہ ان کی تحریر پر اُردوئے معلیٰ سے زیادہ اُردوئے مطلا کی چھاپ ہے۔ روزمرہ تو ہے مگر محاورہ کی چاشنی نہیں۔ البتہ تشبیہہ و استعارہ کی رنگینی موجود ہے اور کہیں کہیں لطیف عبارت کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ خطوط بنام عطیہ بیگم کے علاوہ عام طور پر اُن کی نثر صاف اور سلیس ہے۔ تشبیہہ و استعارہ کے ساتھ ساتھ زورِ بیان بھی ہے۔ تاریخ میں وہ عقیدت کو شامل کر لیتے ہیں۔ اس لیے زورِ بیان میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض یہ اپنے معاصرین میں الگ پہچانے جاتے ہیں۔ دیکھئے "شعرالعجم" کی یہ عبارت جوش خطابت سے مملو ہے:

"شاعری سے اگر صرف تفریح خاطر مقصود ہو تو مبالغہ کام آ سکتا ہے۔ لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے، جو قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ہے جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے، جس

---

[1] نیرنگِ خیال صفحہ ۲۰۲

سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے، جس سے نوحہ کے وقت در و دیوار کے آنسو نکل پڑتے تھے، وہ واقعیت سے خالی ہو تو کچھ کام نہیں کر سکتی۔"

آزاد اور شبلی کے بعد مولانا نذیر احمد اس میدان کے شہسوار نظر آتے ہیں۔ مولانا کا اصل وطن بجنور تھا، لیکن بچپن ہی سے دلّی میں بسر کی تھی۔ اس لیے دلّی کے محاوروں پر عبور تھا۔ بچپن میں شرفا کے گھرانوں میں آمد و رفت رہی۔ اس لیے بیگماتی محاورات سے بھی آشنا تھے۔ عالم بے بدل تھے۔ اس لیے عربی و فارسی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ بھی پائے جاتے ہیں انتہا یہ کہ کرداروں کے افعال و اخلاق کے مطابق ان کا نام تجویز کرنا بھی اسی دور کی دلّی کی ایک خصوصیت کا اظہار ہے۔ نصوح، کلیم، ظاہر دار بیگ، ابن الوقت وغیرہ اپنے افعال و اخلاق کے خود نمائندہ ہیں۔ مولانا کی .... نثر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس پر ظرافت کی چاشنی ہوتی ہے، اور کہیں کہیں غالب کی ظرافت یاد آ جاتی ہے۔ توبۃ النصوح میں مرزا ظاہر دار بیگ ایک زندہ جاوید کردار ہے اور اس میں یہ چنے کی کہانی بڑی عمدہ ہے جس میں طنز و ظرافت کی لطیف چاشنی پائی جاتی ہے:

"چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو اَرزاقِ عباد کا اہتمام سپرد ہے فریاد لے کر گیا کہ یا حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے؟ کہ جُوں مَیں نے سرزمین سے نکالا تیرِ ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں، مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے۔ نشو و نما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں قدا مد ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے، آدمی بکری بن کر لاکھوں من بونٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی، تو ہولے کرنے شروع کئے۔ بچا تو شاخ و برگ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخِ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ، اس کو چکی میں دلیں۔ گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں، گھنگھنیاں پکائیں۔ غرض کہ شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرتِ میکائیل کے دربار میں اس طرح بے باکانہ، چَٹر پَٹر بولنا سُن کر حاضرینِ دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اُسے کھانے کو دوڑا۔" (توبۃ النصوح، مجلس لاہور ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۷۸)

مولانا کو انگریزی الفاظ استعمال کرنے کا بھی شوق تھا۔ لیکن یہ استعمال برمحل ہوتا تھا۔ البتہ محاورات کے استعمال کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اگر یہ اعتدال پر ہوتا تو اُمہات الاُمۃ جیسی تصنیف کو نذرِ آتش نہ کرنا پڑتا۔

اِس دور کی اَہم ہستی مولانا حالیؔ تھے جنہیں تربیت کے سب سے زیادہ مواقع ملے۔ شیفتہؔ کی ملازمت، غالبؔ کی شفقت، سرسیدؔ کی محبت، محمد حسین آزاد کی معیت، شبلیؔ اور نذیر احمد کی رفاقت، استفادہ کے اِتنے مواقع میسّر ہونے کے باوجود مولانا حالی سرحدِ تقلید سے آگے بڑھکر منزلِ اجتہاد میں قدم نہ رکھ سکے۔ اُن کی نثر سرسیّد کی طرح سادہ اور صاف ہے، محاورات کا استعمال بھی ہے۔ بھاشا کے الفاظ مولانا آزاد سے زیادہ استعمال کئے ہیں اور انگریزی الفاظ کی بہتات اُن کی نثر میں پائی جاتی ہے جس سے اُردو زبان کو اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا نقصان۔ کیونکہ مولانا حالیؔ انگریزی نہیں جانتے تھے، شوق میں آکر انہوں نے انگریزی کے ایسے الفاظ بھی استعمال کئے جن کے متبادل اردو میں موجود تھے۔ حالیؔ کے مقابلے میں مولانا آزاد اور شبلی نے بہت محتاط ہوکر انگریزی استعمال کئے ہیں۔ بلکہ مولانا آزاد تو متبادل تلاش کرنے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ نیرنگِ خیال میں "علمیت اور ذکاوت" کے مقابلے کے سلسلہ میں جو حاشیہ لکھا ہے وہ اِس اَمر پر کافی روشنی ڈالتا ہے:

"انگریزی میں وٹ ( WIT ) اور لرننگ ( LEARNING ) کا مُباحثہ تھا میں نے وٹ کے واسطے بہت خیال کیا کوئی لفظ (مفرد) نہ ملا، ناچار ذکاوت لکھ دیا۔ اِس میں جو لفظی اور معنوی کوتاہی ہے سو ظاہر ہے مگر اور لفظ اتنا بھی نہ تھا، مجبور سب قباحتوں کو برداشت کیا۔ کیونکہ غرض مُطلب کے سمجھانے سے ہے جو صاحب اس سے بہتر پائیں تحریر فرمائیں۔"²

بات دراصل یہ ہے کہ مولانا حالی انگریزی سے نابلدی کے احساس کا شکار ہوکر کثرت سے انگریزی الفاظ استعمال کرکے طبیعت کو تسکین دیتے ہیں۔ اسی طرح بھاشا کے ایسے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں جو اردوئے معلّیٰ میں مُستعمل نہیں۔ یہ دونوں اَمر اگر حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرتے تو بہتر تھا۔ ان کے علاوہ اُن کی نثر میں دلچسپی بالکل خال خال نظر آتی ہے۔ بے کیفیت کا ہر جگہ احساس ہوتا ہے۔ یہ تمام تر اُن کی اِبتدائی تربیت کا اثر ہے۔ اَیسے مواقع بھی جہاں دلچسپی

---

۱؎ توبۃ النصوح ص۱۷۱ مطبوعہ شمس المطابع لکھنؤ ۲؎ نیرنگِ خیال ص۲۷

اور شوخی پیدا کی جا سکتی تھی بالکل سپاٹ نکل جاتے ہیں۔ مولانا نذیر احمد کی ایک عبارت جس میں چنے کا قصہ بیان ہوا ہے ہم پیش کر چکے ہیں۔ یہی قصہ مولانا حالی نے بھی یادگار غالب میں لکھا ہے مگر وہ اپنے "حیوان ظریف[1]" کی شوخی و ظرافت کو صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ کر سکے دیکھیے:

"مرزا نے کہا: ارے رحمن! چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں۔ بھونتے ہیں۔ پکاتے ہیں۔ اور مجھ سے سینکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے ورنہ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔[2]"

ظاہر ہے کہ مولانا نذیر احمد کا بیان مولانا حالی کے بیان سے زیادہ دلکش و دلچسپ ہے۔ مولانا حالی اس میں لطیفہ کی شان پیدا نہیں کر سکے۔ اس موقع پر یقیناً وہ غالب کی شوخی و ظرافت کو منتقل کرنے میں سخت ناکام رہے ہیں۔ غرض مولانا حالی پر یہ دَور ختم ہوا، مگر اس دَور کی سہ ممتاز ہستی نے دورِ آئندہ کو متاثر کیا ہے۔

مولوی عبدالحق نے اس دور کو بھی دیکھا تھا اور اس دور کی ان مایہ ناز ہستیوں سے استفادہ بھی کیا تھا۔ نئے دَور نے اُن کی آنکھوں کے سامنے جنم لیا اور ترقی کی منزلیں طے کیں۔ مولوی صاحب زمانہ کے بہت بڑے نباض تھے۔ اُردو کی خدمت جو اُنہوں نے کی ہے، اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ یہ خدمت ہمہ جہتی حیثیت رکھتی ہے۔ اَدب اور سیاست کے میدان میں ان کا حریف مشکل سے نظر آئے گا۔ گاندھی جی سے ٹکر یا تو قائد اعظم نے لی یا مولوی عبدالحق نے۔ قدیم اَدب کی چھان بین اور تلاش میں اُن کی کوشش بے مثال ہے۔ لُغت اور لسانیات کے سلسلے میں اُن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

مولوی صاحب بے مثال نثر نگار تھے کیونکہ اُنھوں نے مُروّجہ علوم و فنون کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن کا قلم سیاسیات، تاریخ، سوانح، تنقید، تحقیق، تبصرہ نگاری، لسانیات مقدمات، تعارف غرض ہر میدان میں جولانیاں دکھاتا رہا ہے۔ اُن کی نثر میں محاورات کا استعمال

---

[1] حالی نے غالب کو حیوانِ ناطق کی بجائے حیوان ظریف لکھا ہے یہاں بھی مولانا مغالطے کا شکار ہوئے ہیں کیونکہ غالب کی ظرافت دو باتوں کے ردِ عمل کے طور پر تھی۔ ایک تو غمِ دوراں، دوسرے ادبی کاوشوں سے پیدا شدہ اضمحلال کے ازالے کے لیے اور ہر نابغہ دہر اپنی مقصدیت کو بروئے کار لانے والی قوتوں کو تسکین دینے کے لیے اس قسم کے مشاغل اختیار کیا کرتا ہے۔ [2] یادگارِ غالب صہ ۱۹۹

برمحل ہے۔ چھوٹے چھوٹے جُملے، ابلاغ مطلب و مفہوم کی نرالی شان لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ روزمرہ کی صفائی و شانِ دُلربائی۔ عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ، بھاشا کے عمدہ الفاظ نگینہ کی طرح جڑے ہوئے انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال یک قلم مفقود۔ کوئی سا موضوع ہو قلم کی روش متوازن و معتدل، غرض اُن کی نثر معتدل و دلنشین ہوتی تھی۔ سادگی بیان کے متعلق ان ہی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

"سادگی دپُرکاری کمال صناعی ہے، اِسں میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیئے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطفِ بیان اور اثر بھی ہونا چاہیئے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اُپنے فن یا علم پر کافی عبور ہو۔ وُہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں مرغوب طرزِ بیان کے ذریعے عام مثالیں دیکر اُدا کرتا ہے کہ مضمون قابل فہم اور دلکش ہو جاتا ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے اُدا نہیں کر سکتا۔ تحریر اور تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں۔ اس کے اثر کو قبول کریں اور لُطف اُٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار ہے، تضیعِ اُوقات ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اثر رنگین عبارت مُقفیٰ و مُسجع، جُملوں تشبیہوں اور استعاروں کے ایچ پیچ سے نہیں پیدا ہوتا۔"

مولوی عبدالحق نے ہمیشہ اسی اصول کو پیش نظر رکھا۔ بعض کا کہنا ہے کہ مولوی عبدالحق پر حالی کا اثر ہے۔ لیکن مَیں اِس کو کلیتہً قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ مولوی عبدالحق پر تنہا حالی کا اثر نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے وہ سرسیدؔ سے متاثر ہیں۔ یوں تو سرسیدؔ پر غالبؔ کے اثر کے علاوہ انگریزی کا بھی اثر ہے۔ ان کے مضامین بلحاظ مواد انگریزی ادب سے مستعار ہیں اور کہیں کہیں انگریزی اسلوب کی بھی جھلک ہے حالیؔ نے سرسیدؔ کی تقلید کی اور انگریزی کی دوستی کے زمانہ میں کچھ انگریزی طرز کا بھی اُن پر اُثر پڑا۔ لیکن اِن باتوں کے باوجود مولوی عبدالحق پر تنہا حالیؔ کا اثر نہیں ہے بلکہ حقیقی اثر سرسیدؔ کا ہے۔ اور زبان پر اثر کچھ اُن کی جنم بھومی کا بھی ہے۔ اُن کے ہاں جو بھاشا الفاظ کی آمیزش ہے، وُہ میرے نزدیک اس لیے ہے کہ مولوی صاحب کا وطن یعنی ہاپوڑ میرٹھ

ضلع میں ہونے کے باوجود ایسا علاقہ ہے جہاں بھاشا کا اثر غالب ہے، اور وہی اثر مولوی صاحب کی زبان میں موجود ہے۔ البتہ کہیں کہیں وہ تنقید میں حالیؔ سے متاثر ہوئے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نزدیک مولوی صاحب حالیؔ کا مثنیٰ ہیں۔ لکھتے ہیں :

"عبدالحق حالیؔ کا مثنیٰ صرف تحریر ہی میں نہیں بلکہ اندازِ تنقید میں بھی ہیں۔ مگر حالیؔ کا مثنیٰ ہونا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے بھی ذہانت، قابلیت اور فہم و فراست کی ضرورت ہے اور یہ خوبیاں مولوی عبدالحق میں موجود ہیں۔ اس لیے عبدالحق کا حالیؔ کا مثنیٰ ہونا بھی اُن کے لیے باعثِ فخر ہے۔"

اس رائے سے بڑی حد تک اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر جیسا کہ پہلے تبلایا جا چکا ہے کہ اندازِ تنقید میں مولوی صاحب حالیؔ سے ضرور متاثر ہیں۔ مگر حالیؔ کے ہاں وہ قطعیت نہیں جو مولوی صاحب کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اسلوبِ نگارش میں بھی مولوی صاحب کے ہاں حالیؔ کی سی خشکی خال خال ہے۔ شگفتگی اور دلچسپی کافی ہے، اور یہی چیز ان کو حالیؔ سے ممیز کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی صاحب کی نثر جستہ جستہ مقامات سے پیش کی جاتی ہے۔ لطفِ بیان کے سلسلہ میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں بات کو دلنشین کرنے کے لیے تمثیلی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے:

"تصویر جس قدر بڑی — شاندار اور نفیس ہوتی ہے اُسی قدر اُسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خد و خال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں۔ اور صانع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنھوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کارنمایاں کئے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان میں موافق بھی ہوتے ہیں۔ (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف نہ پیدا کئے) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں۔ اور ریاکار بھی و خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی رائے کے جانچنے کے لیے نیت بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور اُلجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔"

یہ سرسید احمد کی سوانح کی تمہید ہے۔ کتنی عمدہ طرز اور کتنا اچھا تمثیلی انداز ہے۔ مولوی صاحب

کی تحریر میں بلا کا زورِ بیان پایا جاتا ہے۔ ذیل کا اقتباس زورِ بیان کا نمونہ ہے، جس میں خطابت کا ساز زیر و بم موجود ہے۔ الفاظ خود بیان کے اُتار چڑھاؤ کو ظاہر کر رہے ہیں:

"انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اُسے معلوم ہوگا کہ وُہ مقاصد جن کے لیے وُہ رات دن سرگرداں و حیران رہا، وُہ آرزوئیں جن کی خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا، اور وہ کوششیں جن کے لیے اُس نے اپنی جان تک کھپا دی، پانی کے بُلبلے سے زیادہ ناپائیدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں اور کچھ انہیں کاموں کو بقا حاصل ہے جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور شاید ضمنی طور پر کیے گئے تھے۔"

مولوی صاحب کی صحبت بڑی پُرلطف ہوتی تھی۔ لطیفہ بازی، ظرافت اور طنزِ ملیح کی آمیزش سے محفل سدا باغ و بہار رہتی تھی۔ ظرافت کی جھلک ان کی تحریروں میں بھی ملتی ہے مولوی چراغ علی کے متعلق لکھتے ہیں:

"مطالعے سے بے حد شغف تھا۔ گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ . . . انتہا ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔"

میرن صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"میرن صاحب باتیں مزے لے لے کر اور ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔ جلدی ان کے مزاج میں نہ تھی اور نہ ان کو اس کی ضرورت تھی۔ شاید غدر میں بھاگتے وقت اس کی ضرورت پڑی ہو تو پڑی ہو ورنہ یوں عام طور پر زندگی کے کاروبار میں اُنہیں اِس "شیطانی حرکت" یعنی تعجیل سے واسطہ نہیں پڑا۔"

اِسی طرح طنز کے نشتر بھی اُن کے ہاں چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ ریاستوں کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ حقیقت بھی اور طنزِ ملیح بھی:

"والئ ریاست اپنے علاقے کا حاکم با اختیار ہے، سیاہ و سفید کا مالک ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک ایسی بیجڑ لگی ہوئی ہے جس کے سامنے سارے اختیارات دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب شخص ہوتا ہے نہ صاحبِ اختیار ہے۔ نہ صاحبِ جاہ و منصب۔ نہ غیر معمولی قابلیت اور ذہانت رکھتا ہے۔

لیکن سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے۔ یہ ریزیڈنٹ بہادر ہیں۔ راج پاٹ تو "حضور" کا ہے لیکن اس کنکوے کی ڈور" صاحب عالی شان بہادر" کے ہاتھ میں ہوتی ہے"۔

مولوی صاحب کو نتائج کے استنباط اور ابلاغ مفہوم میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتے ہیں۔ اخذ نتائج و ابلاغ مفہوم میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چند جملے ملاحظہ فرمایئے:

"کم ہیں جو اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائدار ہوتی ہے۔"

"انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ تو مذہب کی پناہ ڈھونڈھتا ہے"

"بے تعصبی کا وصف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔"

"شہرت وہ بدبلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے"۔

"اپنے سہارے آپ کھڑا ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا۔"

"کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام نہیں، بے گار ہے"۔

"درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے۔"

"انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ جو کسی کے مٹائے نہیں مٹتے"۔

یہ بات تو سب پر ظاہر ہے کہ مولانا حقیقت نگاری کے لیے مشہور تھے۔ تنقید میں بھی ان کی یہی روش تھی۔ وہ مرعوب ہونا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ اظہار حقیقت میں بھی وہ نہ مرعوب ہوتے تھے اور نہ مصلحت کا شکار۔ اردو کے متعلق جو طریقہ پاکستان کی سابقہ حکومتوں نے اختیار کر رکھا تھا اس پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جو ناقابل اور نامعقول لسانی ضابطہ (فارمولا) لیگ کی پارلی منٹری اور مجلس دستور ساز نے منظور کیا ہے، اس میں زبان کے متعلق تین نام استعمال کئے گئے ہیں۔ ۱۔ افیشل لنگویج ۲۔ اسٹیٹ لنگویج ۳۔ نیشنل لنگویج۔ یعنی دفتری زبان اور قومی زبان۔ یہ الفاظ بے سوچے سمجھے استعمال کئے گئے ہیں اور مجوزین فارمولا

نے ان کو مترادف سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات حقیقت سے کس قدر دور اور زبان کے مسئلہ سے کس قدر بے خبر ہیں۔

"مملکت پاکستان ایک فیڈرل یعنی وفاقی حکومت ہے۔ لہٰذا اس کی زبان بھی فیڈرل یعنی وفاقی ہونی چاہیئے۔ وفاقی زبان سے مُراد وُہ زبان ہے جو پاکستان کے ہر حصّے (یونٹ) میں زیادہ سے زیادہ بولی اور سمجھی جائے۔ اس بنا پر علاقائی اور صوبائی زبانیں خود بخود خارج ہو جاتی ہیں۔ خواہ وہ چار کروڑ کی ہوں یا چار لاکھ کی۔ کیونکہ وہ ایک محدود رقبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اس لیے باہر اُنہیں کوئی نہیں سمجھتا۔ اس لیے ان میں سے کوئی زبان بھی وفاقی حکومت کی زبان نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کی وفاقی زبان صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ ہے اُردو جو نہ صرف پاکستان میں بلکہ برّاعظم بھارت پاک اور اس سے باہر بھی دُور دُور چھائی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائدِاعظم علیہ الرحمۃ نے اسے پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دیا تھا۔"

اتنی تیز اور تلخ باتیں ایک حقیقت پسند ہی کہہ سکتا ہے اور مُلاحظہ فرمایئے:

"مہاجر جنہوں نے پاکستان کے لیے بے مثال قربانیاں کیں اور جان دے کر، عصمتیں کھو کر، گھر بار لُٹا کر، ان کے لیے پاکستان حاصل کیا جو آج برسرِاقتدار ہیں اُن کی طرف سے جو ناقابلِ معافی غفلت اور بے اعتنائی کی جا رہی ہے اور ان کے حقوق کو پامال اور توقعات کو خاک میں ملایا جا رہا ہے وہ جرم ہی نہیں معصیت ہے دیکھنا یہ ہے کہ ان کے زخموں پر مرہم رکھنے اور ان کی خوش حالی اور بسانے کے لیے ہمارے لیے وزرا رنامدار کیا تدبیریں اختیار کرتے ہیں۔"

یہ بے باکی، یہ نڈرپن، یہ حوصلہ اور ہمت حقیقت پسندی کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟ بات مولوی صاحب میں ابتدا ہی سے تھی چنانچہ دیسی ریاستوں پر بڑی ہی کڑی نکتہ چینی کی ہے اور حقیقت کو واشگاف الفاظ میں آشکارا کیا ہے:

"ریاستوں میں نوکری کرنا اور اپنی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں وہاں سازشوں ترغیبوں اور پیچیدگیوں کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تیز نظر اور ہوشمند بھی پھنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر کچھ کرنا ہے تو دانستہ یا نادانستہ،

بالواسطہ یا بلاواسطہ پھنسنا ہی پڑتا ہے۔"

"خود مختار ریاستوں میں ایک بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سازشوں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ ہر شخص کی (خواہ وہ کوئی ہو) یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح "سرکار" کو خوش کر لیا جائے جس سے "پیا" خوش ہو اسی کا راج۔ اس سعی میں رقابت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس کش مکش میں کذب وافترا، بہتان، مخبری، غرض کوئی ایسی کمینہ حرکت نہیں ہوتی جو حریف ایک دوسرے کے خلاف کام نہ لاتے ہوں گے۔ یہ ایک عجیب اسرار ہے جس کا سلسلہ شاخ در شاخ دُور دُور پہنچتا ہے اور عجیب رنگ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔"

یہ تھا مولوی عبدالحق مرحوم کا اندازِ تحریر و اسلوب نگارش جنہوں نے اُردو کی خدمت کرتے کرتے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ وہ مر گئے، مگر ان کے کارنامے زندہ ہیں۔ وہ ہمارے لیے، خلوص، ایثار، خدمت لگن، صداقت اور ہمت و استقلال کا سبق اپنی زندگی میں چھوڑ گئے ہیں۔ اُن کی زندگی ان کے کارنامے میں موجود ہے اور اُن کے کارنامے زیادہ تر اُن کی تحریریں ہیں جن میں اُن کا دل اور دماغ محفوظ اور کارفرما ہے اس لحاظ سے وُہ آج بھی ہماری محفل میں بیٹھے ہوئے، ہمیں صحت مند فکر و نظر کے اُصول وضوابط بتا رہے ہیں۔

---

"ڈاکٹر عبدالحق اپنی ذات میں خُود انجمن اُردو ہیں۔ اُن کی ساری عمر اُردو کی خدمت گزاری میں گزری ہے۔ حق یہ ہے کہ بابائے اُردو کا خطاب مولوی صاحب کے قامت پر راست آتا ہے۔"

——— جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن

# ۵

"مولوی عبدالحق ۔۔۔۔ کا علم، اُن کی ادبی بصیرت، فنّی آگاہی، لسانی مہارت ہمیں اپنے بزرگوں کی صلاحِ استعداد کی یاد دلاتی ہے ۔۔۔۔ وہ ادب کے اُن تمام شعبوں میں مہارت رکھتے ہیں جن سے آگاہی ایک ادیب کے لئے ضروری ہے۔ (وہ) اُردو زبان کے اُداشناس ہیں اور زبان کی ماہیت سے آگاہ۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُردو الفاظ کس طرح بنتے ہیں، لفظوں کے صوتی آہنگ و ترتیب سے جادو کس طرح جگایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کے ساحرانہ اسلوبِ بیان کا ۔۔۔۔۔ راز، ۔۔۔ اُدب و زبان کے مسائل سے (اُن کی) مجتہدانہ آگاہی ہے۔

مولوی صاحب نے اوّل اوّل اُردو ادب کے قدیم دکنی شعرا کے کلام کو ترتیب دیا اور اُن پر تحقیقی و تنقیدی مقدمے لکھے۔ اُردو شعراء کے تذکرے، جدید اُصولِ ترتیب و تدوین کے مطابق شائع کئے۔ بعض شعُراء پر تنقیدی مقالات لکھے اور اُن کے کلام کا انتخاب کیا۔ اُردو زبان کی پہلی اور آخری معیاری قواعد لکھی۔ جامع اور مکمل تاریخی لُغت کی داغ بیل ڈالی۔ فنّی و علمی اصطلاحات کے اُردو میں مُناسب و برمحل ترجمے ہی نہیں کئے، ترجمے کے اُصول بنائے۔ اُردو تحریر میں اصلاحات کیں اوقاف کے ضابطے اور اُن کی علامات مُقرّر فرمائیں۔ اپنے ہم عصروں کے جیتے جاگتے مُرقعے تیار کئے۔ یہ جامعیت کبھی اُردو کے کلاسیکی انشاپردازوں میں ہوا کرتی تھی۔۔۔"

—— ڈاکٹر شوکت سبزواری

# مجموعی جائزہ

| | | |
|---|---|---|
| تصانیفِ عبدالحق | ... | خواجہ تہوّر حسین |
| مولوی عبدالحق ۔ ایک مطالعہ | ... | آفتاب زبیری |
| مولوی عبدالحق ۔ ایک تأثر | ... | جمیل متینُ الرحمٰن |
| مولوی صاحب کے کارنامے | ... | عذرا کیفی |
| مولوی صاحب کا مرتبہ | ... | آمنہ صدیقی |
| مولوی عبدالحق کی خدمات | ... | سیّد معینُ الرحمٰن |

○

٥

"گذشتہ نصف صدی میں اُردو زبان و اَدب پر جو کچھ گزُرا ہے اور اس نے ترّقی کی جتنی منزلیں طے کی ہیں اُن سب سے مولوی صاحب کو گہرا تعلق ہے آپ کی ذات کا اِس عہد پر اِتنا گہرا اثر ہے کہ تاریخ زبان و ادب نہ آپ کی ذات کو فراموش کر سکتی ہے اور نہ آپ کے احسانات سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے ۔۔۔۔

مولوی صاحب تحقیق، تنقید، تصنیف، تالیف اور لسانی خدمت کی صورت میں جو کچھ کر چکے ہیں ۔۔۔ وہ ناقابلِ فراموش کارنامے ہیں ـــــ لیکن اس سے کم درجہ نہیں اُن اثرات کا جو آپ نے اِس طویل زمانے میں دوسروں پر ڈالے ۔ کتنے ادیب، نقّاد اور مُحقق ہیں جو مُولوی صاحب کی آغوش میں تربیت پاکر، آپ کی تحریروں سے مُتاثر ہو کر آپ کی بنائی ہوئی روِش پر چلے اور ہمارے آسمانِ ادب پر چمکے ـــــ"

ـــــ پروفیسر محمد طاہر فاروقی

پروفیسر خواجہ تہور حسین

# تصانیفِ عبدالحق

عبدالحق اردو کی آبرو ہیں۔ بیسویں صدی میں ترقی زبانِ اردو کی روئداد، عبدالحق کی زندگی کی روئداد ہے "الشجاع" کے عبدالحق نمبر میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا تھا:

عبدالحق اپنی ذات سے خود ایک ادارہ ہیں۔ انہیں اگر اردو ادب کی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو ادب کی نشاۃ ثانیہ سے عہد جدید تک جو تغیرات و انقلابات ہوئے ہیں ان کا تماشا عبدالحق کی آنکھوں نے دیکھا ہے، نہ صرف دیکھا بلکہ ایک سرگرم سپاہی کی مانند اس ادبی جہاد میں بھی حصہ لیا ہے ——،،

دیکھئے: راقم کا مضمون "چند ہم عصر" مطبوعہ ماہنامہ الشجاع، کراچی اگست ۱۹۵۹ء صفحہ ۹۵

دبعد اس قول کی صداقت کا اندازہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔ اس مضمون میں ان کی چند اہم تصانیف کا جائزہ لیا جائے گا۔

مولوی صاحب کے کتب خانۂ خاص میں مولوی صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف ہیں:[1]

۱۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر۔ ۲۔ مرحوم دِلّی کالج ۳۔ سرسیّد احمد خاں حالات و افکار
۴۔ چند ہم عصر۔ ۵۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ ۶۔ نصرتی ملک الشعرائے

---

[1] اس فہرست میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں۔ جو مولوی صاحب نے تالیف یا مرتب کی ہیں۔ (تہور حسین)

بیجاپور ۔ ۷۔ مقدمات عبدالحق ۸۔ تنقیدات عبدالحق۔ ۹۔ پاکستان میں اُردو کا المیہ۔

ان کتابوں کے علاوہ بہت سے مضامین ہیں جو کئی جلدوں میں ترتیب دئے جا سکتے ہیں مثلاً۔

۱۔ اُردو زبان کے قدیم کتبے — رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۳۸ء ص ۲۷۶
۲۔ اُردو میں دخیل الفاظ — رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۵۹ء ص ۵
۳۔ اُردو میں علمی اصطلاحات — رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۴۵ء ص ۱
۴۔ پرانی اُردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں — رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۳۷ء ص ۱
۵۔ جائزہ زبانِ اُردو، — رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۳۵ء ص ۱۴۰
۶۔ حالی اور انسانیت — رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۵۲ء ص ۵
۷۔ حالی مرحوم (مولانا) } خطبات میں شامل ہیں
۸۔ دکنی اُردو میں شاہ نامے کی داستانیں — رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۴۹ء ص ۵
۹۔ دیوانِ رنگین (ریختی) — رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۶۲۳
۱۰۔ سائن ٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ — رسالہ اُردو، جولائی ۱۹۳۵ء ص ۵۴۲
۱۱۔ سب رس منظوم — رسالہ اُردو، جولائی ۱۹۲۵ء ص ۴۹۹
۱۲۔ سرسید احمد خاں کی مجوزہ ورنیکلر یونی ورسٹی — رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۳۶ء ص
۱۳۔ شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی
(وفات نامہ حضرت فاطمہ از اسماعیل امروہوی رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۵۱ء ص ۵
۱۴۔ عورتوں کی زبان — رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء ص ۵
۱۵۔ غیر زبانوں کی قدیم وجدید اعلیٰ ادبی تصانیف کے ترجمے — رسالہ اُردو، جولائی ۱۹۳۷ء ص ۳۹۵
۱۶۔ قدیم اُردو، بیجاپور کے اولیاء اللہ کا ایک شاعر خاندان
" " ۱۔ حضرت میراں جی شمس العشاق — رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۲۷ء ص ۱۷۱
" " ۲۔ حضرت شاہ برہان الدین جانمؒ — رسالہ اُردو، جولائی ۱۹۲۷ء ص ۵۱۹
" " ۳۔ حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ — رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۲۸ء ص ۱۰
۱۷۔ اُردو نثر کی ایک بہت قدیم کتاب
شرح تمہید ہمدانی از سید میراں۔ رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۲۸ء ص ۱۵۳

۱۸ - قدیم اُردو - گجری (گجراتی) زبان :

| | |
|---|---|
| " ۱۔ شاہ محمد علی جیو گام دھنی | رسالہ اُردو ، جولائی ۱۹۲۸ء صہ ۴۵۰ |
| " ۲۔ میاں شیخ خوب محمد چشتی | رسالہ اُردو ، جنوری ۱۹۲۹ء صہ ۱۲۴ |
| " ۳۔ حسن شوقی | رسالہ اُردو ، جولائی ۱۹۲۹ء صہ ۵۴۰ |

۱۹ - قدیم اُردو ۔ حیدرآباد کا ایک شاعر خاندان :

| | |
|---|---|
| ۱۔ عشرتی ، سیّد محمد<br>۲۔ ہنر ، سیّد احمد<br>۳۔ احسان وعلی | رسالہ اُردو ، جولائی ۱۹۳۱ء صہ ۵۲۳ |

۲۰ - گجرات کا ایک قدیم شاعر :

| | |
|---|---|
| قاضی محمود دریائی قدس سرہ | رسالہ اُردو ، جولائی ۱۹۴۰ء صہ ۳۸۵ |
| ۲۱ - کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن اور دیسی زبانوں کی تعلیم | رسالہ اُردو ، اپریل ۱۹۲۲ء صہ ۲۴۷ د ۲۴۱ |
| ۲۲ - نواب عمادالملک (مولوی سیّد حسین بلگرامی) | رسالہ اُردو ، جنوری ۱۹۵۶ء صہ ۱ |
| ۲۳ - ولی کے سنہ وفات کی تحقیق | رسالہ اُردو ، جنوری ۱۹۳۴ء صہ ۱۹۶ |
| ۲۴ - وقت کا اہم تقاضا (اُردو یونی ورسٹی) | رسالہ اُردو ، اکتوبر ۱۹۴۴ء صہ ۴۶۱ |

مولوی صاحب کے یہ مضامین رسالہ اُردو میں شائع ہوئے ہیں۔ اسی رسالے میں "افکار و واقعات" اور "بادۂ کہن" نامی عنوانات کے تحت جو نگارشات ہیں اگر ان کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ فہرست خاصی طویل ہو جاتی ہے۔ انجمن ترقی اُردو کی سالانہ روئدادیں ان کے علاوہ ہیں۔ "افکار و واقعات" کے تحت ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک جو تبصرے اور واقعات پیش کئے گئے ہیں ان سے اُردو ، ہندی جھگڑے کی مختصر تاریخ ترتیب دی جا سکتی ہے۔ "بادۂ کہن" میں قدیم شعراء کے کلام کا انتخاب اور کہیں کہیں ان پر تبصرہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس میں سے بعض چیزیں انجمن نے بعد میں کتابی صورت میں شائع بھی کر دی ہیں۔ مثلاً خواجہ سیّد محمد میر اثر کی مثنوی خواب وخیال۔

مولوی صاحب کے بہت سے مضامین ہماری زبان ، قومی زبان ، دکن ریویو ، پنجاب ریویو معلم نسواں اور مجلہ عثمانیہ اور دیگر رسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کا ذکر طوالت کے باعث نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اہم مضامین وہی ہیں جو رسالہ اُردو میں شائع ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب

کے بعض مُقدمات، خُطبات اور تنقیدات بھی رسالہ اُردو میں شائع ہوئے ہیں۔ اس رسالے کا پہلا شمارہ مولوی صاحب کی ادارت میں جنوری ۱۹۲۱ء میں باہتمام مقتدیٰ خاں شروانی، انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ سے طبع ہوکر شائع ہوا۔ یہ رسالہ نہایت ہی ہمّت شکن حالات میں جاری کیا گیا تھا۔ اس کے اِجراء سے قبل معارف، حسن، دکن ریویو جیسے مشہور جرائد بند ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب کو اُن کے احباب نے اس نقصان دہ کام سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ کاغذ کی یہ ناؤ کب تک چلے گی اور یہ مضمون کب تک مساعدت کرے گا۔ مولوی صاحب نے ان کا جواب ان الفاظ میں دیا:

"اگر ذرا نظرِ غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ میدان باوجود تنگی کے بہت کچھ وسعت رکھتا ہے اور بجائے خود ایک عالم ہے۔ قلم کا مسافر آبلہ پا نہ ہو تو یہاں وہ وہ منظر نظر آئیں گے کہ جن کے لُطف اُٹھانے اور بیان کرنے کو ایک عمر چاہیے۔ نظر کوتاہی نہ کرے تو بہت سے ایسے خزانے ہیں جو ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں اور جنھیں ہوا تک نہیں لگی۔ ہمّت جی نہ چُرائے تو بہت سی کانیں ہیں جو ابھی کھودنی ہیں۔

(حرفِ آغاز۔ رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۲۱ء)

"اُردو" کے پہلے شمارے میں مولوی صاحب نے اپنی ایک تمنّا کا اظہار کیا تھا:

"مَیں چاہتا ہوں یہ رسالہ اُردو، زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالامال ہو کر شائقینِ ادب اسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اُٹھائیں اور اہلِ ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اس کے پرچے ڈھونڈتے پھریں۔"

اُن کی یہ تمنّا پوری ہوئی۔ اُن کی چشمِ تحقیق نے نایاب گنجہائے گرانمایہ پردۂ خفا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جس سے بلاشُبہ اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں کئی صدی کا اضافہ ہوگیا۔ مولوی صاحب نے اُردو زبان کی نشوونما، رسم الخط، زبان و ادب پر خود بھی عالمانہ مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔ اُنیسویں صدی میں سرسیّد کے تہذیب الاخلاق نے اُردو نثر کے اسلوب میں انقلاب پیدا کیا تھا۔ بیسویں صدی میں یہ کام "اُردو" نے انجام دیا اور بعض خصوصیات کی بنا پر اس سے بڑھ گیا۔ تحقیقی و تنقیدی ذوق و شعور پیدا کرنے کا

سہرا اسی رسالے کے سر ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے ایک علاحدہ مقالہ درکار ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا کہ رسالۂ اُردو ہی میں مولوی صاحب کے بیشتر مضامین شائع ہوئے جن میں سے بیشتر کتابی صورت میں منتقل کر دیے گئے "مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر" مرحوم دلی کالج"، سرسید احمد خاں حالات و افکار" اسی ذیل میں آتے ہیں۔" مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر" رسالہ اُردو، میں مولوی صاحب کا پہلا مضمون ہے۔ یہ اپریل ۱۹۲۱ء کے شمارے میں ص۱ پر شائع ہوا تھا، اور بعد میں ۱۲۳ صفحات پر کتابی صورت میں ۱۹۳۳ء میں شائع کیا گیا۔ اس مضمون میں مولوی صاحب نے مرہٹی زبان پر فارسی کے اثرات تاریخی، سیاسی اور سماجی منظر میں دکھلائے ہیں۔" مرحوم دِلی کالج" جنوری، اپریل، جولائی، اور اکتوبر ۱۹۳۳ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں علاحدہ چھاپا گیا، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۷۸ صفحات پر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا، جو ہمارے سامنے ہے۔ اس میں ۱۹۲۵ء سے ۱۸۷۷ء تک کالج کی تاریخ، تعلیمی نصاب، ذریعۂ تعلیم (اُردو)، اور کالج کے اساتذہ نے جو مختلف علوم و فنون کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کی تھیں اُن کا ذکر کیا گیا ہے اور نتیجہ نکالا ہے کہ اُردو میں اعلیٰ تعلیم کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔" سرسید احمد خاں حالات و افکار" مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ اُردو میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ کتابی صورت میں انجمن ترقی اُردو کراچی نے اکتوبر ۱۹۵۹ء میں اس کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے مولوی صاحب نے سرسیّد کے زندگی کے حالات، اُدبی تخلیقات، قومی خدمات اور ان کے اثرات عمدہ پیرائے میں بیان کئے ہیں، اور ان کی ذات کو ہر قسم کی اُدبی و قومی تحریکات کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ:

"قصرِ پاکستان کی بُنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی میر مرد نے رکھی تھی"

اِس مجموعۂ مضامین میں پہلا مضمون" سرسیّد احمد خاں" ستانوے (۹۷) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ مضمون کتاب کی جان ہے لیکن یہ طویل مضمون" چند ہم عصر" میں بھی شامل ہے زیرِ بحث کتاب میں اس کی دوبارہ شمولیت سوائے اس کے کچھ اور سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کا تعلق سرسیّد سے ہے۔" ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سرسیّد کام کرتے ہیں"،" مصلحِ اعظم سرسیّد احمد خاں"۔ اور" سرسیّد بحیثیت مفکرِ اعظم" نامی مضامین میں بہت کم فرق ہے، یہ تینوں مضامین پہلے مضمون کے ضمیمے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض جگہ تو صفحات کے

صفحات وہی نقل کر دیے گئے ہیں مثلاً ص۹۶ پر "اس برّعظیم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد ۔ ۔ ۔ ۔ دُنیا سے چل بسا" والا ٹکڑا جو تقریباً ۱۲ سطور پر مشتمل ہے ہو بہو ص۱۸۷ اور ص۱۸۸ پر نقل کر دیا گیا ہے۔ یہی کیفیت ص۱۵۹ اور ص۱۸۶ کے مضامین و عبارت کی ہے معلوم ہوتا ہے یہ مجموعہ انتہائی عجلت کی حالت میں ترتیب دیا گیا ہے جو مولوی صاحب اور انجمن کی روایت کے خلاف ہے۔ کتاب کے نام کو دیکھتے ہوئے قاری جس اُمید سے اس کا مطالعہ کرنا شروع کرتا ہے وُہ آخر میں پوری نہیں ہوتی۔

"چند ہم عصر" مولوی صاحب کی ایک اہم اور دلکش تصنیف ہے، اس کتاب کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۸ء، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۶ء کے مجموعے مولوی صاحب کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ حال ہی میں ۱۹۵۹ء میں اُردو اکیڈیمی سندھ نے نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اِس مجموعے سے منشی اُمیر احمد مینائی پر جو مضمون تھا خارج کر دیا گیا ہے، اور "خالدہ ادیب خانم" پر مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مولوی صاحب کی شخصیت سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ اس میں اس کا سوانحی پہلو نہایت اہم ہے جو عموماً اَب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مولوی صاحب کے اسلوب نگارش کے بہترین نمونے اس کتاب میں نظر آتے ہیں۔ انسان کی عظمت اور بڑائی کا ایک منطقیانہ اور اچھوتا معیار اس کتاب میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ "نام دیو مالی" اور "نور خاں" کا اِس ضمن میں نام لیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مضامین کتاب کی روح ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر لکھنے والے کی شخصیت اور اس کی عظمت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی یہ "شخصی خاکہ نگاری کے اعلیٰ نمونے ہمیں "چند ہم عصر" میں نظر آتے ہیں۔ اس ٹکر کی کوئی دوسری کتاب، اُردو نثر میں، اِس موضوع پر نظر نہیں آتی۔ "گنجہائے گرانمایہ" اپنی نوعیت کے لحاظ سے اَلبتہ ایک اچھی کتاب ہے لیکن شخصیت کا جو خاکہ "چند ہم عصر" میں ہے "گنجہائے گرانمایہ" میں نہیں۔ اِس میں ایک طرح کا تاثر ضرور ہے اور دلفریب اَندازِ بیان نے اس کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے لیکن اس رنگین بیانی نے "شخصیت" پر ایک ریشمی پردا ڈال رکھا ہے۔[1]

---

[1] "چند ہم عصر اور عبدالحق" ص ۹۳، التجاع عبدالحق نمبر ۱۹۵۹ء

قدیم اُردو پر مولوی صاحب نے زبردست کام کیا ہے۔ "اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصّہ"، "نصرتی۔ملک الشعرا ربیجاپور" اور اُردو شاعری کے قدیم تذکرے جو مولوی صاحب نے ترتیب دئے، تحقیقی اَدب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے اکرام کا حصّہ ۸۴ صفحات کی چھوٹی سی کتاب ہے۔ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۳ء کے دو نسخے ہمارے سامنے ہیں۔ یہ ایک عمدہ تحقیقی مقالہ ہے جس میں زبان اُردو کی ارتقائی کڑیاں نہایت خوش اُسلوبی سے پیش کی گئی ہیں۔ "نصرتی" پر مولوی صاحب کی کتاب غالباً ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ۲۲۷ صفحات ہیں۔ اِس کتاب میں نصرتی کی تصانیف گلشن عشق، تاریخ اِسکندری، علی نامہ، قصاید، غزلیات و رُباعیات پر محققانہ و ناقدانہ بحث کی گئی ہے۔ نصرتی کے فن شاعری کو مولوی صاحب نے اِس طرح اُجاگر کیا ہے کہ قاری کے دل و دماغ پر نصرتی کے باکمال شاعر ہونے کا نقش مُرتسم ہو جاتا ہے۔ اُن کی بحث جذباتی نہیں، فنی ہے۔ مولوی صاحب کی رائے میں "بحیثیت شاعر، نصرتی کا درجہ ولی سے کہیں بلند ہے۔" اس تصنیف کو قدیم تحقیقی اَدب پر مولوی صاحب کا کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔

مولوی صاحب کی جولانیٔ فکر اور اشہبِ تحقیق کی تیزی ان "مقدمات" میں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، جو قدیم تذکروں، دواوین، نثری کتابوں پر مولوی صاحب نے رقم کئے ہیں۔ یہ مقدّمات دو جلدوں میں مولوی مرزا محمد بیگ صاحب نے ۱۹۳۱ء میں مرتب کئے تھے۔ پہلا حصّہ ۱۴ مقدّمات اور دوسرا حصّہ ۱۲ مقدّمات پر مشتمل ہے۔ یہ "مقدّماتِ عبدالحق" آج سے تقریباً ۱۸ سال قبل شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد مندرجۂ ذیل کتب پر مولوی صاحب نے مقدمات لکھے:

۱۔ انتخاب داغ ۲۔ قطب مشتری ۳۔ نکات الشعراء ۴۔ سب رس ۵۔ عقد ثریا۔ ۶۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ ۷۔ تذکرہ ریختہ گویاں ۸۔ اُردو تنقید کا ارتقاء ۹۔ خطباتِ گارساں دتاسی ۱۰۔ مضامین میر محفوظ علی ۱۱۔ ناقابل فراموش ۱۲۔ پُراسرار کائنات ۱۳۔ گلشن عشق ۱۴۔ آرٹ ان اُردو پوئٹری۔ ۱۵۔ چین و عرب کے تعلّقات ۱۶۔ اصطلاحاتِ بنکاری ۱۷۔ فرہنگِ اصطلاحات کیمیا ۱۸۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب۔ ان کے علاوہ بھی کچھ مقدّمات ہوں گے جو میری نظر سے نہیں گزرے۔ اِن کی مجموعی تعداد ۴۴ ہوتی ہے۔ جن کتابوں پر مقدّمات لکھے گئے ہیں وہ مختلف نوعیت کے ہیں۔ ان میں مذہب و سائنس

تاریخ وسیرت، قدیم شعرا کے تذکرے، کلیات ودَواوین، تنقید وتحقیق سب ہی کچھ شامل ہے۔ کلیاتِ قلی قطب شاہ، سب رس وقطب مشتری (وجہی)، انتخاب کلام میر و ذکرِ میر، مخزنِ نکات (قائم)، قواعد اُردو (عبدالحق)، اور باغ وبہار (میر امّن)، پر مولوی صاحب نے عالمانہ انداز میں مقدمات تحریر کئے ہیں۔

"تحقیقی نکات، تنقیدی نقطۂ نظر اور اُسلوبِ بیان کے لحاظ سے یہ مُقدّمات، مولوی صاحب کا تخلیقی کارنامہ بن گئے ہیں۔ مُقدّمہ نگاری کو مولوی صاحب نے ایک فن بنا دیا ہے۔ ایسا فن جو ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں۔ وُہ زیر بحث موضوع کو مُصنّف کے تہذیبی، علمی اور ثقافتی پسِ منظر میں جانچتے ہیں۔ اس سے اُن کے مقدمات میں ہمہ گیری اور افادیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

بادیُ النظر میں بعض مقدمات خاصے طویل معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ طوالت "موضوع" کے تقاضے کی وجہ سے ہے۔ چند مختصر مقدّمات بھی نظر آتے ہیں، لیکن علمی وادبی حیثیت سے وُہ بھی کم مایہ نہیں مثال کے طور پر "سیپارۂ دِل" اور "مسدّسِ حالی" پر لکھے ہوئے مُقدّمے طویل مقدمات پر بھاری ہیں۔ کہیں کہیں بے جا طوالت بھی نظر آتی ہے اور پھر بھی نفسِ تصنیف تشنہ رہ جاتا ہے ــــ "معرکۂ مذہب وسائنس" (مترجمہ مولوی ظفر علی خاں)، پر لکھے ہوئے مقدمہ میں اس کمی کا زبردست احساس ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر مُقدّماتِ عبدالحق اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں یہ برسوں کے ادبی ریاض کا نتیجہ ہیں۔ ان سے مولوی صاحب کی نظرِ دور رس، نکتہ شناسی، ادبی گہرائی وگیرائی کا پتہ چلتا ہے۔

مولوی صاحب کی تنقیدوں کے دو مجموعے ہیں۔ ایک مجموعہ "تنقیداتِ عبدالحق" کے نام سے ۱۹۳۴ء میں تراب علی خاں نے مُرتب کیا اور شمس الاسلام پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔ اس میں ۱۷۹ صفحات ہیں اور مندرجہ ذیل کتابوں پر مولوی صاحب کی تنقیدیں شامل ہیں:

۱۔ دیوان ولی مرتبہ حیدر ابراہیم سایانی ۲۔ مکاتیبِ نواب محسن الملک مرحوم و

نواب وقار الملک مرتبہ امین زبیری ۳۔ سرگذشتِ الفاظ مولفہ احمد دین صاحب۔ ۴۔ شرح دیوان غالب، مولوی عبدالباری آسی ۵۔ تذکرہ اعجاز سخن مرتبہ شیر علی خاں سرخوش ۶۔ تلخیص عروض و قافیہ مرتبہ سید علی حیدر طباطبائی عنہ بانِ اُردو پر سرسری نظر، رشید احمد صدیقی کے لکچرز کا مجموعہ ۸۔ خطوط سرسید مرتبہ نواب مسعود جنگ ۹۔ بانگِ درا، اقبال ۱۰۔ مکاتیب امیر مینائی۔ مرتبہ مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب ۱۱۔ شعر الہند مولفہ عبدالسلام ندوی ۱۲۔ روح تنقید، محی الدین قادری زور ۱۳۔ اصلاح سخن مرتبہ محمد عبدالعلی صاحب ۱۴۔ اُردو شہ پارے۔ جلد اول ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۱۵۔ گنجینۂ تحقیق از سید محمد احمد صاحب بے تھود موہانی ۱۶۔ اربابِ نثر اردو مولفہ سید محمد صاحب بی اے۔ ۱۷۔ اکبر الہ آبادی از طالب الہ آبادی ۱۸۔ پنجاب میں اُردو، پروفیسر حافظ محمود شیرانی ۱۹۔ فیضانِ شوق، مرتبہ خان بہادر شیخ رضی الدین احمد ۲۰۔ اُردو لٹریچر۔ ڈاکٹر گراہم بیلی ۲۱۔ نور اللغات مرتبہ مولوی نور الحسن۔ ۲۲۔ جامع اللغات اردو مرتبہ خواجہ عبدالمجید صاحب ۲۳۔ مجموعہ نغز مولف میر قدرت اللہ قاسم، مرتبہ حافظ محمود شیرانی۔ یہ کل ۲۳ تنقیدیں ہیں۔ جو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۳ء تک کی تنقیدات کا انتخاب ہے۔ دوسرا مجموعہ ۱۹۳۹ء میں "چند تنقیدات عبدالحق" کے نام سے شائع ہوا اس میں وہی دس تنقیدیں شامل ہیں۔ جن کا ذکر مندرجہ ذیل فہرست میں نمبر ۳، ۷، ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۱ اور ۲۳ کے تحت آچکا ہے۔ "تنقیداتِ عبدالحق کا مجموعہ اُن ناقدانہ تبصروں کا انتخاب ہے جو مولوی صاحب نے وقتاً فوقتاً رسالہ اردو میں بعض کتابوں پر کیے تھے۔

> مولوی صاحب نے تبصرہ نگاری میں بھی علاحدہ راہ نکالی ہے، وہ کتاب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی آرا رچی تلی، بے باک، مدلل اور فکر انگیز ہوتی ہیں۔ اُن کی تنقید میں محققانہ شان جلوہ گر ہے۔ ان سے مولوی صاحب کی تنقیدی نظر، اور ادب شناسی کا پتا چلتا ہے ان کی نظر گہری اور رائے صائب ہوتی ہے اختصار و جامعیت مولوی صاحب کی تنقید کا اہم وصف ہے۔

اِس مجموعے سے قطع نظر "مقدّمات" کا تنقیدی پہلو نہایت اہم ہے۔ ان کے مطالعہ سے مولوی صاحب کی ہیرو پرستی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایسے مقام پر اُن کی تنقید تاثراتی رنگ اختیار کر لیتی ہے، جس سے اس میں تخلیق کی شان پیدا ہو جاتی ہے، لیکن یہ اُن کی تنقیدات کا عام رنگ نہیں بالعموم ان کے ہاں علمی تنقید کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں جو محقّق یا ناقد "ماخذ" کو ہضم کر جاتا ہے مولوی صاحب اس کو سخت تنقیدی جلاب دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گراہم بیلی اور ڈاکٹر زور سے انھیں یہی شکایت ہے "اردو لٹریچر" پر مولوی صاحب لکھتے ہیں: "اسے (ڈاکٹر گراہم کی کتاب اُردو لٹریچر کو) تحقیق تو نہیں البتہ الہام کہہ سکتے ہیں" (ص ۱۵۷ تنقیدات عبدالحق)، لیکن اس کتاب کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس کے ماخذات بالکل دوسرے ہیں، یا کم از کم ڈاکٹر گراہم نے ایسا ہی ظاہر کیا ہے؛ ہو سکتا ہے اُس کے پیش نظر مولوی صاحب کی تحقیقات رہی ہوں لیکن ان کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ اُس کی اس حرکت پر مولوی صاحب بہت برہم ہیں۔ اُنھوں نے اس کتاب پر کڑی تنقید کی اور کئی تحقیقی خامیاں نکالیں جو نہایت وثوق اور قطعیت سے مولوی صاحب نے ظاہر کی ہیں ان میں دم مارنے کی گنجائش نہیں لیکن مولوی صاحب جب اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ "ڈاکٹر بیلی کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اور مشہور ہے کہ:

"نقل میں عقل کو بہت کم دخل ہوتا ہے"

تو اُن کا یہ ریمارک شخصی ہو جاتا ہے۔ اُن کے لہجے کی درشتگی اس میں مزید تیزابیت پیدا کر دیتی ہے۔ غلطی کرنا انسان کی سرشت میں داخل ہے اس میں نقل اور عقل کا سوال نہیں۔ خود مولوی صاحب نے رسالہ "اردو" جولائی ۱۹۳۵ء کے ص ۵۵۸ پر مجلس مذاکرۂ علمیہ، کلکتہ[1] میں سرسیّد کے لکچر کی تاریخ ۷، اکتوبر ۱۸۸۳ء تحریر کی ہے۔ اس تاریخ کا ماخذ حالی کی "حیات جاوید" ہے۔ لیکن حیات جاوید میں شاید کتابت کی غلطی سے سنہ غلط چھپ گیا ہے جہاں سے رسالہ اُردو، میں مستند جان کر نقل کر دیا گیا ہے اس نقل کو دیکھ کر کیا خیال پیدا ہونا چاہیئے اور اس کا اظہار کن الفاظ اور کس لہجے میں کرنا چاہیئے؛ محی الدین

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "انیسویں صدی کے اہم اُردو ادارے" مشمولہ: ادب لطیف، اُردو نمبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۷

قادری زور کی "روحِ تنقید" اور "اُردو شہ پارے" پر بھی مولوی صاحب کی تنقید میں ذاتیات کا رنگ جھلکتا ہے اور شخصی چھینٹے نظر آتے ہیں۔

"بانگِ درا" پر مولوی صاحب کی تنقید پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے،

جس طرح انھوں نے اقبال کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے اور اس سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ منفرد نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ مولوی صاحب ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور اُردو زبان کو اس اتحاد کی نشانی اور ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اقبال کی نظم "نیا شوالہ" کی بہت تعریف کی ہے۔

اقبال کے ہاں بعد میں جو نظریاتی انقلاب پیدا ہوا اور "حُبِّ ملت" کے تحت جو افکار و خیالات اس نے پیش کئے وہ اس مصلحت کے پیشِ نظر مولوی صاحب کو پسند نہیں تھے جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا:

"لیکن وہ ایک لحظہ کے لیے ذرا مُڑ کر دیکھیں تو ہم انھیں اُن کا "نیا شوالہ" دکھانا چاہتے ہیں، جس کی قسمت میں تعمیر سے پہلے کھنڈر ہونا لکھا تھا۔ گو اقبال اس وقت ایک دوسری شان دار تعمیر میں مصروف ہیں، لیکن ایک روز اُنھیں ادھر آنا پڑے گا اور وہ ان کی شاعری کا تیسرا دَور ہوگا۔

لیکن مولوی صاحب کی یہ پیش گوئی خواہ کتنی پُرخلوص نیت پر مبنی ہو دُرست ثابت نہ ہو سکی ___

بعض اوقات مولوی صاحب تنقید میں اشارے سے کام لیتے ہیں، اور وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتے مثلاً احمد دین صاحب نے "سرگذشتِ الفاظ" میں صلوات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "قوم کی سبک سری، خفتِ عقل، اور ضعفِ ایمان کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس قابلِ تحریم و مقدس لفظ کو جمع کی صورت میں (اُردو میں) ایک ذلیل حرکتِ انسانی کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ کہاں صلواۃ اور

کہاں صلواتیں" مولوی صاحب نے ان پر تنقید کرتے ہوئے لکھا: "یہ صحیح ہے لیکن اگر وہ صلواۃ کے لغوی معنوں کی تحقیق کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ لفظ کس طرح ادنیٰ سے اعلیٰ ہو گیا اور پھر اردو میں جمع کی صورت میں کن ذلیل معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ یہی تو زمانے کے اتار چڑھاؤ ہیں" اس جگہ اگر چند سطور میں صلوٰۃ کی تحقیقی وضاحت کر دی جاتی تو پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوتیں۔

یہ لفظ عربی زبان کا نہیں۔ بعض مستند محققین نے اس کا ماخذ عبرانی لفظ "صلوتا" قرار دیا ہے[۱]۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے "شرح نصاب" کے حوالے سے صلوٰۃ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ "لفظ "صلا" بمعنی سرین سے ماخوذ ہے چونکہ نماز پڑھنے والا سجدہ میں سرین اونچی کرتا ہے اس وجہ سے اس فعل کا نام صلوٰۃ رکھا اور بعضوں نے اس کے لغوی معنی تحریک الصلوین یعنی دونوں سرینوں کا ہلانا لکھا ہے، اور نماز کے معنی اسی سے نکالے گئے ہیں" (فرہنگ آصفیہ جلد سوم ص۲۲۵) جان رچرڈسن نے فارسی، عربی، انگریزی لغت میں اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

صلا Sala (from صلو), growing hot, having loose haunches (a horse). The lower part of the haunch bone. The middle of the back of a man or quadruped. ۹۳۹.

صلو Salw, The thigh ص۹۴۱

اس طرح "صلوٰۃ" کے ادنیٰ لغوی معنی کو مذہب کا تقدس و احترام پیدا کر کے اعلیٰ بنا دیا اور بعد میں یہ پھر ادنیٰ ہو گیا اردو میں برا بھلا سننا یا کہنا کے مفہوم میں بولا جانے لگا۔

مجموعی حیثیت سے مولوی صاحب کی تنقیدیں علم افروز مدلل اور غیر جانب دار ہوتی ہیں وہ ادب کو زندگی کی طرح مسلسل سمجھتے ہیں اس لیے ان کے تنقیدی نقطہ نظر

---

۱؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: Lane's-Arabic-English Lexicon P,P 1720, 1721 Book I Vol. II.

میں ایک وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور وُہ تصنیف کو
اسی معیار پر جانچتے ہیں کہ مُصنّف نے زندگی کو سمجھنے
اور پیش کرنے میں کس حد تک کوشش کی ہے اور اس
کے سنوارنے میں اُس کا کیا حصّہ رہا ہے۔ وُہ اَدب کی
صحت مند روایات اور قدیم اَدب سے رشتہ توڑنا
نہیں چاہتے۔ "ماضی" سے تعلّق قائم رکھنا نہایت
ضروری ہے۔

اَنجمن ترقّی پسند مُصنّفین کے پہلے اِجلاس کے لیے مولانا نے جو خطبہ لکھا تھا اُس میں اُنھوں نے نوجوانوں کو یہی نصیحت کی تھی۔ وُہ کسی اَدبی تخلیق پر تنقید کرتے ہوئے اُس کے مقصد کو تلاش کرتے ہیں کیونکہ مقصد کی عدم موجودگی سے اَدب ہو یا زندگی دونوں میں جمود پیدا ہو جاتا ہے اور تازگی، توانائی اور جدّت مفقود ہو جاتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں کاہلی کا روگ بڑھتا رہتا ہے، اور کاہلی کے ساتھ عیاشی کی منحوس لت پڑ جاتی ہے۔ اَدب میں یہ چیز سستی جذباتیت کو فروغ دیتی ہے۔ اسی کی بدولت فحش نگاری پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ایسا اَدب اور وُہ ادیب جس کے پیش نظر کوئی مقصد نہیں ہوتا مولوی صاحب کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

اَدب عیاشی نہیں ایک مُقدّس فریضہ ہے۔ مولوی صاحب
نے اَدب کے اِس پہلو کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا،
اُن کی تنقیدوں میں اَدبی انکشافات نے جدّت،
شگفتہ نگاری نے تازگی، مقصدیت نے توانائی اور
اَدبی جرأت نے بے باکی پیدا کر دی ہے، اُن کی تنقیدیں
اَدب آموز اور فکر انگیز ہوتی ہیں۔ ذیل میں چند
اقتباسات "تنقیداتِ عبدالحق" سے پیش کئے جاتے ہیں:

"صدیقی صاحب مُردوں سے بہت بے باک ہیں لیکن زندوں سے ڈرتے ہیں۔
اُنھوں نے ہر زندہ انشا پرداز کی جو ذرا بھی شہرت رکھتا ہے یا مقبول ہے خوب

تعریف کی ہے اور اگر کہیں کسی کے متعلق ہلکا سا اَدبی زبان سے کوئی جملہ کہہ بھی دیا ہے تو جھٹ اُس کی پیٹھ بھی تھپک دی ہے۔ اُن کے طرزِ بیان میں ایک بانکپن پایا جاتا ہے جس میں شوخی کی جھلک ضرور ہوتی ہے لیکن بعض اَوقات لفاظی کے اُلجھاؤ سے الجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ صدیقی صاحب اُردو کے اُن انشا پردازوں میں سے ہیں جن سے بڑی بڑی اُمیدیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ طبیعت کی اُفتاد اُنھیں کدھرے جاتی ہے۔ جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے اُس میں بگڑنے کے لچھن بھی ہوتے ہیں۔"

(زبان اُردو پر سرسری نظر، رشید احمد صدیقی کے لکچرز کا مجموعہ)

"اس کا طرز شستہ اور ظریفانہ ہے لیکن اُس کے شعر ہمیشہ بے عیب نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ وُہ لفظوں کے اُلٹ پھیر اور قافیہ بندی سے بہت کچھ اثر پیدا کرنا چاہتا ہے، اکثر شعر محض قافیہ کی خاطر کہے ہیں، وُہ شعر شعر نہیں لطیفے ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ مذہب پر اکبر کا بہت بڑا اعتقاد تھا وُہ ایک با خُدا اور صوفی منش آدمی تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ بہت بزدل اور ڈرپوک بھی تھے۔ اس اعتقاد پر یہ بزدلی بہت حیرت انگیز ہے۔ زمانہ انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اکبر جو مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے سخت دشمن تھے اپنی اولاد کو اس سے نہ بچا سکے، اور خود اُنھوں نے ان کو وہی تعلیم دلائی جس کی وُہ عمر بھر مخالفت کرتے رہے۔"

(ص۱۲۴ ص۱۲۵ اکبر الہ آبادی مولفہ طالب الہ آبادی)

"جس طرح اُن کی طبیعت میں تصنع اور تکلف کو دخل نہ تھا۔ اسی طرح اُن کی عبارت بھی ہنر نما عیب سے خالی نہیں وُہ بلا تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں اور لکھتے وقت جو خیال جس طرح اَدا ہو گیا اُسی طرح اَدا کر دیتے ہیں۔ لیکن اِس بے تکلفی اور بیساختہ پن میں بعض وقت عجیب فقرے اُن کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔"

(ص۵۳ خطوط سرسید مرتبہ سر راس مسعود مرحوم)

"۔۔۔ اقبال کی شاعری کی پوری حقیقت معلوم کرنے کے لیے "شمع اور شاعر" "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" کی نظمیں غور سے پڑھنی چاہئیں۔ بظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے اُن کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔۔۔۔ تخیل کی بلندی، تشبیہات

واستعارات لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے وُہ گویا مرزا کے معنوی شاگرد ہیں اور پڑھنے والا جسے ذوقِ سخن ہے بآسانی اسے سمجھ سکتا ہے لیکن بندش میں وُہ چستی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مرزا کے طرزِ ادا میں جو خاص نزاکت ہے وُہ نہیں پائی جاتی ہے اور نہ وہ سوز و گداز اور دَرد ہے جو ہم حالیؔ کے کلام میں پاتے ہیں اگرچہ کہیں کہیں تکلّف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں، مگر شان و شکوہ، زور اور شور اُمنڈتے ہیں جذبات کی اَدائی حکیمانہ نظر اور شاعرانہ اندازِ بیان میں اقبال کے کلام کا جواب نہیں۔"

(صفحہ ۷، بانگِ درا)

○

مولوی صاحب کے خُطباتِ کے تین مجموعے اُب تک شائع ہوئے ہیں خُطبات کا پہلا حِصّہ ۱۹۳۹ (۱۷۲ صفحات) اور دوسرا حِصّہ ۱۹۴۴ (۱۹۰ صفحات) میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مولوی صاحب کے خطبات اضافے کے ساتھ مرتب کیے۔ یہ مجموعہ ۵۵۳ صفحات پر مشتمل ہے[۱] اس میں انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد منعقدہ اپریل ۱۹۴۵ء کے اجلاس انجمن ترقی اردو کانفرنس، بنگلور منعقدہ ۴ جون ۱۹۴۷ء کے خُطبات اور کانفرنس سلہٹ (بنگال) منعقدہ ۱۳ مارچ ۱۹۴۹ء کی افتتاحی تقریر شامل نہیں ہے۔

"خُطباتِ عبدالحق" (مرتبہ ڈاکٹر عبادت ۱۹۵۲ء اڈیشن) کے پیش لفظ میں فاضل مُرتّب نے اختصار و جامعیت سے خُطبات کی تاریخی ادبی اور تہذیبی اہمیت کی وضاحت کی ہے۔ اس جگہ ذرا تفصیل سے خطبات کا جائزہ لیا جائے گا اور

---

[۱] ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے مُرتبہ خطبات کا دوسرا اڈیشن ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس اشاعت میں چار خطبوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب مجموعے کی ضخامت ۶۳۶ صفحات ہوگئی ہے (معین الرحمٰن)

وہ بات پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی جو متذکرہ پیش لفظ میں نہیں ہے اور اگر ہے، تو وضاحت طلب ہے۔

اصل چیز خُطبات کا پس منظر ہے باقی باتیں ذیلی ہیں مثلاً مولوی صاحب کا اندازِ نگارش، ان کا وسیع مطالعہ اور محققانہ تنقید نظری، زندگی کا ایک خاص رُوادارانہ نظریہ، ادب شناسی و سخن فہمی، ایسی خصوصیات ہیں جو اُن کی دیگر تصانیف مثلاً مقدمات و تنقیدات وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔

خُطبات کے پیش لفظ میں ڈاکٹر عبادت نے لکھا ہے" ان میں ایک عظیم شخصیت بے نقاب نظر آتی ہے۔" دیکھنا یہ ہے کہ اس شخصیت کا اہم تعمیر عنصر کیا ہے؟

> مولوی صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور اُن کی نجی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُن کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے بڑا عنصر اُردو زبان و ادب سے اُن کی والہانہ وابستگی ہے۔

اُنھوں نے اس وفاداری کو بڑی استواری سے نبھایا ہے۔ اس حد تک کہ "جذبۂ ترقی اُردو" اُن کا وظیفۂ حیات بن گیا ہے۔ یہ ایک ٹھوس عقیدے کے مانند اُن کے قلب و ذہن میں جگہ پا گیا ہے۔

> درحقیقت مولوی صاحب نے اپنی اَن تھک کوششوں سے اُردو زبان کو حیاتِ نو عطا کی ہے۔ اُنھوں نے "اُردو زبان" کو "اُردو دین" بنا کر اس کی تقلید و تبلیغ کی ہے۔ اس زمرہ میں ہر قوم ہر فرقے، ہر مذہب اور ہر ملک کے باشندے ہیں۔

مولوی صاحب کی تمام جد و جہد کا مرکزِ کشش ایک ہی ہے۔ اُردو کی بقا و نشو و نما یہ اُردو کی خدمت ہی کا جذبہ تھا، جو اُنھیں کشمیر سے راس کماری

تک سٹے گیا۔ یہ اُردو کی بقاد ترقی کا خیال ہی تھا کہ اُنھوں نے ہر اُس کانفرنس میں شرکت کی جو اُردو زبان کے فروغ کی خاطر منعقد کی گئی۔ اِن کانفرنسوں کا پسِ منظر" خطباتِ عبدالحق" کا پسِ منظر ہے۔ اِس کی بنیاد اُردو ہندی جھگڑا ہے۔

ہندی اُردو جھگڑے کا آغاز سرزمین بنارس سے ۱۸۶۷ء سے ہوا (حیاتِ جاوید صہ ۱۳۹) سر سید نے اِس جھگڑے کو دبانے کی انتہائی کوشش کی لیکن مختلف صورتوں سے منظرِ عام پہ آتا رہا۔ گاندھی جی کے نعرے" ہندی ہندوستان" نے اس کو خوب ہَوا دی۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء کے رسالہ اُردو میں اِس جھگڑے کی مُفصل داستان نظر آتی ہے۔ مَولوی صاحب نے خطرہ اور اس کا انجام سونگھ لیا تھا۔ وُہ اُردو کی حفاظت کے لیے قلم بہ دست اِس لسانی معرکہ میں اُتر آئے اِس مقصد کے حصول کے لیے علی گڑھ میں کل ہند اُردو، کانفرنس منعقد کی گئی (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۳۶ء، صفحہ ۶۸۶) اس کانفرنس نے متعدد تجاویز منظور کیں۔ فروغِ اُردو کے لیے انجمن کے شاخوں کا ہر صوبے اور ریاست میں قائم کرنے اور ان کے تحت اردو، شبینہ مدارس، اور کتب خانہ کھولنا خاص تجویز تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہندوستان میں ترقیٔ اُردو تحریک، آگ کی طرح پھیل گئی اِس کا فوری ردِ عمل یہ ہوا کہ جموں (جے پور)، بالاپور (برار)، پشاور، بدایوں، ناگپور، جموں، اجمیر، جون، احمد آباد، جل گانو بھوساول، مدارس وغیرہ میں انجمن کی ۱۸۰ شاخیں اور ۶۲ مدراس قائم ہو چکے تھے اُردو کی ترقی کے لیے الہ آباد، بہار، علی گڑھ، سندھ (کراچی)، ناگپور، لاہور، گوالیار، لائل پور، بنگال، کالی کٹ، بمبئی، احمد آباد وغیرہ میں اُردو کانفرنسیں مُنعقد ہوئیں۔ جن میں مَولوی صاحب نے شرکت کی۔ یہی خطبات کا پسِ منظر ہے خطبات

---

۱؎ ملاحظہ ہو خطبۂ صدارت کل ہند اُردو کانفرنس ناگپور، صفحہ ۱۳۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو:
" انجمن کے سکرٹری کی حیثیت سے یہاں تو میں بار بار آیا لیکن ہندوستان کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی دوسرے گئے۔ بنگال، بہار، یو پی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی، جنوبی ہند، مدراس، آندھرا، ارکاٹ، ملیبار، تامل، ناڈ، ٹراونکور تک گیا اور راس کماری تک جا کر دم لیا۔ لوگ مبالغہ سے کشمیر تا راس کماری کا فقرہ کہا کرتے ہیں۔ لیکن میں نے حقیقت میں کشمیر سے راس کماری تک کی خاک چھانی اور آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ مجھے راس کماری میں بھی اُردو بولنے والے ملے۔"

عبدالحق میں جو یکسانیت نظر آتی ہے اس کا سبب یہی مقصدیت ہے جس کی وضاحت مندرجۂ بالا سطور میں کی گئی ہے۔ اِن خُطبات کی حیثیت تبلیغی ہے لیکن یہ تبلیغ بروقت اور پُر مقصد ہے اِس میں اُکتا دینے والی کیفیت یا سپاٹ پن نہیں ہے۔

مولوی صاحب فن "خطابت" کے ہر گُر سے واقف ہیں وُہ عوام کی نفسیات، اُن کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتے ہیں، اِس لیے اپنے خطبات کو طرح طرح کے لطیفوں اور تجربوں کے بیان سے پُر لطف بنا دیتے ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان میں اپنائیت، خلوص اور صلح کُل کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

خطبہ میں مولوی صاحب متعلقہ صوبے کی تاریخ اور اُردو کی نشوونما میں اس کی کوششوں کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ اِس سے خُطبات کی ادبی و تاریخی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے اِس خیال کی صداقت کا اندازہ شمالی بنگال اُردو کانفرنس (دیناج پور) مُنعقدہ ۷ر مارچ ۱۹۴۳ء اردو کانفرنس کالی کٹ (ملیبار) منعقدہ ۷ر نومبر ۱۹۴۳ء اور اُردو کانفرنس بمبئی ۱۹۴۵ء کے خُطباتِ صدارت کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ یہ خطبات تاریخی، ادبی، اور تہذیبی حیثیت سے نہایت دلچسپ اور علم افزا خُطبات ہیں۔ اُردو کانفرنس علی گڑھ منعقدہ ۲۸ر اپریل ۱۹۳۷ء کا خطبہ ایک طرح سے اُردو کی سیاسی یادداشت ہے۔ انڈین اورینٹل کانفرنس (بڑودہ) منعقدہ دسمبر ۱۹۳۳ء، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد منعقدہ ۱۲ر جنوری ۱۹۳۶ء اور انجمن ترقی پسند مصنفین ہند (لکھنؤ) منعقدہ اپریل ۱۹۳۶ء کے خطباتِ صدارت مولوی صاحب کو ادبی نقطۂ نظر کے سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ وُہ ادب کی نمو کے واسطے مطالعۂ صحیح ذوق و شوق اور تحقیق و جستجو کو ضروری بتاتے ہیں۔ وُہ یورپ کے اُردو محققین کو 'گیسٹلاگی محقق' کہتے ہیں جو "سوائے کتاب کے کتاب کے متعلق ہر قسم کا علم رکھتے ہیں"۔ وُہ اُردو کے رومان پسند شعرا کو "ہوائی پرواز سے اس ناپاک زمین پر اُترنے کا" مشورہ دیتے ہیں کیونکہ "ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو وُہ ایک لچر سی کہانی ہے (ص ۳۹، خُطبات)

خطبات سے مولوی صاحب کی رواداری کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے۔ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ترویتی (۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء) کے خطبۂ صدارت میں مولوی صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا تھا "وہ دو قومیں جن کی یک جہتی اس درجہ کو پہنچ گئی ہو کہ وہ دنیا میں ایک نئی زبان پیدا کر سکتی ہوں وہ کیونکر جدا ہو سکتی ہیں"۔ لیکن سیاست مولوی صاحب کا میدان نہیں جس طرح اقبالؔ کی شاعری کے "تیسرے دور کے متعلق اُن کا قیاس نادرست نکلا، اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کا خیال بھی نقش بر آب ثابت ہوا۔ وہ دو قومیں جنھوں نے یک جہتی سے ایک نئی زبان پیدا کی تھی، جیسے اپنا یہ فرض ادا کر کے ۱۹۴۷ء میں جدا ہو گئیں، ایک نے "گنگا" کی راہ لی دوسری نے "کوثر" کی ایک نے مسجدیں مسمار کیں دوسری نے مندر ڈھائے اور نئی زبان کا یہ یتیم نگھرا لڑکا سیاست کے دوراہے پر حیران و پریشان کھڑا اک اک کا منہ تکتا رہ گیا۔"

مولوی صاحب نے اس کی اُنگلی پکڑی اور پاکستان کا رُخ کیا۔ اُن کی زندگی کا ایک اور اہم دور شروع ہوا۔

> اِس کا اندازہ اُن خطبات سے ہو سکتا ہے جو پاکستان میں مختلف کانفرنسوں کے انعقاد پر پڑھے گئے، اِن خطبات میں سوز، تڑپ بے چارگی، التجا اور تنبیہہ نظر آتی ہے، اُردو کو اس کا صحیح مقام دلانے اس کو قومی و سرکاری منصب پر فائز کرنے اور اس کی ترقی و بقا کے لیے مولوی صاحب نے جو جدوجہد کی یہ خطبات اُس کے آئینہ دار ہیں۔

جون ۱۹۴۹ء میں "اُردو کالج" قائم کر کے انھوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ اُردو ذریعۂ تعلیم بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے لیکن ۱۹۵۸ء تک ان کے اس تجربہ کو حکومت نے قابلِ التفات نہیں سمجھا اور انگریزی کا جُوا بدستور طلبہ کی گردن پر پڑا رہا۔ رائٹرز کنونیشن منعقدہ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کراچی، مغربی پاکستان اُردو کانفرنس منعقدہ ۲۲ فروری ۱۹۵۹ء مرکزِ علم و ادب میرپور خاص کے کنونیشن منعقدہ ۱۹ دسمبر ۱۹۵۹ء کے خطبات اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اس بحث کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خطباتِ عبدالحق کو اُردو کی آپ بیتی اور بیسویں صدی میں اُردو کی آپ بیتی، عبدالحق کی آپ بیتی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

○

تصنیف اپنے مصنف کے خیالات و جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تصانیفِ عبدالحق کے جائزے سے ہم مولوی صاحب کی شخصیت کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور "اسلوب" کو بھی۔ شخصیت اور اسلوب ایک ہی شخص کے دو پہلو ہیں، دَر حقیقت شخصیت کا ادبی اظہار، اسلوب ہے۔ انسان جو سوچتا ہے پسند کرتا ہے، چاہتا ہے، اُس کا اظہار اس کی نگارشات یا فنی تخلیقات میں ہوتا رہتا ہے۔ مُصنّف یا فن کار کے مزاج میں تغیر اور اُس کے اَفکار میں انقلابات کا نشان بھی اس کی تخلیقات سے نمایاں ہوتا ہے تعمیرِ شخصیت میں فطری رُجحان اور صلاحیت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ماحول اور تربیت کا بڑا حِصّہ ہوتا ہے۔ یہ ابتدائی تاثرات انسان کے مزاج میں رس بس جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ اس کی طبیعت کا جزو بن جاتے ہیں یہ شخصیت کی تعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ عبدالحق نے جس ادارے میں تعلیم حاصل کی وُہ معمولی ادارہ نہیں تھا جس عظیم انسان نے اس ادارے کی بنا رکھی تھی، اُس نے اِس کی تعمیر میں خلوص اور قومی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ سر سیّد احمد خاں جیسا مصلحِ اعظم اور ہمہ گیر انسان ہندوستان تو ہندوستان دُنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ اُس کی جدوجہد اور ادبی فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع اور متنوع ہے اتنا ہی زیادہ وسیع جتنی خود اس دَور کی زندگی اور اس کے مسائل۔

> ہماری قومی تحریکات کے تمام دھارے اسی سوتے سے پھوٹے ہیں۔ عبدالحق نے اسی عظیم انسان کی آنکھیں دیکھیں تھیں۔ اُس کو اُٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے، اور دل سوزی سے کام کرتے دیکھا تھا۔ کس طرح ممکن تھا کہ عبدالحق پر اس عظیم شخص کے کردار کا اثر نہ پڑتا۔ نوجوان عبدالحق کے دِل میں کام کرنے کی لگن، پابندیٔ وقت کا خیال، نفاست پسندی کا رُجحان، اعلانِ حق میں بے باکی

اور جرأت کی خو، کو سر سید کی صحبت کا فیض سمجھنا چاہیے۔

سر سید کو اُردو زبان سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے آرزومند تھے، ورنیکلر یونیورسٹی اُن کا تعلیمی نصب العین تھا۔ عبدالحق نے بھی "خدمتِ اُردو" اپنا مسلک، اپنا مقصدِ حیات بنالیا۔ جس دل جوئی اور دل سوزی سے اُنھوں نے ترقی اُردو کے لیے جد وجہد کی اِس کا اندازہ ۱۹۱۲ء کی انجمن ترقی اُردو اور آج کی انجمن ترقی اُردو سے ہو سکتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جب مولوی صاحب کو انجمن کا سکریٹری نامزد کیا گیا تو انجمن کی کل کائنات "ایک پرانا صندوق، ایک رجسٹر، چند پراتے اور غیر مرتب مسودات ایک قلم دوات تھی، یہی انجمن جب ۱۹۳۸ء میں اورنگ آباد سے دہلی منتقل کی گئی تو صرف انجمن کی مطبوعات مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لادی گئیں، جن کی قیمت اندازہ کم و بیش ایک لاکھ روپیہ لگایا گیا تھا۔[1] آج بھی بھارت میں اور پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ یہ تمام ترقی بلا مبالغہ ایک شخص واحد کی لگن اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے مولوی صاحب بیشک اُردو کے حق میں مسیحا نفس ثابت ہوئے ہیں۔

بے باکی، ادبی جرأت، اور بلند اخلاقی سر سیدؔ کے کردار کے اہم اوصاف تھے، وہ حق بات کہنے میں کبھی کسی سے نہ ڈرے نہ جھکے "اسبابِ بغاوت ہند" اس کی بہترین مثال ہے۔ اُنھوں نے سانپ کی بانبی میں انگلی ڈالی تھی۔ عبدُالحق کی تصانیف بالخصوص ان کے خطبات اور تقاریر سے بھی ان اوصاف کا پتا چلتا ہے۔

> یہ اُن کے خلوص وصداقت اور بلند اخلاقی کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے گاندھی جی کی "ہندی ہندستانی" کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بڑی حد تک کامیاب رہے۔

وہ تنہا نہیں تھے پنڈت کیفی، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت کشن پرشاد کول اور ڈاکٹر تارا چند جیسی نامور ہستیاں بھی زبان کے مسئلہ پر اُن کی ہم نوا تھیں، اگر مولوی صاحب میں یہ وصف نہ ہوتا اور وہ بڑی بڑی شخصیتوں سے مرعوب ہو جاتے تو واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم نے اُردو، کا خاتمہ ہی کر دیا تھا۔ گاندھی جی،

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۳ اور صفحہ ۲ پنجاہ سالہ تاریخ انجمنِ اُردو (مرتبہ ہاشمی فرید آبادی)

دیگر سیاسی رہنماؤں اور پاکستان میں گزشتہ حکومتوں سے انجمن کی معرکہ آرائیاں مولوی صاحب کے عزم و استقلال کا کھلا ثبوت ہیں۔

مولوی صاحب کی شخصیت کو ایک مضبوط اور سرکشیدہ چٹان سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ ناکامیوں اور مخالفتوں کے کتنے ہی طوفان اٹھے، لیکن وہ اس چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر بکھر گئے۔ ان میں شکست سے بددلی کی بجائے ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے اس کا عملی ثبوت اُن کی زندگی اور اس کے کارنامے ہیں۔ مولوی صاحب کا نقطۂ نظر ہمیشہ رجائی رہا ہے۔ وہ خوش باش، خوش پوش شگفتہ رو اور سادہ مزاج انسان ہیں۔ زندہ دلی، ذکاوت اور ظرافت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جس سے اُن کی شخصیت میں انوکھی جاذبیت سی پیدا ہو گئی ہے۔ مسلسل کام کرنے سے اُن کا مزاج بہت نازک ہو گیا ہے۔ اس کا اظہار اُن کی گفتگو اور تحریر دونوں سے ہوتا ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت کے عناصرِ ترکیبی اُن کے اسلوبِ نگارش کے بھی عناصر ترکیبی بن گئے ہیں۔ اظہارِ خیال کا موثر ترین ذریعہ، الفاظ ہیں۔

مولوی صاحب اپنے خیالات کو "خوش پوش" بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جس سے ان کی نثر میں ایک دل موہ لینے والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت اُن کی نثر کی سادگی اور خلوص نے پیدا کی ہے۔ اس سادگی میں غضب کی شگفتگی ہوتی ہے۔ یہ سادگی مضمون پر مضبوط گرفت کا نتیجہ ہے اور شگفتگی ان کی خوش طبعی کا — اُن کے لہجے میں قطعیت، تیقّن اور تعلّم کی شان ہے جس کا سبب اُن کا وسیع علم ہے۔ بعض ان کے اسلوب کو حالی کا ترقی یافتہ یا حالی سے متاثرہ اسلوب خیال کرتے ہیں لیکن یہ بات زیادہ موزوں نہیں، حالی کی نسبت مولوی صاحب کا اسلوب سر سید سے زیادہ قریب ہے۔ جس طرح

عبدالحق سرسید یا حالی نہیں، عبدالحق ہیں، اسی طرح عبدالحق کا اسلوب ان کا اپنا اسلوب ہے، جس میں ان کی شخصیت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ سموئی ہوئی نظر آتی ہے۔ البتہ حالی سے انھوں نے عظمتِ انسان اور دردمندی کا سبق ضرور لیا ہے "نام دیو مالی" اور "نور خاں" کے خاکے اس کا بہترین ثبوت ہیں۔ اُن کے اسلوب کا ایک اور پہلو سنجیدہ طنز زنی ہے وہ اس طنز سے بڑا کام لیتے ہیں، اسی لیے بعض اوقات نشتریت کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کے اسلوبِ بیان کی زیادہ تر خصوصیات اُن کے اس خط میں نظر آتی ہیں جو تقسیم ہند کے بعد انھوں نے مہاتما گاندھی کو لکھا تھا۔

کردار نگاری میں مولوی صاحب، ماہر رنگ و قلم، مصوّر کی صناعی دکھاتے ہیں، "چند ہم عصر" میں اس کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں مولوی صاحب بات کے کھرے لیکن سخت گیر انسان ہیں اس لیے اُن کی تحریر بھی اُلجھاؤ اور لفاظی سے پاک ہوتی ہے وہ جو محسوس کرتے ہیں دو ٹوک بیان کر دیتے ہیں خواہ کسی کو بُرا معلوم ہو یا بھلا۔

اُن کے جملے عموماً مفرد، چھوٹے اور سادہ ہوتے ہیں۔ اُن کی تحریر میں انگریزی الفاظ مشکل سے ملیں گے اس کا سبب "اردو برتری" کا رُجحان ہے اُن کے اکثر جملوں میں کانتاتی صداقت ہوتی ہے۔

اِن کی تصانیف سے اگر انتخاب کیا جائے تو بلا مبالغہ مولوی کے زرّیں اقوال کی ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ان کی مختلف تصانیف سے پیش کی جاتی ہیں جس سے ان کی شخصیت اور اسلوب کا اندازہ ہو سکے گا۔

"گوا کے گورنر نے ۱۵۰۵ء میں بہت ٹھیک کہا تھا کہ ہم ایک ہاتھ میں صلیب اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لیے ہندوستان وارد ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی پرتگالی حکومت کا صحیح تصوّر اس سنگی تصویر سے بخوبی ہوتا ہے جو گوا میں

ایوان وائسرائے کی محراب پر بنی ہوئی ہے وُہ ایک سینٹ (یعنی ولی) کی تصویر ہے جس کا مقدس قدم منھ کے بل پڑے ہوئے غریب ہندوستان کی گردن پر ہے اور دست مبارک میں ننگی تلوار ہے، جس کی نوک ہندوستان کی جانب ہے۔ اب آپ سمجھ لیجئے کہ جن کے ولی ایسے ہیں، اُن کے شیطان کیسے ہوں گے!

(خطبات اُردو کانفرنس کالی کٹ ص۳۰۶)

"اپنے سامنے ان کتابوں کا (مولانا نذیر احمد کی کتاب امہات الامہ کا) ڈھیر لگوایا اور ان میں سے ایک مولوی نے زیادہ تر ثواب کمانے کے لیے آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کہہ کر آگ لگا دی۔ اس کے شعلے کی روشنی مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور ان کی آنکھوں کی چمک اور بشاشت سے اس خوفناک دلی مسرت و باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا جو ایک خونخوار درندے یا سنگدل انسان کی صورت سے انتقام لینے کے وقت ظاہر ہوتا ہے"

(مقدمہ تحیات النذیر)

"قومیت کے لیے یک رنگی کے لیے ہم خیالی اور ہم لسانی کی ضرورت ہے جہاں زبان ایک نہیں، وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں، جہاں خیال ایک نہیں، وہاں دِل بھی ایک نہیں"

(خطبات ص۲۵۹، اردو کانفرنس لاہور)

"جس دل میں آگ نہیں وُہ دوسروں میں چنگاریاں کیوں کر پیدا کر سکتا ہے جس دِل میں لگن نہیں وُہ دوسروں کو کیسے اُبھار سکتا ہے۔ یہ لگن کہاں سے اور کیوں کر آئے۔ یہ اس وقت پیدا ہوگی جب آپ میدان میں آئیں گے۔ لوگوں کی بھیڑ میں گھُسیں گے۔ کھوے سے کھوا چھلے گا۔ ہر طرف سے ٹکریں لگیں گی مُشکلات کا سامنا ہوگا۔ اس وقت آنکھیں کھُلیں گی۔ زندگی اصلی روپ میں نظر آئے گی۔ اُس وقت آپ کے دِل پر چوٹ لگے گی اور درد اور خلوص پیدا ہوگا اس وقت آپ کی صریرِ قلم ہولناک توپوں کی آواز سے زیادہ کارگر اور آپ کی زبان کا ایک ایک لفظ شمشیر کے گھاؤ سے زیادہ کاری ہوگا۔

(خطبات ص۵۔ انجمن حمایت اسلام لاہور)

"سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں" (چند ہم عصر)

"نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے، جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا! نیکی نیکی نہیں رہتی۔"

(چند ہم عصر)

"اگر کوئی ناواقف پہلی بار مولانا حسرت کو دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ کوئی مخبوط الحواس شخص ہے، ان کی ٹوپی پر جو اکثر ترکی ہوتی تھی آدھ آدھ اُنگل چیکٹ جما ہوتا تھا۔ داڑھی پریشان، لباس میں کوئی سلیقہ نہیں، نہ میلا نہ اُجلا، جوتے نے کبھی برش کی صورت نہ دیکھی تھی، آواز جھینگر سے ملتی جلتی لیکن اس بے ڈول قالب میں بے پایاں روحانی قوت، اخلاقی جرأت خلوص و صداقت تھی آزادی کا ایسا شیدائی کوئی کم ہوگا۔"

(چند ہم عصر)

"قدرت نے اُسے (مہاتما گاندھی) خاص قسم کا دماغ عطا کیا ہے۔ اُس کا ذہن رسا، اُس کی نظر دور بین اور اُس کا ارادہ اٹل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کی فکر کا راستہ گو بظاہر صاف اور سیدھا لیکن بہ باطن پیچ در پیچ ہے وہ اتفاق آباد جانے کا عزم کرتا ہے تو چلتے چلتے نفاق نگر پر جا نکلتا ہے وہ وصل کا طالب ہے لیکن داخل ہوتا ہے فصل کے دروازے سے وہ ایکے کا آرزو مند ہے لیکن وہاں تک پہنچتا ہے پھوٹ کے توسل سے میں کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتا۔ دلوں کا جاننے والا خدا ہے لیکن درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آیا کہ سالہا سال کی گتھیاں اور پیچیدہ مسائل فریقین نے باہمی مشورے اور مصالحت سے سلجھا لئے اور یہ اُمید بندھ گئی کہ اب نفاق کی گھٹا چھٹنے والی ہے اور آفتاب اتحاد افق سے طلوع ہونے والا ہے تو تنت پر اس مقدس ہستی نے سر ہلا کر برسوں کی محنت خاک میں ملا دی، پھر بہتیرا سر مارا، ہزار جتن کئے، نہ ماننا تھا، نہ مانا۔"

(خطبات ص۲۴۶ یوم اردو انجمن حمایت اسلام)

"تصانیفِ عبدالحق"، کا یہ ایک سرسری جائزہ تھا۔ اِس سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی علمی و ادبی و تہذیبی سرگرمیوں اُن کی شخصیت اور اُسلوبِ بیان کے متعلق قاری کوئی نہ کوئی رائے ضرور قائم کرسکتا ہے۔ بزمِ سرسید کی یہ آخری یادگار ایک عظیم نعمت سے کم نہیں۔ وہ اس وقت نوّے سال کے پھیر میں ہیں[1]۔ اُنیسویں صدی کے آخری تیس سال اور بیسویں صدی میں اَب تک زمانے نے جو جو کروٹیں بدلی ہیں اُفقِ ہند پر دُنیا کی دو عظیم جنگوں کے جو سیاہ بادل اُمڈے ہیں اور ہماری زندگی پر جو اثرات اُنھوں نے مرتب کیے ہیں، گزشتہ ساٹھ برس میں ہماری ملکی سیاست نے جو جو بدلے ہیں اور ان تمام تبدیلیوں کا جو اثر زندگی، ادب اور اُردو زبان پر ہوا ہے، مولوی صاحب نے ایک باہوش انسان کی طرح اُس کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ۱۹۱۲ء سے آج تک انھوں نے ترقّیِ اُردو کے لیے مسلسل جدوجہد کی ہے انھوں نے اولاد سے زیادہ اردو، کو چاہا ہے۔

"گیسوئے اُردو" کو اُنھوں نے والہانہ اشتیاق سے سلجھایا اور سنوارا ہے لیکن اس کی آرائش و تزئین کی خاطر اُنھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً اٹھارہ ہزار دو سو پچاس دن نذر کیے ہیں۔

اُن کی زندگی نوجوانوں کے لیے درسِ عمل ہے۔ اُن کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جائے گا۔

---

[1] ملاحظہ ہو: "World Bibliography" کا چوتھا ایڈیشن ص ۲۱۵۹ جس میں مولوی صاحب کی تاریخ پیدائش اگست ۱۸۷۰ء تحریر کی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ صحیح تاریخ پیدائش ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء ہے (تہور حسین)[2]

[2] صحیح دراصل یہ ہے کہ مولوی صاحب ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔ اِس سلسلے میں دیکھیے مولوی صاحب کی ایک قلمی تحریر کا عکس مطبوعہ رسالہ "ہم قلم" کراچی بابت شمارہ اگست ۱۹۶۲ء (معین الرحمٰن)

پروفیسر آفتاب زبیری (علیگ)

# مولوی عبدالحق

## (ایک جائزہ)

بقول آقائی رشید احمد صدیقی "عہد مغلیہ نے ہندوستان کی تہذیب کو تین چیزیں عطا کی ہیں۔ تاج محل، اردو اور مرزا غالب" لیکن اسی مغلیہ سلطنت کے چراغ نے گل ہوتے ہوئے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہمیں سرسید جیسی نعمتِ عظمیٰ بھی بخشی، جس نے مسلمانوں کی زوال پذیر، سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور تہذیبی شیرازہ بندی کے لئے علی گڑھ تحریک کو جنم دیا اور علی گڑھ کی اس خاک نے کتنے ہیرے اگلے، یہ حقیقت تاریخ کے آئینہ میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ تاریخی بصیرت رکھنے والوں سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں کہ ہر تحریک خواہ اصلاحی ہو یا انقلابی، علمی و ادبی ہو یا تہذیبی اوّل، کسی ایک شخص کے دماغ کا نتیجہ ہوتی ہے پھر چند ہم خیال اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ حلقۂ اثر بڑھ کر ایک تنظیم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس برِ عظیم کے مسلمانوں کی تمام تر تحریکوں، تعلیمی، معاشرتی، علمی، ادبی، سیاسی کا سرچشمہ سرسید ہی کی ذات اور اُن کے رُفقائے کار ہیں۔ اردو تحریک علی گڑھ تحریک ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسی اردو تحریک کا فعال ادارہ انجمن ترقی اردو ہے اور ترقی اردو کی انجمن آرائی، سرسید اور پھر اُن کے ساختہ و پرداختہ ایک بندۂ حق کے حسنِ کرشمہ ساز کا نتیجہ ہے!

انجمن کا "کاغذی قیام" ۱۹۰۲ء میں ہوا لیکن ۱۹۱۲ء میں جا کر حیدرآباد دکن میں یہ ادارہ باقاعدہ عملی، حرکی اور جدلیاتی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس عمل اور حرکت کا سبب اس کے نئے معتمد کا وجود سیمابی ہے، جس نے علی گڑھ تحریک کی کوکھ سے جنم لیا، سرسید اور ان کے رفقائے کار کے گہوارۂ تمدن میں پرورش پائی اور جو بندۂ حق بن کر عبدالحق کے نام سے روشناسِ خلق ہوا۔

اردو زبان میں جس سادہ اور دلکش نثر کا آغاز میرامن نے کیا تھا اور غالب نے

جسے شوخی، برجستگی، روانی اور اختصار و ایجاز بخشا تھا اور سرسید نے اُردو زبان و انشا کی جدت آمیز قدیم روایات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اور حالی نے اپنے پیہم خلوص سے جسے جلا بخشی، آگے بڑھایا، مولوی عبدالحق نے اُسے مکمل کر دیا۔ مولوی عبدالحق کا اور اُردو زبان و ادب کا ساتھ بڑا بدیہی اور لابدی ہے۔ پھر یہ ساتھ بڑا متنوع اور ہمہ جہتی بھی ہے، بالکل اُردو شاعری کے محبوب کی طرح اس کے ساتھ نہ جانے کتنے طرحدار پہلو ہیں۔ مولوی عبدالحق بیک وقت چوٹی کے ادیب ہیں، صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں، ماہر لسانیات ہیں، اُردو زبان و ادب کے مؤرخ و محقق ہیں، ان کی ادبی بصیرت فنی آگہی، لسانی مہارت، زبان کی ماہیت سے آگاہی، لفظوں کے صوتی آہنگ و ترتیب سے واقفیت ان کے کلاسیکی اسلوبِ نگارش کے نمایاں پہلو ہیں۔ ساتھ ہی مولوی عبدالحق اشاعتِ اُردو کی مہم کے رہنما رہے ہیں اور مختلف علمی و ادبی اداروں کے بانی مبانی بھی۔ ان کی شخصیت، ان کی زندگی اُردو زبان و ادب کی ایک تاریخ ہے۔

مہدی افادی کے خیال میں سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے حالی بھی جہاں تک نثری ادب کا تعلق ہے، سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اُردو، یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں مگر بابائے اُردو، یعنی مولوی عبدالحق، انشا پرداز بھی ہیں، مؤرخ بھی، محقق بھی، قواعد و لغت نویس بھی، ماہر لسانیات بھی اور سوانح نگار بھی، میں سوچتا ہوں مہدی افادی کی عمر کچھ اور وفا کرتی تو خدا جانے آقائے اُردو، یعنی آزاد پر کیا بیتتی۔؟

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے بیسویں صدی کے آغاز میں انجمن ترقی اُردو کا قیام عمل میں آیا انجمن ترقی اُردو کے کارناموں کی تاریخ خود مولوی عبدالحق کے کارہائے نمایاں سے عبارت، اور ان کے عزم، ایثار، استقلال اور خلوص کار کی امر کہانی ہے۔ مولوی عبدالحق کی ذات انجمن تھی اور انجمن مولوی صاحب کی ذات سے آراستہ ترقی اُردو اور مولوی عبدالحق کا تعلق فاعل اور فعل کے مصداق رہا ہے۔

علم و فنون کی کتابوں کے ترجمے اور تالیف کے علاوہ مولوی عبدالحق نے اپنے رسالہ "اُردو" کے ذریعے سب سے پہلے دسویں گیارہویں صدی ہجری کے قدیم ادب

کو روشناس کرایا جس سے ادب اردو کی تاریخ میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ قدما کا کلام اور اساتذہ کے نایاب تذکرے جو اب تک گوشۂ گمنامی میں تھے، شائع کئے ان پر کامیاب مقدمے لکھے۔ انگریزی اور اردو کی ایک جامع اور مکمل لغت بصرفِ کثیر سالہا سال کی مسلسل محنت کے بعد ان کی نگرانی اور رہنمائی میں تیار ہوئی۔ رسالہ "سائنس" جاری کیا گیا جس نے سائنس کا ذوق عام کرنے میں بڑا کام کیا اور جو انجمن ترقی اردو کے جملہ اثاثہ کے ساتھ ہندوستان ہی رہ گیا (ہم کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر)۔

مولوی عبدالحق کی مساعیٔ جلیلہ سے حیدر آباد دکن میں اردو یونیورسٹی کا ڈول ڈالا گیا۔ دارالترجمہ قائم ہوا۔ مولوی صاحب اس کے ناظم مقرر ہوئے اور انہوں نے اپنے اثر سے مستند عالموں کو یکجا کیا۔ خود بھی کام کیا اور ان سے بھی کام لیا۔ اردو کی جامع و معیاری قواعد لکھی، مکمل تاریخی لغت کی داغ بیل ڈالی، فنی و علمی اصطلاحات کے اردو میں مناسب و موزوں ترجمے وضع کئے، ان کے اصول متعین کئے اور بڑی کاوش اور تحقیق سے قدیم ادب کا سراغ لگایا اور زبان کی تاریخ میں کئی سو سال کا اضافہ کر دیا۔ قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا شاعر تسلیم کرایا اور لسانی ارتقا کی دوسری بہت سی حقیقتیں بے نقاب کیں جن کی تردید آج تک نہیں ہو سکی۔

مولوی عبدالحق کے مقدمات، جو انہوں نے مختلف کتابوں، قدیم تذکروں اور اساتذہ کے دواوین پر وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے کتابی صورت میں شائع ہو چکے۔ یہ مقدمات بڑے بصیرت افروز ہیں اور ان مقدمات میں، بقول نواب صدر یار جنگ "زور ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ لکھتے نہیں لڑتے ہیں!"

مولوی صاحب کے مقدمات میں تحقیقی اور تنقیدی رنگ نمایاں ہے اور اس نمائندگی میں وقار ہے، سنجیدگی ہے اس پر مستزاد مولوی صاحب کی تنقید میں بڑا توازن ہے علمیت ہے، ذکاوت ہے، متانت ہے، معقولیت ہے۔ "تنقیداتِ عبدالحق" اگرچہ مولوی صاحب کے ابتدائی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے لیکن بعض افراد اور کتب پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جوش ملیح آبادی اور ان کی دو کتابوں "روحِ ادب" اور آیات و نغمات پر مولوی صاحب کا تبصرہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اور ہر چند کہ تبصرہ کیے مدت گزر چکی لیکن آج بھی یہ تبصرہ "قولِ فیصل" سے کم نہیں، مولوی صاحب فرماتے ہیں۔

"جوش کے یہاں استعارات وتشبیہات کی اس قدر بہتات ہے کہ مسلسل پڑھنے سے جی اکتاتا ہے اور کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑتی ہے۔ جوش، انقلاب، نظامِ جدید اور ہر جدید رنگ پر فریفتہ ہیں۔ جوش وخروش اور انقلاب کے نعروں سے ان کا کلام گونجتا ہے لیکن انقلاب کیا ہے؟ نظامِ جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے انہیں بحث نہیں انہیں غارت گری سے مطلب ہے ان کی حالت ایک تماشائی کی سی ہے۔ جس پر بیتتی ہے اور جو اپنے اصولوں کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہے اور خوشی خوشی ہر طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے۔ جوش کے کلام کو پڑھ کر لطف و سُرور حاصل ہوتا ہے لیکن اس میں بلندیٔ فکر اور تاثیر نہیں۔"

آج بھی جوش کا کلام بلندیٔ فکر اور تاثیر سے محروم ہے۔ یہ اور دیگر تبصرے اور تنقیدیں مولوی صاحب کی وسعتِ مطالعہ، اصابتِ رائے اور ذوقِ سلیم کی فراوانی کا بیّن ثبوت ہیں۔

مولوی عبدالحق کا "اپنا موضوع" تحقیق وتنقید ہے مگر ان کی ذات وصفات، جلال وجمال کا تمام تر کمال اُن کے خطبات اور اُن کے تراشیدہ مرقعوں میں جس خوبی اور بے ساختگی سے اُبھرا ہے، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

خطبات کے آئینہ میں اُن کی عظیم شخصیت بے نقاب نظر آتی ہے۔ یہ خطبات مولوی صاحب کے شعروادب کے رچے ہوئے مذاق، زبان وکلچر کے عمیق مطالعے، ادب سے غیر معمولی شغف اور اردو زبان وادب کی ترقی وتوسیع کی بے پایاں لگن پر دلالت کرتے ہیں۔

مولوی صاحب کے خطبات زیادہ تر زبان ولسان کے موضوع پر ہیں۔ ان میں اُردو زبان کی تاریخ اور برعظیم کی دوسری زبانوں پر اس کی فوقیت و برتری کا ثبوت ملتا ہے اور یہ ثبوت، محققانہ، حکیمانہ، عالمانہ اور فاضلانہ ہے۔ مولوی صاحب کو اُردو زبان سے والہانہ وابستگی اور بے پایاں محبت ہے بایں ہمہ اُن کے خطبات جذباتیت سے ماوراء اور منطقی وتاریخی توازن کے حامل ہیں اور ان کا سادہ اور پُرکار اسلوب ہر جگہ نمایاں ہے۔

مولوی صاحب ان خطبات میں اِس حقیقت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ سرسید ہی ہمارے پہلے رہنما ہیں اور انہوں نے ہی اوّل اوّل زبان کی سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، قومی وملی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا اور ان کے بعض رُفقاء نے بھی اس طرف خاطرخواہ توجہ

دی۔ سرسید اور ان کے رفقاء کار کے اس کام کو جس خلوص، انہماک یکسوئی اور جیات سوزی کے ساتھ خود مولوی صاحب نے تکمیل کو پہنچایا، وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ ان کا یہ جذبۂ جہاد کار قومی زندگی کا احاطہ کرلیتا ہے اور ذہنوں کو نت نئے افق عطا کرتا ہے۔ یہ خطباتِ بڑے حیات آفرین ہیں۔ ان سے زندہ رہنے، کام کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اس سے قطع نظر مولوی صاحب، کے یہ خطبات وہی اہمیت رکھتے ہیں جو غالب کے خطوط۔ ان سے بھی ادبی، علمی، سیاسی، سماجی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے، یہ بھی قومی وادبی حالات اور مولوی صاحب کی سوانح حیات کی مستند دستاویز ہیں!۔

مولوی صاحب نے اپنے ہم عصر ہم چشم، بزرگوں اور دوستوں کے مرقعے اور خاکے بھی تراشے ہیں اور ان کی سیرت و شخصیت کے جلال وجمال نے جیسا کہ عرض کیا جاچکا خطبات کے علاوہ ان مرقعوں ہی میں رنگ پکڑا ہے۔

خاکہ نگاری، اگرچہ اردو ادب میں کوئی نئی چیز نہیں "چند ہم عصر" سے قبل مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی الخ" کا شمار بھی اردو ادب کے اعلیٰ نمونوں میں ہوتا ہے۔ پھر مولوی صاحب کے ہم پیشہ و ہم مشرب آقائی رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گرامایہ" کی حیثیت بھی کلاسیکی ہے لیکن "چند ہم عصر" کو اس لئے ممتاز حیثیت حاصل ہے کہ مولوی صاحب نے صرف نام آور شخصیتوں کو ہی اپنی قلم کاری کے لئے منتخب نہیں کیا بلکہ انہوں نے انتخاب انسانوں کا کیا ہے۔ ان میں نامور اور گم نام دونوں طرح کے افراد شامل ہیں اور سرسید، حالی، محسن الملک، حسرت اور خالدہ ادیب خانم وغیرہم کے علاوہ مولوی صاحب کے معاصرین میں "نام دیو مالی" اور "نور خاں سپاہی" بھی شریکِ محفل ہیں۔

تصنیف، اپنے مصنف کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ "چند ہم عصر" کے اوراق میں ہم مولوی صاحب کو نہایت محنتی، مخلص، بادضع، بے باک، طبّاع، علم دوست اور صاحبِ دل پاتے ہیں۔ مولوی صاحب کی کامیاب قلمی تصادیر کی صناعی، چابکدستی، رنگینی اور رعنائی کا یہ اعلیٰ وارفع معیار خیابانِ نظر بن کر چینی مصوری اور نقاشی کی یاد تازہ کردیتا ہے، گویا عبدالحق پہلے چینی ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے۔

ان مرقعوں سے مولوی صاحب کے مثالی انسانی نظر تصور اور خود مولوی صاحب کے افکار و خیالات

تک رسائی میں بھی بڑی مدد ملتی ہے:

"نام دیو مالی بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔ احساس فرض اور انسانی ہمدردی، جفاکشی اور کام میں بے پناہ شغف، سگھڑاپا اور صفائی مزاج کی نیکی اور سادگی، جس آدمی میں ہو، وہ سچ مچ موتیوں میں تولنے کے لائق ہے، خواہ اس کے ہاتھ پھلواری کی مٹی سے بھرے ہوئے ہوں اور تن پر قیمتی لباس کے بجائے چیتھڑے ہی کیوں نہ ہوں۔"

"حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تونے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی، وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں، وہ پوچھے گا تو یہ کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تونے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔"

نام دیو کا احساسِ فرض، انسانی ہمدردی، جفاکشی اور کام میں بے پناہ شغف، سگھڑاپا اور صفائی، مزاج کی نیکی اور سادگی، خود مولوی صاحب کی شخصیت کے عناصرِ ترکیبی ہیں۔ گویا نام دیو مالی، اگر زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوتا، تو مولوی عبدالحق بن جاتا یا مولوی عبدالحق دولت تعلیم اور سرزمین علی گڑھ سے محروم رہتے، تو نام دیو مالی ہوتے۔!!

اِن مرقعوں میں، نور خاں کا نقش بھی کچھ کم دل آویز نہیں، نور خاں:

"حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس ہمدرد، مرنجاں مرنج اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔"

اور یہی بیان بے کم و کاست، مولوی عبدالحق پر بھی صادق آتا ہے۔ مولوی صاحب کے یہ مرقعے انسانوں کے ہیں، گوشت پوست کے انسان، فرشتے نہیں ہیں، ان سے غلطی کا امکان ہے اور ان میں انسانی کمزوریاں بھی موجود ہیں۔ انہوں نے خوبیوں کو جہاں جہاں نظر آئیں، بڑے خلوص سے اجاگر کیا لیکن نقائص پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی، ان کو بھی صفائی کے ساتھ بیان کر دیا ہے بہ ایں ہمہ ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا جس

وقبح کا یہ امتزاج اُن کے مُرقعوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

محسن الملک کی قلمی تصویر مولوی عبدالحق کی حق گوئی وبیباکی کی نمایاں مثال ہے۔ اسی طرح مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت و سیرت پر ڈاکٹر عبدالحق کا مضمون، ایک جاندار تبصرہ ہے۔ اس مضمون میں مولانا محمد علی کی ذات اور کردار کے حقیقی نقوش ہی اجاگر نہیں ہوتے بلکہ خود مولوی عبدالحق کی مردم شناسی، انسانی فطرت سے آگہی، وسیع النظری، حق گوئی وبیباکی پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے۔ مولانا محمد علی پر "گنج ہائے گراں مایہ" میں رشید احمد صدیقی کا مضمون بھی خاصے کی چیز ہے اور رشید صاحب کے معجز نما اسلوبِ نگارش کا کمال بھی اس کے اختصار میں اعجاز ہے پھر بھی مولانا محمد علی کی شخصیت کا ایک ہی رُخ نمایاں ہوتا ہے اور یہ رُخ مولانا کی عظمت و رفعت، وقعت و اہمیت سے عبارت ہے، صاف گوئی، بیباکی اور حق گوئی پر غالباً مصلحتِ وقعت اور دور اندیشی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس مولوی عبدالحق کا مضمون ایک بیباک، بے لاگ اور جرأت انگیز تبصرہ بھی ہے اور متوازن، فطری، حقیقی اظہارِ بیان کا اعلیٰ نمونہ بھی۔

غرض اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں مولوی عبدالحق کے اِن قلمی مُرقعوں کی حیثیت ایک سنگِ میل کی ہے۔ یوں بھی میرن صاحب اور حالی کا مزاج داں اور سرسیّد کا رفیقِ کار اب ہم میں کون رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے مندرجات ایک معتبر تاریخی دستاویز سے کچھ کم نہیں۔

مولوی صاحب کی ادبی، علمی اور تحقیقی کرامات اور ان کی ذاتِ والا صفات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں بڑا استحکام ہے، عزم ہے، حوصلہ ہے اور ان سب کا محور اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت ہے۔ پیرانہ سالی میں بھی ان کا حوصلہ، ان کا جذبہ، ان کی جفاکشی، غیرتِ جواں سالی تھی۔ اور بقول ڈاکٹر شوکت سبزواری "اس قسم کے دیدہ ور صاحبِ نظر و خبر، کہیں صدیوں میں جا کر مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔"

———— ✕ ————

○

"اُردو ادب کی پوری تاریخ میں اُردو کی گوناگوں خدمات کے تعلق سے اتنی ہمہ گیر شخصیت ڈھونڈے سے نہیں ملتی، جو مولانا عبدالحق سے زیادہ "بابائے اُردو" کے لقب کی مستحق ہو۔۔۔ اُن کی اُردو خدمات کے ایک دو نہیں کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنی جگہ نہایت درجہ تابناک ہے"

——— مبارز الدین رفعت

جمیل متین الرحمٰن

# مولوی عبدالحق

## (ایک تاثر)

اب تک ہم تصوف کی تین اصطلاحوں سے آشنا تھے۔ فنافی اللہ، فنافی الرسول اور فنافی الشیخ۔ اس کے ساتھ اب ایک اور اصطلاح کا بھی اضافہ ہوسکتا ہے، اور وہ ہے "فنافی المقصد" جو اپنے مقصد کے حصول میں فنا ہوجائے۔ کسی اعلیٰ مقصد سے وابستہ رہ کر اس کے حصول میں شب و روز منہمک رہنا انسانی عظمت کی دلیل ہے اور بابائے اردو کی شخصیت میں بھی یہی عظمت نظر آتی ہے۔ اردو ان کی زندگی کا محور، ان کی زندگی کا مقصد تھی۔ انھوں نے اپنی ساری عمر اردو زبان کی ترقی و ترویج میں صرف کردی۔ وہ خود فنا ہوکر اس کو بقائے دوام بخش گئے۔ "لشکر کا یہ سپاہی" تن تنہا کئی محاذوں پر مصروفِ کار و پیکار رہا۔ راہ میں مخالفتوں کے (سنگِ گراں آئے) مگر اس نے ایک مجاہدانہ شان سے بادِ مخالف کا رُخ بدل کر ایسی شاندار کامیابی حاصل کی، جس کی نظیر نہیں ملتی —

مولوی عبدالحق کی قومی خدمت، کام کرنے کی دُھن اور قربانیوں کے جذبے کی کڑی علی گڑھ تحریک سے ملتی ہے۔ علی گڑھ تحریک —— جو مغربی اثرات اور ذہنی غلامی سے نجات کی جدوجہد، ترقی پذیر ادب کی تخلیق اور فرسودہ روایاتِ قدیم سے بغاوت کا دوسرا نام ہے۔ اس تحریک میں شریک ہر فرد نے اپنے اپنے منفرد کارناموں سے قوم کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ سرسید کا تہذیب الاخلاق، حالی کا مدّو جزرِ اسلام، شبلی کی الفاروق، مولانا نذیر احمد کے اصلاحی ناول، وقار الملک اور محسن الملک کی مُردہ اعصاب میں زندگی کی لہر دوڑا دینے والی تقریریں اور مولانا چراغ علی کی تحریریں، ان سب نے ماضی کی عظمت کو یاد دلایا، حال کی زبوں حالی پر آنسو بہائے اور مستقبل کے سہانے خواب دیکھنا سکھایا۔ مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا، اخلاق کی اصلاح کی، شائستگی اور قومی عزت کا احساس پیدا کیا اور اردو کو قومی حسیات اور اجتماعی افکار کا ترجمان بنایا۔ سرسید

کا استدلال، شبلی کا فہم و فلسفہ، حالی کا خلوص اور حقیقت پسندی، نذیر احمد کی مصلحانہ کارگری، وقار الملک کا عمل اور عزم، اور محسن الملک کا خطیبانہ جوش اور جذبہ، یہ سب اختصاص، صفات اور امتیاز سمٹ کر مولوی عبدالحق میں یکجا ہو گئے تھے۔

مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد مقرر ہوئے اور اردو تحریک کو ایک عزم صمیم علاوہ مستقیم کے ساتھ ملک کے کونے کونے میں پہنچایا اور ہندوستان بھر میں اس کی شاخوں کا جال بچھا دیا۔ شاخیں پھیلیں تو انجمن کا دائرۂ عمل بھی وسیع تر ہوتا گیا۔ مطبع کا قیام، رسائل کا اجراء، کتابوں کی اشاعت کا وسیع پروگرام، قدیم اردو مصنفین کی کتابوں کی تلاش اور طباعت دوسری زبانوں کی مفید کتابوں کے ترجمے یہ سب اس انجمن کے کارہائے نمایاں ہیں اور مولوی عبدالحق کے نامِ نامی سے الگ انجمن کا کوئی تصور نہیں!

مولوی صاحب بذاتِ خود ایک انجمن تھے، وہ اردو کے صاحب طرز ادیب، اعلیٰ درجے کے مؤلف، باکمال انشاپرداز، دیدہ ور محقق، بالغ نظر نقاد اور کشادہ دل مبصر تھے۔ ہزاروں صفحے خود لکھ ڈالے اور ہزاروں دوسروں سے لکھوائے "اسٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری" اُن ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ "قواعد اردو" صرف و نحو پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے جو اردو زبان کا مزاج و منہاج سمجھنے کے لئے ہمیشہ مشعل راہ کا کام دیگی۔ انہوں نے متعدد تنقیدی مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ اپنے تحقیقی کارناموں پر جو مقدمے لکھے ہیں، اُن میں بھی تنقیدی پہلو نمایاں ہے۔ اُن کے بے لاگ لیکن ہمت افزا تبصروں نے، جو زندگی بھر وہ اپنے رسالہ "اردو" میں لکھتے رہے ہیں، کتنے ہی دلوں کو گرمایا کتنے ہی کنول آبِ کثیف سے ابھر آئے، اور کتنے ہی موتی آبدار تر ہو گئے۔

مولوی عبدالحق بہت بڑے ماہر لسانیات تھے۔ زبان کے مختلف پہلوؤں پر ان کی نظر بڑی گہری تھی جس کا ثبوت اُن کے خطبات اور تقاریر سے ملتا ہے۔ اس میں اردو زبان کی تاریخ، اس کی ابتدا کے متعلق نظریات، اس کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت اس کے ماضی حال اور مستقبل کی کیفیت، برعظیم کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس کی برتری اور اسی طرح کے دوسرے مسائل پر تفصیل بحث ملتی ہے۔ اس میں ایک منطقی انداز ہے اور پھر خلوص کی فراوانی کا نتیجہ ہے کہ بات دل میں گھر کرتی ہے اور لسانیات جیسا

خشک موضوع بھی حلق سے نیچے اُتر جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا ایک اہم ترخدمت تدوینِ لغتِ اُردو کی تحریک اور اس کی اشاعت ہے جو سخت خلفشار کے زمانہ میں "اردو ترقی بورڈ" کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوئی جس کے چیف ایڈیٹر اور روحِ رواں خود بابائے اُردو ہی تھے زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کام ان کے سامنے مکمل نہ ہو سکا مگر یہ کام جاری ہے۔ مجوزہ لغت متعدد جلدوں میں شایع ہو رہی ہے لغت کے اس منصوبے نے تکمیل کا مُنہ دیکھ لیا تو یہ مولوی عبدالحق کی قدآور یادگار اور اُردو کی عظمت و سطوت کا شایانِ شان مظہر ہو گا۔

مولوی عبدالحق بہترین خاکہ نویس بھی تھے۔ اُنھوں نے اردو کے بہت سے گنج ہائے گراں مایہ ماضی کی تہوں سے کھود کر نکالے اور انھیں نکھار کر پیش کیا۔ "چند ہم عصر" اُن کی شخصیت نگاری کا آئینہ دار ہے جس میں ہمیں بہت سی یادگار زمانہ تصویروں کا واضح بالذات عکس نظر آتا ہے۔

مولوی صاحب کی ادبی خدمات کے علاوہ اُن کی تعلیمی سرگرمیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ وُہ مختلف اوقات میں اُستاد، صدر مدرّس، انسپکٹر مدارس، کالج کے پرنسپل اور یونیورسٹی پروفیسر و صدر شعبہ کی جائیداد پر کام کر چکے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام میں ان کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ اُن کی نگرانی اور شخصی مساعی کے باعث عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب کی تمام کتابیں دو سال کی قلیل مُدت میں چھپ کر تیار ہو گئیں تھیں قدیم اُردو کا گہوارہ ہونے کی حیثیت سے دکن کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کو ترقی دینے اور فعال بنانے میں مولوی عبدالحق کی خدمات کو بہت دخل ہے۔ انھوں نے اُردو کے مخطوطات اور نادر تذکروں کی اشاعت سے اُردو زبان کی عمر میں کئی سو سال کا اضافہ کیا۔ اُنھوں نے دکن کو اپنی ہمہ جہتی علمی سرگرمیوں کا مرکز نہ بنایا ہوتا تو تاریخ و تحقیق کا کام اتنا ترقی نہ کرتا۔

اُردو ہندی کا جھگڑا سر سید کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ ہندو یہ سمجھنے لگے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے تمدّن کی سب سے بڑی علامت اُردو کو ختم نہ کیا جائیگا قدیم ویدک تمدن کا فروغ پانا مشکل ہے۔ عیسائیوں میں کچھ اُردو کے حق میں تھے اور کچھ ہندی کے حامی۔ رفتہ رفتہ یہ گروہ بندی مستحکم ہو گئی اور آزادیٔ ملک کے لیے جدوجہد اور سیاسی مسئلہ بیداری کی صورت میں نمودار ہوئی۔ بابائے اُردو نے اُردو کی باگ ڈور

اس وقت ہاتھ میں لی جب مسئلہ اُردو کل ہند سیاسی مسئلہ بن چکا تھا۔ ہندو "دیوناگری" رسم الخط کو رواج دینا چاہتے تھے جس سے زبان کا ڈھانچہ ہی بدل کر رہ جاتا۔ ان سیاسی اُلجھنوں کے باوجود انھوں نے نہایت ہی پُر امن طریقے سے اُردو کے فروغ اور استحکام کی کوشش کی۔ ۱۲ جنوری ۱۹۳۶ء کے "خطبۂ صدارت شعبۂ اُردو ہندوستان اکیڈمی" کے چند نکات ملاحظہ ہوں:

رسم الخط کا مسئلہ آج کل بہت زیرِ بحث ہے اور جھگڑوں کا چھتا بن گیا ہے۔ اس میں مشکل یہ آپڑی، جیسا ہمارے ہاں عام دستور ہے، رسم الخط کو قومی تہذیب اور مذہب کا جز سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لئے موجودہ حالات میں اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلہ کو جذبات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اقتصادی مسئلہ ہے۔ جس رسم الخط میں صَرف کم ہوگا، وقت کم لگے گا، جگہ کم گھرے گی اور جس کے پڑھنے میں آسانی ہوگی اور جو دیکھنے میں خوش نما ہوگا وہی مقبول ہو سکے گا ــــــــ عام طور پر لوگوں نے اسے ہندی اُردو سے متعلق کر کے جھگڑے کے لئے ایک نیا شاخسانہ کھڑا کر لیا ہے۔ اس کا حل آسان ہے، اس کا رواج آسان نہیں۔ اس کے لئے مدّت درکار ہے۔"

کیا استدلال ہے، کیسا سُلجھا ہوا انداز، کیا پُر اثر بیان اور کیسی بے باک تقریر ہے کہ آج بھی اس کے پڑھنے سے دل پر وہی اثر ہو رہا ہے جو شاید تیس بتیس برس پہلے اس تقریر کے سامعین پر ہوا ہوگا۔ وہ برِّعظیم میں لسانی اتحاد کے حامی تھے۔ مولوی عبدالحق نے اُردو کی خدمت کو اپنا قومی شعار بنایا جس میں ایک عظیم سیاسی، عمرانی مصلحت بھی پنہاں تھی اور جو برِّعظیم کے مختلف الخیال عقائد اور رسوم و رواج کے اجزائے پریشان کو ایک عظیم برادری میں منسلک کرنے کا واحد ذریعہ بھی تھی۔ اس طرح مولوی عبدالحق نے نہ صرف علمی و ادبی کارناموں اور گراں قدر تصانیف سے اپنی قوم کو نوازا بلکہ قومی تمدن و ثقافت کا تحفظ کر کے قوم کے مُحسن کہلائے۔

یہ بابائے اُردو ہی تھے جنھوں نے قائدِ اعظم اور مسلمانوں کی قومی جماعت کو "بنائے پاکستان" کی لسانی وجوہ کی جانب متوجہ کیا اور بتایا کہ "مسلم لیگ کے مطالبات میں اگر اُردو کی لسانی اہمیت کو تسلیم نہ کیا گیا تو پھر یہ تحریک نہ صرف مسلمانوں کی قومی اور مذہبی روایات

سے دور ہو جائے گی بلکہ اُن کے تمدن اور کلچر کو بھی نقصان پہنچے گا" چنانچہ مسلم لیگ کے مطالبات میں اُردو کی وحدت کو شامل کیا گیا۔

مولوی عبدالحق کا ایمان تھا کہ مسلمانانِ ہند و پاکستان کی بہبود و ترقی کا دار و مدار اُردو کی ترقی اور ترویج پر ہے۔ اس لئے وہ جلد سے جلد پاکستان میں اُردو کو انگریزی کا مقام دلوانا چاہتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ عدالتوں کی زبان اُردو ہو، اسمبلیوں کی زبان اُردو ہو، دفتروں کی زبان اُردو ہو، اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہو۔ اس کے لئے اُنہوں نے کراچی میں اُردو کالج کھولا۔ اسی مقصد کے لئے وہ اُردو یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے مگر یونیورسٹی ان کی زندگی میں نہ بن سکی۔ دیکھیے ان کا یہ ادھورا خواب کب پورا ہوتا ہے!

بابائے اُردو کی خواہش تھی کہ اُردو بلا شرکتِ غیرے پورے ملک کی زبان رہے۔ اُردو کو ہر خیال کے اظہار کا اہل مانا جائے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اُولوالعزم انسان اُردو کے تحفظ کے لئے پچاس سال تک ہر موڑ پر اُردو کے دشمنوں کا منہ نہ موڑ دیتا تو آج اُردو کی حیثیت کسی علاقائی زبان سے زیادہ نہ ہوتی۔ اس طرح ہماری یہ تہذیب و ثقافت تباہ ہو جاتی۔ دراصل مولوی صاحب گزشتہ نصف صدی بھر ایک ایسی تحریک کے روحِ رواں رہے جو ہماری تہذیبی اور قومی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ ان کی زندگی ایسے کام میں بسر ہوئی جس میں صلے یا مادی فائدہ کی اُمید نہ تھی بلکہ اس کے برعکس انھیں اغیار کے طعنے، اپنوں کی مخالفت، معاشی اور اقتصادی بدحالی جیسی دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا۔

وہ عمر کے آخری حصے میں بھی اپنی صحت سے لاپرواہ ہو کر اُردو یونیورسٹی کے لئے عملی جدوجہد میں مصروف تھے مگر اُنہیں حسبِ دل خواہ تعاون نصیب نہ ہوا۔ انتقال سے ٹھیک دو برس قبل ۱۶ اگست ۱۹۵۹ء کو "بزمِ امروز" کی افتتاحی تقریب میں فرمایا:

"اُردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ہماری قوم کی پوری تاریخ ہے۔ اگر تاریخ مٹ جائے تو زبان گناہ گار سمجھی جائے گی۔ اپنی زبان سے محبت کرنا دراصل اپنے ملک و قوم سے محبت کرنا ہے"

آخر میں بابائے اُردو نے بڑے رقت آمیز لہجے میں میزبان بچوں سے کہا کہ:

"لوگ مجھے بابائے اُردو کہتے ہیں۔ مگر پاکستان میں آکر تو میں "طفلِ اُردو" ہو

گیا ہوں۔ وہ کام اب تم لوگ پورا کرو جسے پورا نہ کرسکا۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز رُندھ گئی اور پھر بڑی مشکل سے وہ اپنی تقریر جاری رکھ سکے اس کے ایک سال بعد اسی انجمن نے بابائے اُردو کی اپیل پر یونیورسٹی فنڈ کے لئے ۲۷۰ روپے کا نذرانہ پیش کیا تو رقم لیتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ پھر متعدد مقامات پر طلبا نے اس فنڈ کے لئے رقم جمع کی اور اسے بابائے اُردو کی خدمت میں پیش کیا۔ مولوی صاحب نے خود وہ دس ہزار روپے کی رقم بھی اُسی فنڈ میں جمع کرادی جو صدرِ مملکت نے اُن کی خدماتِ جلیلہ کے اَدنیٰ اعتراف کے طور پر اُنہیں عطا کی تھی۔

مولوی عبدالحق نے دوستی اور دشمنی کا معیار، اُردو کو بنایا تھا۔ جسے اُردو زیادہ عزیز تھی وہ اس کو اتنا ہی عزیز رکھتے اور اُردو کا دشمن گویا اُن کا دشمن تھا۔

انجمن کے دلی لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ آخر دم جو لفظ اُن کی زبان سے نکلا وہ "انجمن" تھا، جو وصیت اُنہوں نے کی وہ انجمن کے بارے میں تھی۔ اُنہوں نے انجمن ترقی اردو کی اپنے خون سے آبیاری کی۔ زندگی بھر جو کمایا وُہ انجمن کو دے دیا۔

تقسیم ہند کے بعد وُہ اپنی ساری عمر کا بیش بہا علمی اندوختہ دشمنوں کے حوالے کرکے دلی سے کراچی تشریف لائے تھے۔ عمر کے آخری دور میں اپنی علمی اور عملی سرگرمیوں کے بہترین مرکزوں سے مستقل جدائی، دلی کی ادبی محفلوں کا اُجڑنا اور سب سے بڑھ کر دریا گنج دہلی میں انجمن ترقیٔ اُردو کے دفتر اور بیش قیمت کتب خانے کی تباہی، ایسے صدمات نہ تھے جو آسانی سے برداشت کئے جا سکتے۔ لیکن اُنہوں نے نہایت صبر و تحمل سے کام لیا اور ضعیف العمری کے باوجود اپنے مقصد کے حصول میں لگے رہے۔ اُن کی جرأت استقامت اور کام کرنے کی لگن نے تو نوجوانوں کو بھی شرما دیا۔ مستقل مزاجی اور اُمید کی شمع لئے مایوسی کے اندھیروں میں بے خوف و خطر آگے بڑھنا ان کے نزدیک زندگی کی دلیل تھی۔ اُن کی زندگی کا سارا تجربہ اُن کا مقصد، اُن کا نقطۂ خیال، ان لفظوں سے صاف عیاں ہے:

"میں آپ کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ جوان رہیں۔ میری طرح بوڑھے نہ ہوں۔ اس دُعا کو کوئی معمولی یا ناممکن بات نہ سمجھیں ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے۔ بے شک: جوانی لوٹ کر نہیں آتی، وُہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی قائم رکھنے

کے لئے بلند مقصد ہونا چاہئے۔ مقصد سے زندگی بنتی ہے، بڑھتی ہے اور قائم بھی رہتی ہے۔ جوانی کوئی چوڑے چکلے سینے، کسے ہوئے ڈنڈ اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڑھاپا سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں آتا۔ جوانی ہمت و عزم سے ہوتی ہے، جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہو ــــ"

بابائے اردو کی ذات درحقیقت ایک فرد نہیں، ایک مستقل ادارہ تھی جس سے ہزاروں افراد کی تربیت اور شخصیتوں کی تعمیر ہوئی۔ دنیا کی کوئی قوت انہیں اُن کے خیالات کے اظہار سے نہ روک سکی۔ پچھلی ایک صدی کی روایات پر مشتمل اُن کی شخصیت ہماری قومی زندگی کے محرکات میں سے ایک تھی؛

زمانہ جب بھی لکھے گا زمان کی تاریخ
ترا خلوص، ترا نام جگمگائے گا!

کے مصداق بابائے اردو، لفظ "اردو" سے منسلک اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک یہ زبان زندہ و تابندہ رہے گی۔ اور حیاتِ جاوداں اس زبان کا مقدر ہے!! مولوی عبدالحق ہم میں نہ رہے لیکن اُن کا نام، اُن کا کام، اُن کی علمی و ادبی خدمات، ان کی انسانیت و شرافت، اُن کا ایثار، اُن کا حلم و انکسار، اُن کا تمکنت و وقار، اُن کا اخلاص، اُن کی ہمدردی، مروت، محبت، شفقت اور سادگی، اُن کی بے نیازی، بردباری اور بے ریائی، اُن کا ضبطِ نفس، اُن کی عالی ظرفی، بلند نظری ان کے عزم صمیم اور اُن کی مستقل مزاجی کے نقوش اتنے گہرے ہیں کہ زمانے کی ہوا ان کا رنگ اُڑا نہیں سکتی۔

---

"اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے"

ــــ گاندھی

○

"مولوی صاحب نے قدیم دکنی مخطوطات کی تلاش پر خاص توجہ بلکہ مشقت مبذول کی ۔ بے پایاں شوق جستجو ہی سے اُن "دفینوں" تک رسائی ہوسکتی تھی مگر انھیں کھود نکالنے سے بھی دشوار مرحلہ ان کی نیم مُردہ زبان کے معنی نکالنا تھا۔ نُصرتی، وجہی، قلی قطب شاہ جیسے کتنے ہی اَدبی کواکب گہنائے پڑے تھے۔ مولوی صاحب کی تحقیق و تَرَصُّد نے ان کے نام اور کلام کو دُوبارہ چمکایا۔ زبان کی عمر کئی صدی بڑھا دی۔ عہدِ مُغلیہ سے کہیں پہلے اِسے بولتے، گیت گاتے سُنا دیا۔ ... دکنیّات کے احیاء کی طرح شعرائے اُردو کے بھولے بسرے تذکروں کی اشاعت ہماری زبان پر جناب مولوی صاحب کا ایک اور عظیم احسان ہے جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ یہ قلمی ستون بہت کمیاب اور بعض بالکل بے نشان ہوگئے تھے۔ (ان) ... تذکروں کو نسیان کے طاقوں سے اُتارنا اور ناقدانہ تصحیح کے ساتھ اہلِ شوق کے ہاتھوں تک پہنچانا زبان پروری کا یادگار کارنامہ ہے ۔۔۔"

۔۔۔۔ سیّد ہاشمی فرید آبادی

عذرا کیفی

# مولوی صاحب کے کارنامے

مولوی عبدالحق کے نام کے ساتھ ہی ایک ایسے تابناک ہیرے کا تصوّر ذہن میں اُبھرنے لگتا ہے جس کا ہر رُخ اپنی آب و تاب میں بے مثال ہو۔ اُردو ادب میں سَر سید کے بعد تنہا اُن کی شخصیت ایسی ہے، جس میں بیک آن تبصرہ نگاری، تنقید و تحقیق، سیرت نگاری اور مقالہ نویسی کی گوناگوں صلاحیتیں موجود تھیں۔ اُردو زبان کی تاریخ میں ایسے مصنّف کی تعداد بہت زیادہ نہیں جو ایک ہی وقت میں مختلف اصنافِ ادب پر یکساں قادر رہے ہوں اور ان کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہوں۔ کم از کم اِس دَور میں تو صرف مولوی عبدُالحق کی ذات ہی ایک ایسی ذات ہے، جسے جامع حیثیات اور جامع صفات کہا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب کے اَدبی کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد ہر شخص یہ حقیقت تسلیم کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مولوی صاحب یقیناً ایک عظیم و کامیاب فن کار ہیں۔ اُن کے کارناموں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دنیا بھر کا علم و ادب مولوی صاحب میں سمٹ آیا ہو۔ اُنھوں نے جب بھی قلم اُٹھایا ہے۔ بھر پور اُٹھایا ہے مولوی صاحب کی علمی و اَدبی عظمت کا اندازہ نیاز فتحپوری کے چند جملوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے متعلق کم سے کم جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" زیادہ سے زیادہ کے لیے کوئی لفظ نہیں"

مولوی عبدالماجد دریابادی مولوی صاحب کی خدمات پر تبصرہ فرماتے ہیں :-

" آپ کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرنا بہت دشوار ہے اردو کی خدمات تو کم و بیش ایک عرصے سے بے شمار اردو کے محسنوں نے کی ہیں لیکن مجموعی طور پر اگر کسی ایک کو محسنِ اعظم کا لقب دیا جا سکتا ہے تو وہ ذات بلا اختلاف بابائے اردو مولوی عبدالحق ہی کی ہو سکتی ہے "

اِن اقوال کی روشنی میں جب ہم بابائے اردو کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ سب سے ممتاز نظر آتے ہیں ۔ تبصرہ نگاری کے میدان میں دیکھئے اُن کے ہمعصر پنڈت کیفی، پروفیسر محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی، اور عبدالماجد دریابادی یقیناً اردو ادب کے درخشندہ ستارے ہیں لیکن مولوی صاحب کی شانِ انفرادیت یہاں بھی پوری طرح نمایاں ہے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی مولوی صاحب کا موازنہ اُن کے ہم عصر تبصرہ نگاروں سے کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب " اردو تنقید کا ارتقاء " میں فرماتے ہیں :-

" اِن سب محققین میں سے ڈاکٹر عبدالحق نے خصوصیت کے ساتھ اِس طرف توجہ کی ہے ۔ بے لاگ تبصرہ کاری میں وہ اور اُن کا رسالہ " اردو " جس میں اُن کے تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں ان دونوں کو اہمیت حاصل ہے ۔ ڈاکٹر عبدالحق اپنی تبصرہ نگاری میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں ، اور زیر تبصرہ کتاب پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ کتاب پڑھے بغیر بھی اس پر گفتگو کی جا سکتی ہے ۔ سب سے بڑی خصوصیت ان کی تبصرہ نگاری کی یہ ہے کہ وہ بے لاگ رائے دیتے ہیں ۔ "

یہ صاف گوئی اور بے باک نگاری یقیناً ایک عظیم فن کار کی پہچان ہے اور مولوی صاحب اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں ۔ سر سید احمد خان مرحوم اور مولوی

صاحب کی ان سے ارادت محتاجِ بیان نہیں۔ مولوی صاحب سر سید احمد خان کی صلاحیتوں کے اِس قدر مدّاح ہیں کہ وہ انہیں "امامِ وقت" کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن یہ محبت، یہ عقیدت اُن کی صاف گوئی اور بے باک نگاری پر غالب نہیں ہونے پائی۔ سر سید احمد خان پر تبصرہ کرتے ہوئے کس قدر صاف گوئی سے فرماتے ہیں: "مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سر سید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا منشا کیا تھا اور اُن کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا لیکن یہ بلا آئی ان ہی دنوں اور اُن ہی کی بدولت۔"

اسی طرح اپنی کتاب "چند ہم عصر" ہی میں مولوی سید علی بلگرامی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مرحوم شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حُبِ جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو اُن کی شان کے شایان نہ ہوتی تھیں۔"

مولوی صاحب کی سادہ و پُر خلوص فطرت کا یہ مخصوص جوہر جسے ہم حق گوئی و بے باکی کے نام سے یاد کر رہے ہیں، صرف اُن کی تصانیف تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اُن کے خطوط سے بھی اِس کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان میں رہ کر اور ایک ایسے دور میں جبکہ ہر طرف خون ریزی کا دَور دَورہ تھا، ہندوؤں کا دورِ اقتدار تھا، مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی گاندھی جی کو ایک تاریخی خط میں کس بے جگری سے تحریر فرماتے ہیں: "جب اچھی طرح قتل و خون ریزی، غارت گری، تباہی اور بربادی ہو چکتی ہے تو اس کے بعد آپ ان مقامات پر تشریف لے جاتے ہیں۔ بڑے اہتمام سے عبادتی جلسے منعقد کرتے ہیں، اور مختلف ترکیبوں سے خاص فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کہنے کو تو عبادتی جلسے ہیں لیکن دراصل یہ بھی سیاسی چال ہے۔" مولوی صاحب گاندھی جی کے رویّہ کی مزید نقاب کشائی فرماتے ہیں: "جو نصیحت آپ مسلمانوں کو کرتے ہیں، آپ نے پاکستانی ہندوؤں کو بھی کی یا اُن کے لیے وفاداری لازم نہیں۔ کبھی آپ نے ہندوؤں سے ہتھیار حوالے کرنے کے لیے فرمایا؟ حالانکہ ہندوؤں سے ہتھیار لینے کی زیادہ ضرورت ہے۔"

اس خط میں مولوی صاحب کے جذبات، حق گوئی و بے باکی کا اندازہ اس جگہ کچھ اور بھی زیادہ ہوتا ہے فرماتے ہیں:" آپ صاحبوں نے وفاداری کی رٹ لگا رکھی ہے یہ آپ کا وظیفہ ہو گیا ہے جس کا موقع بے موقع وردِ کیا جاتا ہے۔ آخر یہ وفاداری ہے کیا بلا؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان جو ہندوستان میں آباد ہے آپ کو یہ لکھ کر دے دے کہ میں پاکستان سے ہمدردی نہیں رکھتا بلکہ اس کا مخالف ہوں۔ میری زبان ہندی ہے، اور میرا رسم الخط ناگری ہے فارسی نہیں۔ میں اپنی زبان اور کلچر کا کبھی مطالبہ نہیں کروں گا۔ میں گائے کی قربانی جائز نہیں رکھوں گا۔ مسجد کے سامنے باجا بجانے اور رقص کرنے پر مجھے اعتراض نہ ہوگا۔ ترنگے جھنڈے کے سامنے ڈنڈوت کروں گا۔ میری قومیت آج سے ہندوستانی ہوگی اس کے علاوہ حکومت جو حکم دے گی اُس کی بلا عُذر تعمیل کروں گا۔"

مولوی صاحب کی بے باکی و حق گوئی جوں جوں وُہ اِس خط میں آگے بڑھتے جاتے ہیں، تیز تر ہوتی جاتی ہے مثلاً" گاندھی جی وفاداری مول نہیں بکتی۔" یا فرماتے ہیں: "اگر آپ نے اپنی روش نہ بدلی اور یہی طریقہ جاری رکھا اور مسلمانوں کو غیر وفادار، غدار، نفتھ کالم کہہ کہہ کر اُن کے دل کو دکھاتے رہے تو آپ کو سچی وفاداری کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔" مجھے آپ سے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان عموماً آپ کے رویّہ سے خوش نہیں۔" یہ جرأت، یہ بے باکی و حق گوئی مولوی صاحب اور صرف مولوی صاحب ہی کا حصہ ہے چلتے چلتے مولوی صاحب کی تیغِ قلم کی برِش کا ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمایئے۔ حامد اللہ افسر میرٹھی کی کتاب" نقد الادب" پر کیا بھرپور تبصرہ فرمایا ہے اور صرف چند الفاظ میں فرماتے ہیں:

"جناب حامد اللہ صاحب کی یہ مختصر کتاب" باسل ورس فورڈ" کی تالیف کا چربہ ہے۔" فرمایئے ہے کوئی جواب اِس صاف گوئی کا۔ دراصل یہی وُہ بے باک تبصرہ نگاری ہے جو مولوی صاحب سے پیشتر اُردو میں قطعاً نایاب تھی اور جس کی افادیت سے کسی تنگ نظر ہی کو انکار ہو سکتا ہے۔

بقول کلیم الدین احمد۔" تبصرہ تنقید کی ایک شاخ ہے۔" مولوی صاحب کے یہاں یہ تنقیدی پہلو بھی موجود ہے، جو اُن کے مندرجہ بالا صرف ایک ہی جملے سے ظاہر ہے۔

مولوی صاحب کے یہاں ہر لفظ بر محل، ہر جملہ نپا تلا ہے جس سے اُدب کی فضیلت بڑھ جاتی ہے۔ جب تک ہر بات کو دلائل کی کسوٹی پر نہیں پرکھ لیتے فیصلہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے فیصلے صحیح، تنقید و تبصرہ بے لاگ اور غیر جانب دار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ سابق صدر شعبۂ اُردو پنجاب یونی ورسٹی مولوی صاحب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "مولوی صاحب کے بارے میں چند رسمی الفاظ کہہ کر سبکدوش ہو جانا بعید از قیاس ہے۔ اُن کے عظیم محققانہ کارناموں اور اُردو پر احسانات کے سرسری سے تذکرے کے لیے صدہا صفحات ناکافی ہیں۔" آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں: "بابائے اُردو نے تحقیق کا ایک بلند معیار قائم کیا ہے۔"

تنقید و تحقیق کی دنیا میں مولوی صاحب بڑی حد تک حالیؔ کے نظریات و خیالات سے متاثر ہیں۔ مثلاً ہمدردی، خلوص، سادگی و سلامت اور کام کرنے کی سچی لگن وغیرہ۔ لیکن ان کو حالیؔ کی صدائے بازگشت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ ایک حیثیت سے قدرے مختلف ہیں۔ حالیؔ مغربی اَدبیات سے پوری طرح واقف نہیں تھے لیکن پھر بھی وہ مغربی اَدب سے بہت زیادہ متاثر اور اس کی تقلید کے خواہاں نظر آتے ہیں اس کے برخلاف مولوی صاحب مغربی اَدبیات سے پوری طرح واقف ہیں اور ساتھ ہی مشرقی علوم پر بھی ان کو کامل دستگاہ حاصل ہے۔ لیکن اس معلومات کا لطیف و نازک ترین پہلو یہ ہے کہ مولوی صاحب دونوں کا مزاج بھی پہچانتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرقی ادب، مشرقی ادب ہے۔ اس کا اپنا ایک الگ مزاج ہے۔ وہ حالیؔ کی طرح مغربی دھاروں کے ساتھ بہتے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تنقیدوں میں مشرقی رنگ کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ بقول کلیم الدین احمد "اُن کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے۔" وہ مشرقی ادب کو مشرقی معیار پر ہی پرکھتے ہیں۔ اس

کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وُہ قدامت پسند نقاد ہیں۔ وُہ مشرقی اُصولوں سے کام لینے کے علاوہ مُناسب موقع پر مغربی تنقیدی اُصولوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ اِس سے یہ بات بالکل صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ مولوی صاحب مولانا حالیؔ سے متاثر تو ضرور ہیں لیکن مقلد نہیں۔ وُہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کے نظریات سائنٹیفک ہیں۔ اگرچہ مولوی صاحب نے نظریاتی طور پر کوئی مُستقل کتاب تنقید پر نہیں لکھی لیکن اُن کے خطبات، مُقدّمات، تبصرے، مقالے مضامین وغیرہ اُن کی تنقید کی بہترین مثالیں ہیں۔

مولوی صاحب تنقید میں دو باتوں کو خصوصیت کے ساتھ مدِنظر رکھتے ہیں۔ "مسدّس حالی" پر جو مقدّمہ مولوی صاحب نے لکھا ہے، اُس میں یہ دونوں پہلو پوری طرح نمایاں ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ دو پہلو کون سے ہیں جو مولوی صاحب کو دیگر نقادوں پر اوّلیت بخشتے ہیں۔ دراصل مولوی صاحب تنقید کرتے وقت اُفتادِ طبع اور ذہنی رُجحان کا اندازہ کرنے کی خاطر ماحول اور ذاتی زندگی کا ضرور پتہ لگاتے ہیں۔ "مسدّسِ حالی" پر جو مقدّمہ تحریر فرمایا ہے اس میں مسدّس کے لکھنے کی وجوہ کے سلسلے میں، ہندوستان کا سیاسی و سماجی پس منظر پہلے بیان کیا ہے اِس کے بعد مُفصّل تبصرہ فرمایا ہے۔ مولوی صاحب کے مُقدّمات انھیں نمایاں خصوصیات کی بنا پر اردو ادب میں "بیش قیمت سرمایہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کی تنقید کے سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ وُہ پہلے ایک محقق اور پھر ایک نقاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غور و فکر اور چھان بین مولوی صاحب کی تنقید کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اُن کی تنقید بے لاگ ہونے کے علاوہ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی: "مغربی و مشرقی تنقید کا سنگم ہے۔ خلوص، ہمدردی، وسعت، دوربینی تخیل کی بلند پروازی، احساس کی شدّت اور شعور کی بیداری، اِن سب نے مل کر اُن کی تنقیدات کو بہت بلند کر دیا ہے اور وُہ اُردو تنقید کی دُنیا میں منفرد نظر آتے ہیں۔"

مولوی صاحب کبھی کبھی دورانِ تنقید زبان کی طرف بہت متوجہ نظر آتے

ہیں۔ مگر اس بات کو ان کی تنقید کی خامی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی وجہ سے جزئیات نگاری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ مزید برآں اس تذکرۂ اردو کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اوّل تو وہ ایک ماہر لسانیات ہیں دوسرے انھیں اُردو سے لگاؤ نہیں عشق ہے کیوں کہ اُردو زبان کے اس نازک دَور میں جب کہ بادِ مُخالف کے تیز و تند تھپیڑوں نے اس بیچاری زبان کی نیا کو منجدھار میں ہچکولے کھانے کے لیے چھوڑ دیا تو اِسی بوڑھے مگر جوان ہمت مانجھی نے اپنے عزم و استقلال کی پتوارے کر تن تنہا ان طوفانوں کا مقابلہ کیا۔ یہ ایسے طوفان تھے جس میں نہ صرف غیروں کی بلکہ اپنوں کی تخریبی جد و جہد اور تباہ کن کوشش برابر کی شریک تھیں اور آخر انھیں بوڑھی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی سرگرمیوں نے اُردو زبان کی ڈوبتی کشتی کو ساحلِ مُراد تک پہونچا دیا۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہؔ نے مولوی صاحب کے اس بے لوث جذبۂ خدمت کو بجا طور پر جذبۂ جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "عبدالحق کو تو میں اُن انے گنے مجاہدین ادب میں شمار کرتا ہوں جن کی رہنمائی ہزاروں کو راہ راست پر لائی۔ جن کی کاوش اور جہد متعدد طاقتوں سے نبرد آزمائی میں کامیاب رہی اور اُردو زبان و ادب کے لیے تائید یزدانی ثابت ہوئی۔" مولوی صاحب کا یہ جذبۂ جہاد کچھ ایسی بات ہے جس نے یگانوں کا تو ذکر ہی کیا ہزاروں بیگانوں کے دلوں کو بھی موہ لیا۔ اس کے ثبوت میں اُردو ادب کی مایۂ ناز ہستیوں کے بے شمار حوالے دیئے جا سکتے ہیں۔ کرشن چندر کے چند الفاظ جس طرح مولوی صاحب کے تمام کارناموں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اپنی مثال آپ ہیں وہ لکھتے ہیں "جو کام گاندھی جی نے ہندوستان کے لیے مسٹر جناح نے پاکستان کے لیے کیا وہ کام اُردو کے لیے مولوی عبدالحق نے کر دکھایا۔ بلاشبہ مولوی عبدالحق نے اپنے خون سے اس زبان کو سینچا ہے"۔ آل احمد سرورؔ اپنے خیالات کا اظہار یوں فرماتے ہیں: "میری نظر سے بہت سے محقق، نقاد، انشا پرداز گزرے ہیں مگر اُردو کا ایسا عاشق نظر سے نہیں گزرا۔" مولوی صاحب کی خدماتِ اُردو سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اُن کے خطبات کو کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے۔ انھیں پڑھ کر ہمیں نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کس طرح بنی، کن کن مراحل سے گزری بلکہ ہند و پاک کی سیاسی و سماجی تاریخ بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ خطبات اُردو زبان کے جہاد کی

داستان ہیں جس میں اغیار کی صف آرائیوں کے بالمقابل تنہا مولوی صاحب اپنے خطبات کے درمیان ایک مردِ غازی کی طرح کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں مولوی صاحب ہندوؤں کے عظیم ترین رہنما گاندھی جی تک سے ٹکرا گئے۔ ان سے بھی بڑی تلخیوں تک نوبت پہونچ گئی جس کا ذکر اُوپر کہیں گزر چکا ہے۔ لیکن بابائے اردو نے انھیں بھی اس طرح قائل کیا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا عبدالحق صاحب نے اُردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔" مولوی صاحب کے یہ خطبات تاریخی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بہت کچھ ہے مثلاً زبان اُردو کہاں عالم وجود میں آئی۔ کہاں پروان چڑھی، کن کن موانعات سے دوچار رہی اور کن لوگوں نے اِسے آگے بڑھانے میں مدد دی۔ یہ تمام حقائق مولوی عبدالحق صاحب کے خطبات سے بہ آسانی معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

مولوی صاحب کی خدمات کو جن کے بارے میں خود ان کا خیال ہے"۔اُردو کی خدمت کرنا اور اِسے فروغ دینا عبادت ہے" کہاں تک بیان کیا جائے، جو شخص اپنی محبوب زبان کی خدمت کو بہ منزلۂ عبادت سمجھتا ہو، اسے ایمان جانتا ہو، اُس کے خلوص میں کسی کافر ہی کو شک ہو سکتا ہے تاہم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رائے بھی ملاحظہ فرما لیجئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں،" قوموں کی زندگی میں زبان جو اہمیت رکھتی ہے وُہ اربابِ نظر سے مخفی نہیں۔ یہی وُہ سانچہ ہے جس میں خیال ڈھلتا ہے اور خیال ہی وُہ مسالہ ہے جس سے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے علم برداروں میں ایسے بہت کم تھے جنہوں نے اِس راز کو سمجھا کہ سیاسی آزادی ذہنی آزادی پر موقوف ہے اور ذہنی آزادی کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے خیالات و جذبات کی ترجمان خود ہماری زبان ہو۔ اس مقصد کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے والا ایک ہی شخص نکلا۔ آج اُردو زبان کو نہ صرف مشرقی علوم بلکہ مغربی علوم سے بھی مالا مال کر دیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہے۔ اور ایشیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ اُن تحریکوں کا نتیجہ ہے جس کی روحِ رواں مولوی صاحب کی ذات ہے۔" جامعہ عثمانیہ، سررشتۂ تالیف و ترجمہ" ان ہی کے خواب کی تعبیر اور" انجمن ترقیٔ اردو" ان ہی کے دست و بازو کی تعمیر ہے۔" ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رائے کا ایک ایک حرف

صداقت پر مبنی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مولوی صاحب نے اُردو کی پرورش کے لیے اپنے دن رات ایک کر دیئے۔ ایک ایک لمحہ اس کے لیے وقف کر دیا، اور آج "ایک جان دو قالب" کی مشہور ضرب المثل کے برخلاف مولوی صاحب اور اُردو "ایک جان ایک قالب" بن چکے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ذہنی بلکہ مالی سرمایہ بھی اس پر دل کھول کر صرف کیا۔ جب انجمن ترقی اُردو کو مالی امداد کی ضرورت پڑی تو مولوی صاحب نے اپنا کل سرمایہ اس کی نذر کر دیا۔ مولوی صاحب کے اس عمل، اُن کی اِس جرأت نے سب کو حیرت میں ڈال دیا، اور ہر طرف سے یہ صدائیں آنے لگیں "مولوی صاحب نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ آخر وہ اپنا ذاتی روپیہ اس قدر بے دردی سے کیوں صرف کر رہے ہیں؟" — مولوی صاحب دُنیا کی اس ہمدردی سے بالکل خوش نہیں ہوئے بلکہ جھنجلا اُٹھے اور پھر جو جواب انہوں نے اس سلسلے میں دیا وہ صرف انہیں کا کام تھا، بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا کام! اُنھوں نے فرمایا۔ "یہ تم نے کیا کہا میں اپنا ذاتی روپیہ بیدردی سے کیوں خرچ کر رہا ہوں؟ تمہارے بھائی یا بچے پر خدا نخواستہ کوئی آفت پڑے تو کیا تم اُس کی مدد نہ کرو گے؟ اور کیا ایسے وقت میں تم روپیے کا منہ کرو گے؟ میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہوگیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جُدا نہیں سمجھتا اور انشاءاللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قائم رہے گا خواہ میں سکریٹری رہوں یا نہ رہوں۔" کس قدر عظیم و پر خلوص ہے مولوی صاحب کا یہ عہد۔ ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ملے گی —

> پاکستان آنے کے بعد "اردو کالج" کا قیام اپنی نوعیت کا ایک ہی کارنامہ ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر "اردو یونی ورسٹی" کی تجویز ہے، جو مولوی صاحب کے عزم اور انتھک کوششوں کی بدولت بہت سے مراحل طے کر چکی ہے، اور عنقریب ہی اس کا قیام نہ صرف ایشیا بلکہ تمام عالم کو متحیر و متعجب کر دے گا۔

مولوی صاحب کی علمی و ادبی اہمیت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ آپ کے ادبی کارنامے بے شمار ہیں۔ سیرت و کردار نگاری کے سلسلے کی ایک عظیم کڑی اُن کی کتاب "چند ہم عصر" ہے۔ اس تصنیف میں صرف اُس دور کی محترم و مقتدر ہستیاں ہی نظر نہیں آتیں یا مولوی

صاحب کی نگاہِ دور رس محض محلوں تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ان کی نظرِ انتخاب جھونپڑی کے چھپے ہوئے ہیروں تک پہونچتی ہوئی نظر آتی ہے جو مولوی صاحب کی عظمت، انسان دوستی، اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔ ہمارے ادب میں ایسے شاہکار نایاب ہیں کیونکہ ہمارے ادیبوں کی تنگ نظری تملق پسندی زمانے کی شہرت یافتہ شخصیتوں یا صاحبانِ زر و اقتدار ہی کے گرد گھومتی ہے یہ لوگ انھیں کو اپنی فکر و نظر کا محور و مرکز سمجھتے ہیں جس کے برعکس مولوی صاحب رنگ و نسل کے امتیاز سے کوسوں دور ہیں۔ وُہ انسانیت کے علم بردار ہیں۔ وُہ اسی دنیا میں رہتے ہیں اور اسی دنیا کے ہر شخص کو بلا تخصیص اپنی فکر کا موضوع و مرکز سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسانی عظمت کسی کی میراث نہیں۔ وُہ اسی کو عظیم جانتے ہیں جو انسانی خصوصیات سے متصف ہو۔ "نام دیو مالی" اور "نور خاں" گو آج دنیا میں نہیں مگر "چند ہم عصر" کے خالق کے قلم کی ہلکی سی جنبش نے اُنھیں ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی دے دی۔ ایسے کرداروں پر اس قدر تفصیلی تبصرہ مولوی صاحب کے بے پناہ خلوص، ان کی گہری ہمدردی عمیق مشاہدے نیز تلاش و کاوش کا پتہ دیتا ہے۔ "نام دیو مالی" کی شخصیت کو انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کو بلا واسطہ ایک ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ ایسی ہمدردی جو جذبۂ انسانیت کے سارے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیتی ہے، جس کی صدائے بازگشت تادیر روح کی پہنائیوں میں گونجتی رہتی ہے انسانی زندگی کا مطالعہ کیونکہ بغیر ہمدردی کے ناممکن ہے لہٰذا ایسے زندہ جاوید شاہکار ایسے ہی عظیم فنکار کی چابکدستی سے ظہور میں آسکتے ہیں جس کے سینے میں انسان کا دل دھڑک رہا ہو اور جس نے انسان کو انسان ہی کی حیثیت میں بہت قریب سے دیکھا ہو۔ لیکن مولوی صاحب کی ہمدردی اُن کی حقیقت نگاری و صاف گوئی پر حاوی نہیں آتی انھیں خواہ کسی سے کتنی ہی عقیدت و اُنسیت کیوں نہ ہو وُہ جس طرح اُس کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اسی طرح بہت صفائی اور غیر جانب داری سے اُس کی کمزوریاں بھی بیان کر جاتے ہیں۔ یہی وُہ جذبہ ہے جو اُن کی تبصرہ نگاری میں بھی صاف صاف جھلکتا ہے اور جس کا ذکر تبصرہ نگاری کی ضمن میں وضاحت کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

ایک اچھے سیرت نگار کے لیے ضروری ہے کہ وُہ ایک اچھا انشا پرداز و مصور بھی ہو۔ مولوی صاحب نے سیرت نگاری میں صحیح مصوّری کا حق اُدا کر دیا ہے۔ سیرت

نگاری کی سادہ تصویر میں اپنے قلم کی جنبشوں سے ایسے رنگ بھرے ہیں کہ یہ تصویریں چلتی پھرتی، ہنستی بولتی نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی اُن کی انشار پردازی کا ایک کمال یہ ہے کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے یوں محسوس کرنے لگتا ہے گویا وُہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ مولوی صاحب کے یہاں اس مُرقع نگاری کے پس پردہ کوئی نہ کوئی افادی پہلو بھی نظر آتا ہے۔ مثالی انسانوں کی عکاسی کا مقصد انسانی کرداروں کی اصلاح کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

بعض کرداروں کے پردے میں مولوی صاحب خود صاف جھلکتے نظر آتے ہیں۔ نام دیو مالی کے کام کی گہری اور سچی لگن، نور خاں کی اُصول پرستی مولوی صاحب کے اپنے کردار کی جھلک ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کی تصویر کسی رُخ سے اٹھا کر دیکھئے یہ اپنے ہر انداز سے پرانے دور کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ بھلا آج کل ایسے مخلص ایسے صادق لوگ کہاں ہیں۔

مولوی صاحب کی عبارت میں سادگی، دلنشینی، تاثیر، پختگی، متانت، اعتدال پسندی، حقیقت نگاری، استقامت، روشن دماغی، کشادہ دلی، گہرائی اور گیرائی کے علاوہ جگہ جگہ ظرافت کی رنگ آمیزیاں بھی نظر آتی ہیں۔ سادگی و شگفتگی نیز دلچسپی اُن کی تحریر کی خاص خوبیاں ہیں۔ انتشارِ ذہنی اور خیالات کا ہجوم کبھی قلم پر طاری نہیں ہوتا۔ ثقیل و مشکل الفاظ اور مشکل عبارت لکھنے کے سخت خلاف ہیں جیسا کہ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں دکن میں آسان زبان لکھنے کے سلسلے میں خود فرمایا۔ "ہم کیوں لکھتے ہیں۔ اس لیے تاکہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہونچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جبکہ تحریر آسان زبان میں ہو اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ اسے شوق سے پڑھ سکیں اگر مشکل زبان میں ہوگی تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔"

اسی مشکل پسندی کی مذمت کرتے ہوئے اسی تقریر میں آگے چل کر مولانا ابوالکلام آزاد پر جو بے باکانہ تبصرہ فرمایا ہے اُس سے نہ صرف حقیقت پسندی بلکہ ان کی ظرافت کا بھی اندازہ ہوتا ہے فرماتے ہیں۔" مشکل پسندی کا دوسرا دور

اس وقت آیا جب مولوی ابوالکلام آزاد کا "الہلال" اُفقِ صحافت پر نمودار ہوا، اور اس کے بعد اُنھوں نے "البلاغ" جاری فرمایا۔ حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا چندے کے لیے "بدلِ اشتراک" ایڈیٹر کے لیے "مدیر مسئول" اور اسی قسم کی ناہموار اور غیر ضروری ترکیبیں رائج فرمائیں۔ انتہا یہ کہ اپنے اِسمِ شریف کو بھی عربی کا لباس پہنا دیا یعنی "احمد المکنی بہ ابی الکلام الدہلوی" لاحول ولاقوۃ۔ یہ اُردو ہے یا اُردو دشمنی۔"

مولوی صاحب کے علمی وادبی کارناموں میں اُن کی "اردو قواعد" کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ اُردو زبان و اردو ادب کی ترقی و نشو و نما کے لیے اُنھوں نے جو کچھ کیا یقیناً اُس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ واقعی یہ اُنھیں کی جواں ہمتی، سعیِ پیہم اور بلند عزائم کی بدولت آج ہماری زبان کا دامن نئی نئی اصلاحات اور نئے نئے الفاظ کے کبھی نہ مُرجھانے والے پھولوں سے مالا مال ہے۔ اُنھوں نے اُردو کی تنگیٔ داماں کا علاج کیا اور اس کو وہ وسعت بخشی کہ آج وہ ادب کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بن گئی۔ دُنیائے نثر ہو یا جہانِ نظم آج سب پر اُردو زبان کی حکمرانی ہے۔ وہ آج ہر مکتبِ خیال کی ترجمانی کے فرائض سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ سب کچھ ایک مولوی عبدالحق صاحب کے خلوص اور انتھک محنتوں کا پھل ہے۔ اُنھوں نے اسے وہ اسلوب بخشا جسے بقول رشید احمد صدیقی" اُردو ادب کا بنیادی اسٹائل کہہ سکتے ہیں اس اسٹائل نے اُردو کو دنیا کی مشہور اور اہم زبانوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا ہے۔" مولوی صاحب کے اندازِ تحریر نے بہت سے ادیب اور فنکاروں کو جنم دیا اور ان کی رہنمائی کی، جس کا اعتراف فراق گورکھپوری کے الفاظ میں دیکھیے۔" بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یاد ہند و پاک میں لوگ آسانی سے فراموش نہ کر سکیں گے۔ خود مَیں نے اُن کی تحریروں سے ادبیات کا درس لیا ہے۔ اُن کی نثر میرے لیے اور مجھ سے کئی اوروں کے لیے چراغِ راہ رہی ہے کاش مجھے یہ توفیق ہوئی ہوتی کہ کچھ عرصے تک اُن کے قریب رہ کر اپنے ذوقِ ادب پر احسان کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب نے جو کچھ کیا وہ ایک بڑی جماعت کا کام ہے۔

آمنہ صدیقی

# مولوی صاحب کا مرتبہ

زبان کسی ملک یا قوم کا سب سے اہم ثقافتی مظہر ہے۔ یہ انسانی خیالات و جذبات کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں صدیوں کے ان گنت تجربات، مفاہیم و معانی کے نئے نئے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہ انسان کی سماجی تگ و دو اور ثقافتی جد و جہد کی ایک زندہ و متحرک تاریخ ہے۔ اس کے دامن میں وہ سب کچھ ہے جسے انسان نے حاصل کرنے کی تمنا کی، جس کے لیے وہ کوشاں ہوا اور جسے آخر کار اس نے حاصل کر لیا۔ یہ انتقالِ مطالب کا ذریعہ ہی نہیں انکشافِ مضمرات کا وسیلہ بھی ہے۔ اس کا دامن بڑا وسیع ہے، جس کا ایک کنارا ازل سے اور دوسرا ابد سے ملا ہوا ہے۔ زبان تہذیب کی آئینہ داری ہی نہیں کرتی بلکہ آئینۂ تہذیب کو جِلا بھی بخشتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی ملک یا قوم کی ترقی کا اندازہ اس کی زبان سے کیا جاتا ہے۔

> ترقی یافتہ زبان صرف وہی نہیں ہوتی جس میں الفاظ کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہو یا جس کے بولنے والے بہت زیادہ ہوں، بلکہ اصل ترقی یافتہ زبان وہ ہے کہ جو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی سکت رکھتی ہو اور جسے وقت کی صداؤں سے ہم آہنگ ہونے کا سلیقہ آتا ہو۔

دوسرے لفظوں میں یہی بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ ترقی یافتہ زبان اُسے کہتے ہیں جس میں جہانِ معنی کے ہر پہلو کو بے نقاب کرنے کی سکت ہو۔

زبان سماجی ضروریات کی تابع ہوتی ہے، الفاظ و معانی کا تعلق ریاضی کے کلیوں کی طرح غیر تغیر پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس میں نشیب و فرازِ زمانہ سے متاثر ہوتے رہنے

کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس کا مقام کوچوں، گلیوں اور بازاروں میں نہیں ہوتا لسانیات کی تاریخ میں ہوتا ہے۔

اُردو ایک ایسی ہی زبان ہے، جسے سماجی ضرورتوں نے جنم دیا، کوچوں، گلیوں اور بازاروں نے اپنایا اور وقت نے اِسے اپنے ساتھ ساتھ چلنے کا سلیقہ سکھایا۔

یہ دُنیا کی جدید ترین زبانوں میں سے ہے اور اِسے موجودہ شکل وصورت حاصل کئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اِس زبان کے بنانے اور سنوارنے میں مختلف تہذیبوں اور قوموں نے حصّہ لیا ہے، اِسے ہم انگریزی، فرانسیسی یا چند ایک دوسری زبانوں کی طرح بہت ترقی یافتہ تو نہیں کہہ سکتے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسے ترقی یافتہ زبانوں کے زمرے سے علاوہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس کی وسعت کو دیکھنا "حیرتی جلوہ" بنا دینے کے لیے کافی ہے ---

اِس زبان کی ترویج واشاعت میں جن لوگوں نے مختلف طریقوں سے حصّہ لیا، اُن کا تذکرہ اس مختصر سے مضمون میں نہ تو کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے، کیوں وہ تمام لوگ اُردو کے معمار ہیں۔ جنھوں نے اظہار و بیان کی ضرورتوں کے لیے اس زبان کو اپنایا، اور جن کی فہرست بہت طویل ہے۔

کسی زبان کی " خدمت " کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُس زبان کے علمی وادبی سرمائے میں اضافہ کیا جائے۔ یہ کام شاعروں اور ادیبوں کا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ زبان کی نشر واشاعت اور ترقی کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے اور اس شعور کو عام کیا جائے کہ زبان سے تغافل برتنا خود اپنے مفاد کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کام اُن لوگوں کا ہے۔ جو زبان کی ثقافتی اہمیت سے واقف ہوں اور اسے ملک و قوم کی ترقی میں ممدومعاون بنانے کی ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہوں۔ پہلی صورت سے جن لوگوں نے اُردو زبان کی خدمت کی ہے اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مگر دوسری صورت سے سامنے آنے والے دو چار ہی ہیں اور ایسے اور بھی کم ہیں۔ جنھوں نے دونوں صورتوں

سے زبان کی خدمت کی ہو۔ کم کیا صرف ایک!!!

o

دُنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں، کسی عہد میں بھی کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی کہ جس نے تمام زندگی زبان کی خاطر معرکہ آرائیوں میں صرف کر دی ہو۔ یہ فخر صرف اُردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ اسے عبدالحق جیسا سپاہی میسّر ہے جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ اس پیر جواں ہمت نے اس مقصد کے لیے کبھی اپنوں کی جفائیں سہیں اور کبھی غیروں کے ستم، مخالفتوں کے ایسے ایسے خارزاروں میں قدم رکھا کہ جہاں رہ نوردی کی داد ملی بھی تو آبلہ ہائے پا سے، مگر اس جواں ہمت اور عظیم انسان کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش پیدا نہ ہوئی اور وہ حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر مردانہ وار آگے بڑھتا چلا گیا۔

"عبدالحق" اور "اُردو" مترادف نہیں مرادف الفاظ ہیں،
اُردو کا عبدالحق کے بغیر اور عبدالحق کا اُردو کے بغیر
تصوّر کرنا محال ہے۔

o

مولوی عبدالحق کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے انھوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت مختلف طریقوں سے کی۔ کبھی وہ اس زبان کے سپاہی بن کر مخالفت کے مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ کبھی وہ اس کے سفیر بن کر گھر گھر اس کا پیغام پہنچاتے رہے۔ کبھی انھوں نے خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا اور کبھی انشاپردازی کے بل پر ذہنوں کو جلا بخشی۔ زبان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قواعد، صرف و نحو اور لغات کی طرف توجہ کی، تعلیمی ضروریات کے لیے نصابی کتابیں تیار کیں اور کروائیں۔ قدیم ادبی سرمائے کو گم نامی سے نکال کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔ تحقیق و تنقید کی راہوں پر نئے نئے چراغ جلائے۔ قوم کو زبان سے دل چسپی لینے کا ڈھنگ سکھایا۔ علم کی عام اشاعت کے وسائل کو وسعت دی۔ الغرض وہ سب کچھ کیا جو ایک عظیم ثقافتی رہنما کو کرنا چاہیئے —— وہ یقیناً ایک

عظیم ثقافتی رہنما ہیں۔

O

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ انجمن ترقی اُردو ہے۔ اگرچہ وہ اس کے بانی نہیں ہیں۔ لیکن اس انجمن کی بقا اور ترقی انہیں کی مرہونِ منت ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ:

کسی ادارے نے کامل پچاس سال تک زبان وادب کی ترقی کے لیے کام کیا ہو اس انجمن سے ہندو پاکستان کے بیشتر مشاہیر اہلِ قلم وابستہ رہے ہیں اور اس طرح اس کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ایسے پُرآشوب زمانے میں جب کہ مخالفوں نے اُردو کو ہر طرح سے ختم کرنے کے منصوبے باندھے، انجمن ان کے ارادوں کی تکمیل کے راستے میں جمی رہی جیسے ایک چھوٹی سی ندی کے سامنے کوہِ ہمالہ — حریفوں کے ہر وار کو انجمن نے ناکام بنا دیا اور یہ انجمن کی ایسی کامیاب ہے جو اردو کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی۔

انجمن، اُردو کے دفاع کے لیے ہی سرگرمِ کار نہیں رہی بلکہ اس زبان کی ترویج واشاعت کے لیے بھی اس نے اہم کارنامے انجام دیئے۔ اس سلسلے میں پہلا کام تو یہ کیا گیا کہ ہندوستان کے ہر حصے میں انجمن کی شاخیں قائم کر کے ان کی نگرانی میں اُردو مکتب اور کتب خانے کھولے گئے۔ اس ذریعے سے بہت سے ناخواندہ لوگوں نے اُردو زبان سیکھی اور بعض ایسے علاقوں میں اردو کو پہنچایا گیا جہاں اس سے لوگ بہت کم واقف تھے۔ مثلاً چھوٹا ناگ پور کا علاقہ ایسا ہے کہ شاید ہی مشکل سے ایک آدمی بھی اُردو سمجھ سکتا تھا، لیکن انجمن کی سرگرمیوں کی وجہ سے اس برعظیم کی ایک قدیم ترین قوم میں، ایک جدید ترین زبان پہنچی۔

کسی زبان کے ترقی یافتہ ہونے کا اندازہ دو باتوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کا ادبی سرمایہ مقدار و معیار دونوں کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں مختلف علوم وفنون پر کافی کتابیں ہوں۔ اردو زبان کے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ اس کے دامن میں سب کچھ تھا، لیکن نظروں سے اوجھل تھا۔ تمام ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں تھا۔ انجمن نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اہم ادبی کتابوں کو مرتب کروا کے شائع کیا۔ اس وجہ سے بہت سی اہم

اور نادر کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور اس طرح معلوم ہوا کہ اردو زبان ہندوستان کی علاقائی زبان کی طرح کم مایہ نہیں ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انجمن کے اس اقدام کی وجہ سے اردو ادب اور زبان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اردو گزشتہ ایک دو صدیوں میں پھلی پھولی، لیکن اب یہ تسلیم کیا گیا کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں اردو اس مدّت سے بہت پہلے مروج ہو چکی تھی۔

انجمن نے اردو زبان کی تہی دامانی کو ختم کرنے کے لیے علمی و فنی کتابوں اور عالمی ادبیات عالیہ کے تراجم کی طرف بھی توجہ کی جائیں اور ایک ایسا انگریزی اردو لغت تیار کیا جائے جو مترجمین کی مشکلیں آسان کر دے۔ انجمن نے یہ دونوں کام نہایت جانفشانی سے انجام دیئے۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو وضع کیا گیا اور ایک ایسا انگریزی اُردو لغت تیار کیا گیا جو اپنی نوعیت کا واحد لغت ہے۔ دنیا بھر میں انگریزی اردو کا کوئی دوسرا لغت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لغت کی وجہ سے اردو زبان میں مغربی علوم و فنون کا دروازہ کھُل گیا۔ مترجمین نے اچھّی اچھّی کتابوں کے ترجمے کیئے اور یہ ثابت کر دکھایا کہ جن کتابوں پر دوسری زبانوں کو ناز ہے اردو کا دامن بھی اُن سے تہی نہیں۔

انجمن نے ہر طرح اور ہر انداز سے اردو کی خدمت کی اردو کے لیے اتنا کام کسی ادارے نے نہیں کیا جتنا کہ انجمن نے کیا۔

لیکن ان سب کاموں کے پس پردہ جو شخصیت کارفرما رہی وہ مولوی عبدالحق ہی کی شخصیت تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تمام وسائل انجمن کی نذر کر دیئے۔ ان کی تمام توانائیاں، ان کا تمام سرمایہ، ان کی راتوں کی نیند، ان کی صبحوں کا آرام، غرض ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ان کے سرمائے کا ایک ایک حبّہ انجمن کی نذر ہو گیا۔ انجمن کی رگوں میں انھیں کا خون جوش مارتا رہا اور آج بھی جب کہ وہ نوّے سال سے بھی اوپر ہو چکے ہیں حسبِ سابق انجمن ہی ان کی تمام دِل چسپیوں کا مرکز ہے۔

"انجمن ترقّیٔ اُردو دراصل مولوی عبدُالحق ہی کی ذات کا پَرتو ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ شخصیتیں اِداروں کو بَناتی ہیں نہ کہ ادارے شخصیتوں کو۔ اگر مولوی صاحب انجمن کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تو مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس

کے ساتھ اس کا یہ شعبہ بھی ختم ہو جاتا اور خدا جانے اردو کو مخالفوں کے کیا کیا ستم سہنے پڑتے۔

○

مولوی عبدالحق نے اُردو کی جو خدمت کی ہے اس سے اس زبان کو تو بہت فائدے پہنچے ہیں، لیکن اس سے خود مولوی صاحب کی ذات کو ایک ایسا نقصان پہنچا کہ جس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کی اردو دوستی کی شہرت ایسی ہوئی ہے کہ ان کی شخصیت، کے دوسرے پہلو نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کا کوئی ایک پہلو اس حد تک نمایاں ہو جاتا ہے، کہ باقی پہلو قدرے دب جاتے ہیں، لیکن یہ صورتِ حال ہمیشہ نہیں رہتی، باقی پہلوؤں میں اگر کوئی خاص بات ہوتی ہے تو وہ ضرور نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ مولوی صاحب کی اُردو دوستی نے ان کے ساتھ کچھ ایسی ہی دشمنی کی ہے، اور اس وجہ سے ان کو ایک مفکر کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مولوی صاحب نے زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو سمجھنے سمجھانے کی جو پُرخلوص کوشش کی ہے، اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ذہنی جولانیاں تفلسفِ محض کی پُرپیچ وخم رہ گزاروں سے وابستہ نہیں رہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ انھیں صاحبِ فکر تسلیم نہ کیا جائے۔

> مولوی صاحب نے ایک باشعور انسان کی طرح ان تمام حقیقتوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ جنھیں زندگی کی بنیادی حقیقتیں کہا جاسکتا ہے۔ ان کے مشاہدے، ادراک اور تجربے کا عکس اُن کی بعض تحریروں میں اسطرح نمایاں ہے کہ مطالب و مفاہیم کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اُن کے ہاں کوئی مربوط نظامِ فکر نہیں ملتا، کیوں کہ کسی مسئلے پر انھوں نے تفصیل سے بحث نہیں کی، اس سلسلے میں وہ غالبؔ کے ہم قدم ہیں، وہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیتے فلسفیوں کی طرح ذرا ذرا سی باریکیوں پر توجہ نہیں کرتے بلکہ وہ مسئلے سے متعلق کوئی ایک بنیادی بات

اس طرح سے کہہ جاتے ہیں کہ جس کو ذہن نشین کر لینے سے مسئلے کی ساری پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں۔

اُن کی اَن گنت تحریروں میں بعض ٹکڑے اور جملے ایسے فکر انگیز نظر آتے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ادب کی طرف توجہ نہ کرتے تو وہ یقیناً بہت بڑے فلسفی ہوتے۔ انھوں نے انسان اور اس کے متعلقات کے بارے میں کہیں کہیں ایسی باتیں بھی کہیں ہیں جو صداقت کے تابندہ چہرے سے تہہ در تہہ نقاب اٹھانے میں بڑے معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہاں مولوی صاحب کی مختلف تحریروں سے بہت سے فکر انگیز "نثر پارے" پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن صرف ایک ایسی تحریر کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے جس کی وجہ سے مولوی صاحب کی مفکرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہر دور اور ہر زمانے میں کیا جائے گا — یہ تحریر "معرکۂ مذہب و سائنس" کا مقدمہ ہے، اس میں مولوی صاحب نے نہایت مدلّل انداز سے سائنس اور مذہب کا جائزہ لیا ہے اور اس مفروضے کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ازلی اور ابدی حریف ہیں۔ مولوی صاحب نے موضوع کے تمام پہلوؤں کا عالمانہ جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ انسانی زندگی کو ارتقا کے اعلاترین مدارج تک پہنچنے کے لیے مذہب اور سائنس دونوں کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش پیچھے ہٹنے کے مترادف ہے۔

مولوی صاحب کے نزدیک سائنس یا مذہب ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ ایک دوسرے کے شریک کار ہیں اور دونوں کا مقصد انسان کی خوشحالی ہے۔ مولوی صاحب نے مذہب کی فوقیت کو بھی تسلیم کیا ہے کہ انسان کی مادی ضرورتیں خواہ کتنی ہی بڑھ جائیں۔ اس کی روحانی قدریں پامال نہیں ہو سکتیں اور پھر آخر میں مذہب اسلام کے بارے میں مولوی صاحب نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ انسان کی ترقی اور نجات کا سیدھا اور صحیح راستہ اسی مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے سے نظر آ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بیسوی صدی میں ایسے افراد ان گنت ہیں جو متذکرہ خیالات کو نشانۂ تضحیک بنائیں اور یہ کہیں کہ آج سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ مذہب کو اس کے مقابلے پر لانا رجعت پسندی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ اسی بیسوی صدی میں جب کہ انسان کی مادی ترقی اپنے شباب پر ہے، روحانی قدروں کی افادیت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور سائنسی دُنیا کے بہترین دماغ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ روحانی قدروں کے بغیر مادی ترقی، ترقیِ معکوس کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس مقدمے میں الفاظ کے طوطا مینا نہیں اڑائے گئے بلکہ بحرِ معانی میں غواصی کر کے ایسے ایسے گوہر ہائے نایاب کا سراغ لگایا گیا ہے جن سے مولوی صاحب کی ذہنی بلندیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذہب اور سائنس کا موازنہ ایک بہت ہی "پامال" موضوع ہے، عام طالب علموں سے لے کر ڈریپر جیسے عالم تک، سبھی نے اس مصرعِ طرح پر طبع آزمائی ہے۔ جس زمانے میں یہ مقدمہ لکھا گیا ہے اس وقت تک اس موضوع پر اتنا کچھ کہا جا چکا تھا کہ کوئی نئی بات پیدا کرنا مشکل تھا، لیکن مولوی صاحب نے اس "پامال" موضوع کو اپنے نادر اسلوب اور گہری فکر سے ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کر دیا۔ انھوں نے انسانی فطرت اور اس کے متعلقات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ جذبہ، عقل، ادراک، خیال، احساسات، مادہ، روح، جنس، تمدن، سیاست، ایمان، عقائد، نیچر، علم، محبت، تجربہ، یقین، صداقت اور دوسرے بہت سے بنیادی مسائل پر عالمانہ بحث کی ہے۔ یہ مقدمہ مولوی صاحب کی مفکرانہ صلاحیتوں کا ایک دل کش آئینہ ہے۔ جب تک اُردو زبان موجود ہے یہ آئینہ کبھی دُھندلا نہیں پڑ سکتا۔

ایک مفکر کی حیثیت سے مولوی صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ ادب اور زبان کے مسائل میں بھی اُن کی فکری توانائیاں مضمحل نہیں ہوتیں۔ ادب، تنقید، زبان اور معنویات (SEMANTICS) وغیرہ کے بعض بنیادی مسائل پر اُنھوں نے جو نظریاتی بحثیں چھیڑی ہیں وہ اُردو ادب کا خاصہ ہیں۔ افسوس کہ ان موضوعات پر مولوی صاحب کی کوئی مستقل تصنیف موجود نہیں ہے تاہم وہ اشارے جو ضمنی طور پر اُن کی تحریروں میں بکثرت نظر آتے ہیں، اُن کے فکر و تدبّر کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔

انسان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ خود انسان ہے۔ کسی ایک انسان

کی سیرت کو بے نقاب دیکھ لینا بہت سی کتابیں پڑھنے سے کہیں زیادہ مفید ہے کیوں کہ کتابیں محض علم میں اضافہ کرتی ہیں اور سیرتیں انسانی تجربات و مشاہدات میں؛ اور یہ ظاہر ہے کہ علم بغیر تجربے اور مشاہدے کے جہالت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انسان کی دلچسپی کی سب سے بڑی چیز خود انسان ہے۔ اسے دوسروں کی شخصیتوں کو بے نقاب دیکھنا اس حد تک پسند ہے کہ وہ بعض اوقات اس سلسلے میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ خود اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ دنیائے ادبیات میں فنِ سوانح نگاری کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔

سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں، انھیں میں سے ایک "شخصی خاکہ" ہے۔ یہ دراصل مضمون نگاری ہی کی ایک قسم ہے، جس میں کسی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے، جن کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخصی خاکہ کسی فرد کی مکمل داستانِ حیات نہیں ہوتا، بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں تفصیل سے زیادہ اجمال اور توضیح سے زیادہ ابہام ہوتا ہے اور ایسے اشارے کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتا ہے۔

شخصیت کی تصویر کشی کرنا بڑا مشکل فن ہے، کوئی شخصی خاکہ اس وقت تک کامیاب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا کہ جب تک اس میں موضوع کی تصویر اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر نہ آئے۔ موضوع کی خوبیوں یا خامیوں کی پردہ داری کی کوشش خود مصنف کی نااہلیت کی پردہ در بن جاتی ہے۔ اچھا خاکہ وہی ہوتا ہے جس میں موضوع کو اسی رنگ میں پیش کیا جائے، جو اس کا خاصہ ہے۔ اسے صرف فرشتہ یا صرف شیطان بنا کر پیش نہ کیا جائے، اسے ان دونوں کا مجموعہ ہی رہنے دیا جائے کیوں کہ اسی مجموعے کا نام "انسان" ہے۔

ایسے لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں جو صرف "اچھے" یا صرف "برے" ہوں۔ اچھائی اور برائی دونوں اضافی قدریں ہیں، ہر دور اور ہر زمانے میں ان کا مفہوم بدلتا رہا ہے، اس لیے مصنف کو خاکہ نویسی کرتے وقت اپنے اچھائی برائی کے معیار کو سامنے نہیں رکھنا چاہیئے، بلکہ اصل حقیقت کو پیش کرنا چاہیئے۔ خاکہ نویس کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے اور مصوّر کے موقلم سے لکھنے کا فن آنا چاہیئے۔ اگر

ایسا نہیں ہے تو اس کی تحریر موضوع کے مزار کا کتبہ تو بن سکتی ہے۔
لیکن اس کی زندگی کا آئینہ نہیں۔

اب اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شخصی خاکہ نویسی کے لیے کس قسم کی شخصیتوں کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ یہ سوال اس وقت بیکار نظر آتا ہے جب یہ حقیقت فاش ہو جائے کہ ہر انسان بجائے خود ایک وسیع دُنیا ہے، اس میں اچھے بُرے، توانا، اپاہج اور سفید و سیاہ کی کوئی قید نہیں۔ یہ چیزیں "شخصیت" کو بناتی ہیں نہ بگاڑتی ہیں اور نہ ہی بنیادی طور پر ان خوبیوں یا خامیوں کا اثر انسان کی "انسانیت" پر پڑتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف انھیں لوگوں کی زندگی کے حالات قلم بند کرنا چاہیئں کہ جنھوں نے کوئی بڑا کام کیا ہو اور شہرت و نام وری حاصل کی ہو۔ یہ خیال شہرت و نام وری کی حد تک رُسوا کن ہے، اس لیے کہ وہ لوگ جنھوں نے کبھی کوئی بڑا کام نہیں کیا اور کبھی شہرت و نام وری حاصل نہیں کی، ان کی زندگی کے حالات بھی دوسرے انسان کے لیے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں اور اس کی مثالیں دنیا کے ہر ادب میں موجود ہیں۔

اُردو زبان میں شخصی خاکہ نویسی کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے ہاں کچھ اشارے ملتے ہیں، لیکن وہ خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتے۔ اس قسم کی سب سے پہلی مثال "آبِ حیات" میں ملتی ہے۔ مولانا آزاد نے بڑی چابک دستی سے ایسی تصویریں بنائی ہیں کہ جو اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض جگہ انھوں نے مبالغے سے کام لیا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ درست ہے کہ یہی مبالغہ بعض اوقات موضوع کے بارے میں بہت سی ناگفتنی باتیں کہہ گیا۔ آزاد نے ذوق کا جو تذکرہ لکھا ہے وہ اُردو خاکہ نویسی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد کی تصانیف کے علاوہ بعض اور کتابوں میں بھی ضمنی طور پر شخصیت نگاری پائی جاتی ہے لیکن اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس صنف کو اردو میں صحیح طور پر متعارف کرنے کا سہرا مولوی عبدالحق صاحب کے سر ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے مختلف لوگوں کے حالات مضامین کی صورت میں لکھنے شروع کر دیئے۔ جب ان مضامین کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی تو انہیں کتابی شکل میں "چند ہم عصر" کے نام سے یکجا کر دیا گیا۔ یہ کتاب اُردو

کے سوانحی ادب میں بے شبہ بلند مقام رکھتی ہے۔

مولوی صاحب نے صرف ان لوگوں کی سیرت پر قلم اٹھایا ہے، جن سے وہ ذاتی طور پر واقف ہیں، جس شخص کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ اس قدر مکمل ہے کہ اس میں کسی کمی بیشی کی مطلق گنجائش نہیں۔ موضوع کی تصویر بڑی وضاحت کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آتی ہے۔ بعض لوگوں (مثلاً سر سید اور حالی) کے حالات لکھتے ہوئے اگرچہ عقیدت مندی کا اظہار بھی جا بجا ہوتا ہے، لیکن کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مولوی صاحب کی عقیدت موضوع کی تصویر کشی میں حائل ہو رہی ہے۔

یہاں یہ توضیح کر دینا ضروری ہے کہ "چند ہم عصر" میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں، جو مرتب (شیخ چاند مرحوم) نے محض اس بنا پر شامل کر لیے کہ ان میں بعض شخصیتوں کا ذکر ہے۔ ایسے مضامین "شخصی خاکے" نہیں ہیں (مثلاً حکیم امتیاز الدین اور مولانا گرامی وغیرہ کے متعلق تحریریں)، اس لیے وہ ہماری بحث کا موضوع نہیں ہو سکتے ہمارے پیشِ نظر وہی مضامین ہیں، جن میں مولوی صاحب نے موضوع کی شخصیت کو پوری طرح سامنے رکھ کر قلم اٹھایا ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف ایسے ہی لوگوں پر قلم اٹھایا ہے کہ جن کی زندگی کسی نہ کسی اعتبار سے قابلِ تقلید ہو سکتی ہے مگر انھوں نے ان خاکوں سے اخلاقی درس دینے کا کام نہیں لیا کیوں کہ یہ خصوصیت کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے موضوعات میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ سر سید اور حالی جیسے بڑے ادیب بھی ہیں، عماد الملک اور محسن الملک جیسے مدبر بھی، حسرت موہانی وحید الدین سلیم جیسے شاعر و سخن فہم بھی اور نام دیو مالی اور نور خاں جیسے معمولی انسان بھی۔ مولوی صاحب نے اپنے موضوع کے انتخاب کا معیار انسانیت کو قرار دیا ہے نہ کہ دنیاوی شہرت کو۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیدا کرنے کا فن خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کے شخصی خاکے مختصر ہیں، لیکن اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت بھی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سر سید کے متعلق انھوں نے تقریباً ایک سو صفحات لکھے ہیں، لیکن اپنی افادیت کے اعتبار سے یہ صفحات،

آٹھ سو صفحے کی "حیاتِ جاوید" سے کسی طرح کم نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "حیاتِ جاوید" اُردو کی بہترین سوانح عمری ہے، اور اس کا مقابلہ مولوی صاحب کے مضمون سے نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس مضمون میں بعض ایسی معلومات ہیں جو "حیاتِ جاوید" میں نہیں اس اعتبار سے اسے حیاتِ جاوید کا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب موضوع کی صرف اچھائیوں ہی سے سروکار نہیں رکھتے بلکہ برائیاں بھی بیان کرتے ہیں، کیوں کہ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اس طرح نہ انسان بے عیب ہوا، نہ ہوگا۔" (چند ہم عصر ۹) سید محمود سے جو انھیں تعلق خاطر تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مولوی صاحب ان کی شراب نوشی کی عادت پر پردہ ڈالتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ سرسید کے حالات میں اس طرف واضح اشارے کیے ہیں اور خود سید محمود کے بارے میں جو مضمون ہے اس میں ان کو "ایک شاندار انسانی کھنڈر" سے تشبیہ دی ہے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون سید محمود کی وفات کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ تعزیتی جلسوں میں عموماً رسمی باتیں ہوتی ہیں اور بقول سعادت حسن منٹو مرنے والے کو رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے اس مضمون میں موقع کی مناسبت سے رسمی باتیں نہیں کہیں، بلکہ سید محمود کی شخصیت پر بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔ اِسی طرح مولانا محمد علی جوہر کے متعلق بڑی متوازن رائے دی ہے:

"اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی ہے۔"

"وہ محبت و مروّت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی، دوست بھی اس کے جان نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔"

ان دو جملوں میں مولوی صاحب نے مولانا محمد علی کے کردار کی بڑی جان دار تصویر کھینچی ہے ہو سکتا ہے کہ مولانا مرحوم کے بعض عقیدت مند یہ تصویر پسند نہ کریں، لیکن وہ

بہ ضرور تسلیم کریں گے کہ مولوی صاحب کی "بے باکی" حقیقت پر مبنی ہے۔

مولوی صاحب کے دو شخصی خاکے ایسے ہیں جن کی اُردو ادب میں پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ یہ دونوں مضمون ایسے اشخاص کے بارے میں ہیں جو نہ تو بڑے سیاست دان تھے، نہ ادیب نہ شاعر یہاں تک کہ ان میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی، کہ جس کی وجہ سے ان کے جاننے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا۔ ان میں ایک سپاہی تھا اور ایک مالی۔

"دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے، انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے،

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے"

(چند ہم عصر، ص ۱۲۴)

یہ وہ تمہیدی سطور ہیں جو مولوی صاحب نے "نور خان" کے حالات لکھنے سے پہلے سپرد قرطاس کی ہیں۔ نور خان۔ گدڑی کا لال "معمولی آدمی تھا، لیکن اس کے کردار کی بعض خصوصیات بڑی غیر معمولی تھیں۔ انھیں خصوصیات نے مولوی صاحب کو متاثر کیا اور انھوں نے یہ خاکہ لکھا۔ اس طرح نام دیو ایک عام طرح کا انسان تھا، لیکن اسے اپنے کام سے جو لگن اور عشق تھا۔ وہ مولوی صاحب کے لیے کشش کا باعث ہوا اور انھوں نے اس کی سیرت کشی کی۔ یہ دونوں شخصی خاکے بہترین انسانی مطالعے ہیں۔ یہ دونوں کردار ہمارے ادب میں لافانی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ مولوی عبدالحق کے قلم ہی کی مسیحائی ہے کہ "معمولی" آدمیوں کو انھوں نے حیات جاوید عطا کر دی۔

مولوی صاحب کے شخصی مضامین کی ایک خصوصیت اور بھی بہت دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ۔ اگر اس مجموعے کا نام "چند ہم عصر" کی بجائے "یادِ رفتگان" ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ مولوی صاحب نے اپنے کسی ہم عصر کا خاکہ اس کی زندگی میں نہیں لکھا تمام خاکے ہم عصروں کے مرنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان

خاکوں کی صورت، موجودہ صورت سے مختلف ہوتی۔ بات یہ ہے کہ کسی شخص کی زندگی میں تعریف و مدح کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ لکھنا ذرا جرأت کی بات ہے، مجھے مولوی صاحب میں اس جرأت کی کمی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ کمی اس وقت کچھ زیادہ اہم معلوم نہیں ہوتی جب ہم اس حقیقت پر غور کریں کہ ان مضامین کو لکھنے کی محرک شخصیتوں کی موت ہے۔ اگر یہ لوگ مولوی صاحب کی زندگی میں نہ مرتے تو مولوی صاحب کبھی ان پر قلم نہ اٹھاتے۔ ان لوگوں کی دائمی مفارقت کے احساس نے مولوی صاحب سے یہ مضامین لکھوائے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب نے شخصیتوں کی جو تصویریں پیش کی ہیں، وہ زندگی سے بھرپور ہیں۔ یہی بات اس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ مولوی صاحب نے یہ مضامین لکھنے کے لیے ہم عصروں کے مرنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ ان کو موجود نہ پاکر دل کی تسکین کے لیے ان کی "لفظی تصویریں" تیار کرلیں اور یہ اچھا ہی ہوا کہ مولوی صاحب نے کسی زندہ انسان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اگر "چند ہم عصر" کے مضامین متعلقہ لوگوں کی زندگی کے دوران میں لکھے جاتے تو اردو ادب ایک متاعِ گراں مایہ سے محروم رہ جاتا۔

"چند ہم عصر"، جہاں دوسروں کی داستان ہے، وہیں اس میں خود نوشت سوانحعمری کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان خاکوں سے بے نقاب ہوتے ہیں۔ ان کی سوانحعمری کے لیے بنیادی مواد اسی کتاب سے مل سکتا ہے۔ مولوی صاحب کے ذہنی رجحانات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے ان کی زندگی کے مختلف واقعات کا مشاہدہ بھی اسی دریچے سے ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی زندگیوں کو مولوی صاحب نے اپنا موضوع بنایا ہے، ان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت خود مولوی صاحب میں بھی موجود ہے وہ سرسیّد کی طرح ثقافتی رہنما ہیں، حالیؔ کی طرح سادگی پسند ہیں۔ محمد علی جوہر کی طرح جذباتی ہیں۔ میرنؔ صاحب کی طرح وضع دار ہیں۔ اور نام دیو مالی کی طرح کام سے عشق رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اُردو ادب کو شخصی مرقع نگاری کا سلیقہ سکھایا ہے۔

انسان کو سمجھنے کا انداز دیا ہے، شخصیتوں کا مطالعہ کرنے کی راہ سجھائی ہے۔ یہ مرقعے زندگی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ان سے زندگی بسر کرنے کے فن کی نزاکتوں کا پتہ چلتا ہے اور نشیب و افراز زمانہ سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مرقعے اردو کے سوانح ادب کی آبرو ہیں۔

O

اردو کا تمام قدیم ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہے اور یہ مخطوطات بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں ان جواہر پاروں کا تحفظ نہایت ضروری ہے کیونکہ اردو زبان کی تاریخ انہیں سے وابستہ ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ قدیم سرمائے کے تحفظ کو بھی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ انہوں نے بہت سی نادر کتابوں کو کثیر سرمائے اور مشکلوں سے فراہم کیا۔ ان کی ترتیب و تدوین میں جان کھپائی اور انہیں عالمانہ مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ اردو کے بہت سے اہم تذکرے انہیں کی اس جگر کاوی کی وجہ سے محفوظ رہ گئے۔ بعض دوسری منظوم اور نثری تصانیف بھی ان کی وجہ سے منظر عام پر آئیں۔ مخطوطات کی تدوین ایک بہت مشکل کام ہے، اس کے لئے بڑی محنت اور جگر سوزی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام ہر شخص کے بس کا نہیں اور پھر اردو میں تو اس کی پہلے سے کوئی مثال موجود ہی نہیں تھی۔ یہ مولوی صاحب ہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اس طرف خود توجہ کی اور دوسروں کو متوجہ کیا اور اس طرح اہم ادبی سرمایہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا۔

زبان کا عشق انہیں ہر میدان میں لے گیا اور ہر جگہ ان کی طبع کی جولانیوں نے نئے نئے راستے تراشے۔ وہ ایک ماہر لسانیات ہیں، اور کئی زبانیں جانتے ہیں اور اردو زبان کی تو ایک ایک ادا سے واقف ہیں، لغت نگاری سے ان کا انہماک شروع سے ہے اور ہندو پاکستان میں صرف وہی اس فن کی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ انگریزی اردو لغت کی تیاری میں اگرچہ انہیں اہل علم کی ایک پوری جماعت کا تعاون حاصل رہا، لیکن کام کا بڑا حصہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح انہوں نے ایک اردو لغت بھی تیار کی

ہے، جو ابھی شائع نہیں ہوئی۔ زبان کی قواعد سے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک صرف و نحو اردو اور دوسری قواعد اردو ثانی الذکر کتاب اپنے موضوع پر درجۂ استناد رکھتی ہے اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اردو میں قواعد کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، لیکن جو مقبولیت اس کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔

مولوی صاحب کے تنقیدی و تحقیقی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو وہ صف اوّل کے نقاد و محقق نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا بہترین نمونہ دو کتابیں ہیں (۱) "اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"۔ (۲) "ملک الشعرائے بیجاپور ——— ملا نصرتی"۔ اس کے علاوہ قدیم اردو ادب کے متعلق بہت سے مضامین رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکے ہیں۔

تحقیق اور تنقید کا بہت گہرا تعلق ہے تحقیقی مزاج کے بغیر نقاد اور تنقیدی شعور کے بغیر محقق بننا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ایک نقاد کے لئے محقق ہونا اور محقق کے لئے نقاد ہونا ضروری ہے، ورنہ محقق کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ کون سا موضوع اس قابل ہے کہ اس کے بارے میں تحقیق کرنی چاہیئے اور نقاد بہرہ جان سکے گا کہ جس موضوع پر وہ اپنے خیالات ظاہر کر رہا ہے اس کی صحیح نوعیت کیا ہے۔

> مولوی صاحب محقق بھی ہیں اور نقاد بھی، لیکن ان کی پہلی خصوصیت اس درجہ نمایاں ہے کہ دوسری خصوصیت دب گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کے تنقیدی کارنامے پوری طرح سامنے نہیں آئے، رسالہ "اردو" میں جو مضمون شائع ہوئے ہیں، وہ ابھی کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوئے اس وجہ سے وہ نگاہوں سے اوجھل ہیں، لیکن جب یہ کتابی شکل میں سامنے آئیں گے تو مولوی صاحب کو ایک بڑے محقق کے ساتھ ساتھ ایک بڑا نقاد بھی ماننا پڑے گا۔

مولوی صاحب نے ادب اور تنقید کے بنیادی مسائل پر کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی اس بارے میں انھوں نے اپنی مختلف تحریروں میں ضمنی طور پر اظہار خیال کیا ہے، جن کو پیش نظر رکھ کر ایک باشعور قاری مولوی صاحب کے ادبی نظریات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

مولوی صاحب ادب کو زندگی سے علاوہ کوئی چیز نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کے خدوخال کی عکاسی کرے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے جا بجا اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

اب زندگی کا جز ہے۔ ہماری تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہے۔ جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ویسا ہی ہمارا ادب ہوگا۔"

(خطبات صفحہ ۸۶)

"ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے۔"

(خطبات صفحہ ۴۹)

ادب کو وہ معاشرے کا عکاس سمجھتے ہیں۔ حالی کی طرح وہ بھی اس خیال کے پوری طرح حامی ہیں کہ ہر عہد کا ادب اپنے گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک جگہ شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی جھلک اس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے۔"

(مقدمات حصہ دوم صفحہ ۴۶)

ان کا خیال ہے کہ ادب بغیر کسی مقصد کے ادب نہیں بلکہ فرار کا ایک ذریعہ ہے۔ مقصدیت کو وہ ادب کی غایت اولیٰ قرار دیتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ مشاہدے، مطالعے اور حقیقت شناسی کی شرط کو ضروری سمجھتے ہیں وہ لوگ جو گردوپیش کے حالات سے بے خبر ہو کر فردوس تخیل میں پناہ لیتے ہیں، ان کے نزدیک ادیب کہلانے کے مستحق نہیں ہیں:

"ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذ الرحمان ہیں۔ مشاہدہ، مطالعہ اور حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے دلوں پر آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے لیکن اگر انہیں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا منظور نہیں تو انہیں اپنی ہوائی پرواز سے اس ناپاک زمیں پر اُترنا پڑے گا۔ ورنہ ان کی شاعری کو کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔

(خطبات صفحہ ۸۰)

ادب سے وہ زندگی کے بنانے اور سنوارنے کا کام لینے کے قائل ہیں۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ادب کا زندگی کے ہر شعبے سے تعلق ہے۔ جہاں ادب سے متاثر ہوتا ہے وہاں یہ معاشرے کو متاثر کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے:

"علم و ادب اسی قدر وسیع ہے جس قدر حیات انسانی، اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی، معاشرتی، سیاسی ترقی میں مدد دیتا، اور نظر میں وسعت، دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات میں تغیّر پیدا ہوتا ہے بلکہ قوموں کے بنانے میں ایک قوی آلہ ہے۔"

(مقدمات دوم صفحہ ۲۰۴)

وہ ادیب کو زندگی کی حقیقتوں سے منہ چراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا ایمان ہے کہ اگر ادیب میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ زندگی کی مشکلوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے تو اس کے ادب میں ہرگز ہرگز وہ توانائی پیدا نہ ہو گی جو زندگی کے بنانے سنوارنے کے کام آتی ہے ادب کو وہ محض ذہنی لذت نہیں سمجھتے:

"یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر.... زندگی کی کش مکش سے جھینپتے اور مشکلات سے کنیاتے ہیں۔ اس لئے وہ عالم خیال کی سیر کرتے رہتے ہیں اور دلفریب خوابوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمیں جہاد کی ضرورت ہے، اور وہ سیر و تفریح کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔ شعر و ادب صرف "حظِ نفس" کے لئے ہی نہیں ہے اس سے اور بھی بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں تاکہ یہ حظِ نفس کے ساتھ قوتِ روح بھی ہو جائے۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۶۳)

یہاں تک کہ وہ شعر و ادب سے "آلات حرب" کا کام لینے کا مشورہ دیتے ہیں:

"اس زمانے میں جب کہ ہم طرح طرح کی کشاکشوں میں گرفتار ہیں (شعر و ادب) سے آلات حرب کا کام لینا چاہیئے۔ آلات حرب سے خدانخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ ہم ملک میں فتنہ و فساد پیدا کریں، نہیں۔ بلکہ ان سے زندگی کی جنگ میں کام لینا چاہیئے۔ ان کے ذریعے سے دلوں کے ابھارنے، زندگی کے سنوارنے، شکوک کے مٹانے اور توہمات کی بیخ کنی میں مدد لیجیے۔"

(ایضاً)

مولوی صاحب ادب کے لئے تازگی اور جدّت کی خصوصیات کو بہت اہم سمجھتے ہیں کیونکہ یہ دونوں خصوصیات ممدِ حیات کاموں کی بنیاد ہیں۔ ادب بھی ایک ممدِ حیات کام ہے

اور اس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں:

"ممد حیات وہ کام ہیں جن میں تازگی اور جدّت ہوتی ہے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدّت پیدا کرتے اور نئی راہیں سجھاتے ہیں اور شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتے۔ آپ نے ادب کو اپنا مقصد قرار دیا ہے یہ بھی ممد حیات کاموں میں سے ہے اس سے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ دلوں میں امنگ اور خیالات میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۱۱)

مولوی صاحب کے ذہنی رجحانات کی تشکیل و تعمیر میں سرسید کی عقلیت پسندی اور حالی کی حقیقت بیانی کا بہت حصّہ ہے وہ ان دونوں عہد آفرین شخصیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ خاص طور پر ادب کے معاملے میں وہ حالی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ حالی کی طرح وہ ادب سے اصلاح کا کام لینے اور اسے زندگی کی جدوجہد میں برابر کا شریک رکھنے کے قائل ہیں، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ قدیم ادب کی روایات پر قانع ہو جانے کو مناسب نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ موجودہ ادب کو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے ادب میں جو باتیں معیوب ہیں ان کو ترک کر دینا چاہیئے:

"......ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہیئے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح کی...... لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنی چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لئے گذشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں...... اس لئے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیئے جو چیزیں فرسودہ اور بے کار ہو گئی ہیں اس کے بدلنے اور ترک کرنے میں اور جو کارآمد اور مفید ہیں ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہیئے۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۸۹)

مولوی صاحب کے نزدیک ادب کو "جدید" اور "قدیم" کے خانوں میں بانٹنا مناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے ہم آواز ہیں:

## زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
## دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

وہ ہر اس چیز کو ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتے، جو قدیم زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور نہ ہی ہر اس جدید چیز کو اپنانے کے حامی ہیں جو آج کے زمانے کی پیداوار ہے۔ ادب اگر اچھا ہے، تو وہ خواہ کسی زمانے کا کیوں نہ ہو، سب کے لئے قابلِ قبول ہونا چاہئے۔ تازگی، جدّت اور خیالات کی گہرائی، ایسی خصوصیات ہیں جو ہر زمانے میں ایک ادب پارے کو مقبولیت سے ہم کنار کر سکتی ہے:

"ادب میں نیا پرانا کوئی چیز نہیں۔ جس کلام میں تازگی، جدّت اور خیالات کی گہرائی ہے، وہ ہمیشہ نیا ہے گو وہ دو ہزار سال پہلے کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو اور جس میں یہ نہیں وہ پرانا ہے گو وہ آج ہی کی تصنیف کیوں نہ ہو۔"

(خطباتِ عبدالحق صفحہ ۲۰۲)

وہ قدیم اور جدید دونوں ادبیات کی قدر کرتے ہیں۔ نئے ادب کی تشکیل کے لئے وہ قدیم ادبی روایتوں کو نظر انداز نہیں کرتے:

"ہمیں پچھلوں کے کام اور ان کی محنتوں سے حسبِ ضرورت فائدہ اٹھانا چاہئے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہئے، جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور پھر آئندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔"

(خطباتِ عبدالحق صفحہ ۶۹)

گویا ادب زندگی کی طرح ایک مسلسل عمل ہے۔ اور اس میں بھی اصلاح و ترقی کی گنجائش ہر حال اور ہر زمانے میں رہتی ہے۔ ادب کا یہی صحت مند نظریہ کسی ادب پارے کی حیاتِ جاوید کا ضامن ہو سکتا ہے۔ وہ رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی اصطلاحوں میں گم ہونا پسند نہیں کرتے۔

"رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ حرکت میں ہے اور ہر چیز پر تغیّر کا عمل جاری ہے۔ رجعت یا ترقی ہر زمانے کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گذشتہ زمانے سے ہے

سراسر رجعت سے آلودہ ہے، صحیح نہیں۔"

(خطباتِ عبدالحق صفحہ ۶۹)

الغرض مولوی صاحب ادب کو زندگی کا آئینہ بھی سمجھتے ہیں اور زندگی کے حسن کو بڑھانے کا ذریعہ بھی۔ وہ اسے کسی عالم میں سماج سے علیحدہ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں۔ ادب کے ظاہر اور باطن دونوں پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ حالی کی طرح وہ خیال کی اوّلیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن بیان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتے ہ

"شے ایک ہی ہوتی ہے، لیکن اس کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک باطن، دوسرا ظاہر۔ ظاہر اسلوب بیان اور الفاظ کا صحیح استعمال وغیرہ ہے۔ باطن خیال یا موضوع جو اصل مقصد ہے خیال کیسا ہی اہم اور وقیع کیوں نہ ہو اس کے اظہار کا ذریعہ لامحالہ الفاظ یا زبان ہے اور یہی ایک ذریعہ ہے، جس کی بدولت ہم اپنا خیال دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ادب کے بنانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ حسنِ بیان ہی خیال میں دل کشی پیدا کر کے لوگوں کے دلوں میں اسے جاگزیں کرنا اور تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اصل غایت خیال ہے اور حسنِ بیان ذریعہ۔ لیکن طرزِ بیان کے محاسن اور انضمام اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔ ان کا تعلق جسم و روح کا سا ہے۔ جسم کو روح سے اور روح کو جسم سے الگ نہیں کر سکتے۔"

(مقدمہ" اردو تنقید کا ارتقا" صفحہ ی)

وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ادیب کو لکھنے کی پوری پوری آزادی ہونی چاہئے۔ اس پر موضوعات کے انتخاب کی پابندی عائد نہ کی جائے، لیکن اسے یہ اجازت نہیں ہونی چاہئے کہ وہ بھونڈے پن سے لکھے ؛

"ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہئے لکھے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔"

(خطباتِ عبدالحق صفحہ ۶۷)

لفظ کے صحیح استعمال پر وہ بہت زور دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس پر عمل کر کے ادیب اپنے خیالات کو موثر بنا سکتا ہے ؛

"لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور منظر خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے...........
دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔"

(چند ہم عصر صفحہ ۱۶۸)

عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کو وہ اچھے ادب کے مقاصد کے منافی سمجھتے ہیں:-

"عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ایسے حالات و واقعات اور جذبات و خیالات کے ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے جن کا صداقت سے کچھ تعلق ہو۔"

(چند ہم عصر صفحہ ۲۸۲)

ادبی تنقید کی اہمیت اور قدر و قیمت سے مولوی صاحب پوری طرح واقف ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ تنقید کے مقاصد بہت وسیع ہیں اور اس کے بغیر صحت مند ادبی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ ہر شخص کو نقاد بننے کا اہل نہیں سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے کچھ شرطیں ہیں:-

"تنقید صحیح ذوق کے لئے لازم ہے لیکن ایک نقاد کے لئے جو اس کٹھن اور صبر آزما کام میں ہاتھ ڈالتا ہے، وسیع معلومات، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے صحیح تنقید مصنف اور پڑھنے والے دونوں کے لئے مفید ہے۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۱۴)

اسی طرح ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ہے۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی یہ اصلاح کا باعث ہے۔ اُسے ذاتی اظہار کے قدر کرنے کا موقع دیتی ہے اور ضبط سکھاتی ہے۔ ایک طرف وہ سنت قدیم پر غیر ضروری شفتگی سے بچاتی اور دوسری طرف جدت یا جذبات کے زور میں تمام حدود کو توڑ کر نکل جانے سے روکتی ہے یعنی بریک کا کام دیتی ہے۔ پڑھنے والوں کے لئے تفریح اور تعلیم کا سامان مہیا کرتی ہے اور تہذیب کا ذوق پیدا کرنے میں مدد دیتی اور محرک بن کر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ غرض ادب کے فروغ و ترقی کے لئے تنقید لازم ہے۔"

(مقدمہ، اردو کا ارتقا صفحہ ک)

یہ تھے مولوی صاحب کے ادب و تنقید سے متعلق اصول و نظریات ان کی عملی

تنقید انہیں اصولوں اور نظریوں کی پابند ہے۔ انہوں نے جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ کسی فن کار کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ اس کی زندگی کے حالات اس کے مزاج کی خصوصیات اور اس زمانے کے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ سماجی و سماجی محرکات پر گہری نظر رکھتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں وہ آج کل کے نقادوں کی طرح سیاسی و سماجی حالات کو تمام جزئیات کے ساتھ اس طرح بیان نہیں کرتے کہ اصل موضوع کی اہمیت ہی ختم ہو جائے۔ آج کل بعض نقاد جب کسی فن کار پر لکھتے ہیں تو اس کے سال پیدائش سے لے کر سالِ وفات تک کے تمام تاریخی واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں جن کا براہِ راست فن کار کی زندگی اور فن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ادبی تنقید میں سیاسی حالات کو بطور پس منظر کے اس حد تک بیان کرنا چاہئے کہ ان کے وہ اثرات واضح ہو جائیں جو فن کار کی شخصیت نے قبول کئے اور جن کے تحت اس کے ذہنی رجحانات کی تشکیل ہوئی۔ مولوی صاحب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ وہ عملی تنقید میں سیاسی و سماجی حالات کو اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ فن کار کی سیرت اور اس کے فن کا مطالعہ کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مقدمہ "انتخاب کلامِ میر" اس کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے میر کے شعری محرکات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا ہے اور دکھایا ہے کہ زمانے کے حالات نے ان کی شخصیت اور فن پر کیا اثرات ڈالے۔

مولوی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے عالمی ادب سے پوری طرح استفادہ کیا ہے، صرف اُردو ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب کی کئی زبانوں کے ادبیات پر ان کی بہت گہری نظر ہے۔ ادبیات کے علاوہ دیگر سماجی علوم سے بھی وہ بخوبی آشنا ہیں۔ مختلف ادبی، علمی، عمرانی، سیاسی، تحریکات اور رجحانات سے ان کی آشنائی قابلِ رشک ہے۔ ان سب خصوصیات نے ان کی عملی تنقید کو بہت متوازن بنا دیا ہے۔ وہ صرف خوبیوں یا صرف خامیوں سے ہی سروکار نہیں رکھتے، بلکہ ادب پارے کا تجزیہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض جگہ وہ تحسین و تعریف کرتے ہوئے مبالغے کی حد تک جا پہنچتے ہیں، لیکن ایسے مقام بہت کم ہیں اور انہیں بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب کو اردو زبان سے جو خاص دل چسپی ہے اس کی وجہ سے وہ تنقید

کرتے ہوئے فن پارے کی زبان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگر زبان و بیان کی غلطیاں نظر آتی ہیں تو ان کا اظہار ضرور کرتے ہیں اور اگر کوئی قابلِ تعریف پہلو ہوتا ہے تو اس کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کی ساری تنقید زبان و بیان تک ہی محدود نہیں ہوتی۔

مولوی صاحب کی تنقید صحیح معنوں میں سائنٹی فک تنقید ہے۔ موضوع کے ہر پہلو پر وہ اس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کہیں تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے اردو میں تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا ہے تو وہ مولوی عبدالحق ہیں۔ حالی نے صرف بنیاد ڈالی تھی، لیکن مولوی صاحب نے اسی بنیاد پر عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ مولوی صاحب کا یہ کارنامہ ہماری ادبی تاریخ کا روشن زرین باب ہے۔

تبصرہ نگاری تنقید ہی کی ایک شاخ ہے۔ تنقید میں موضوع کے تمام پہلوؤں کا مکمل جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ تبصرے میں ایک سرسری سی نظر ڈالی جاتی ہے۔ تنقید نگار مسلمہ اصولوں کی روشنی میں لکھتا ہے، تبصرہ نگار کبھی کبھی ذاتی پسند اور ناپسند کو بھی معیار بنا لیتا ہے۔ بہر حال تبصرہ نگاری کے لئے تنقیدی شعور کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر تبصرہ، تبصرہ نہیں ہوسکتا۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں۔ غالباً "تہذیب الاخلاق" پہلا علمی رسالہ ہے جس نے اس روایت کی داغ بیل ڈالی۔ اور پھر "الندوہ" اور دوسرے علمی رسالوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ حالی اور شبلی اردو کے اولین تبصرہ نگاروں میں سے ہیں۔ مگر ان کے تبصرے، ان کے دوسرے علمی کاموں کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ افتخار مولوی صاحب ہی کو حاصل ہے کہ ان کے تبصرے اردو تنقید کا ایک اہم سرمایہ ہیں۔

مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کا باقاعدگی سے آغاز رسالہ "اردو" کے اجراء سے ہوتا ہے۔ اس رسالے میں انہوں نے بے شمار کتابوں اور رسالوں وغیرہ پر تبصرے لکھے، جن کے ایک دو انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔

"مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کتاب پڑھ کر تبصرہ لکھتے ہیں۔ (یہ بات میں نے اس لئے لکھی ہے کہ اردو کے اکثر تبصرہ نگار کتاب پڑھے بغیر ہی اس کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کرتے ہیں) کتاب کی

خوبیوں اور خامیوں پر وہ تفصیلی بحث تو نہیں کرتے مگر ایسے اشارے ضرور کرتے ہیں جن سے کتاب کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملے۔ ان کی تبصرہ نگاری کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زیرِ تبصرہ کتاب میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے کہ نہیں۔ اس سلسلے میں وہ بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں، اگر کوئی کتاب اپنے موضوع کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تو وہ بڑی سختی سے اس کا محاسبہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ اسے نشانۂ تضحیک بنانے سے بھی نہیں چوکتے مولوی صاحب کے تبصرے عملی تنقید کا اچھا نمونہ ہیں۔ وہ بہت کم لفظوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے مجموعہ "آیات و نغمات" پر انھوں نے یہ چند سطریں لکھی ہیں:

"جوش صاحب کوئی نئے شاعر نہیں، اچھے خاصے بختہ اور پرانے شاعر ہو گئے ہیں نہ کسی تعارف کے محتاج ہیں نہ کسی تعریف کے۔ ان کے کلام میں جوش، روانی، حسنِ بیان بدرجۂ کمال موجود ہے، اس میں زور بھی ہے اور شور بھی۔ وہ قدیم روایات و اخلاق، مذہب و معاشرت، اوہام و عقائد سے سخت بیزار ہیں اور مستانہ وار انھیں ٹھکراتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ سلام اور نوحے یا اس قسم کی نظمیں لکھتے ہیں (جیسا کہ اس مجموعہ میں پائی جاتی ہیں) تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل پرانے اوہام اور عقائد سے اس قدر اٹا ہوا ہے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھی وہاں گزر نہیں۔ انقلاب، نظام جدید اور ہر جدید رنگ پر فریفتہ ہیں جوش و خروش اور انقلاب کے نعروں سے ان کا کلام گونج رہا ہے لیکن انقلاب کیا ہے؟ نظام جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے انھیں بحث نہیں۔ انھیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔ اس نتیجہ خیز تو ہے لیکن ان کی حالت ایک تماشائی کی سی ہے، جس پر بیتتی ہے اور جو اپنے اصولوں کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہے اور خوشی خوشی ہر طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے۔ جوش کے کلام کو پڑھ کر لطف و سرور ہوتا ہے لیکن اس میں بلندی، فکر اور تاثیر نہیں۔"

(ادبی تبصرے صفحہ ۸۸)

ان چند سطروں میں جوش کی شاعری کی تمام خصوصیات کو بیان کر دیا گیا ہے۔ جوش کے

کلام پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی۔ مولوی صاحب کے تقریباً سبھی تبصروں میں یہی شان پائی جاتی ہے۔ تبصرہ کرتے وقت مولوی صاحب کتاب کی زبان و بیان پر بھی کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اگر کہیں اس قسم کی خامیاں نظر آتی ہیں تو ان کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں، لیکن سارا تبصرہ اسی پہلو تک محدود نہیں ہوتا۔ شعری مجموعوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ کوئی نئی چیز ہے کہ نہیں۔ اگر کوئی نئی بات نظر آتی ہے تو اس کو پوری فراخدلی سے سراہتے ہیں اور اگر رسم و روایات کی فرسودگی نظر آتی ہے تو دامن بچاکر گزر جاتے ہیں۔ ایسی کتابوں پر، جو اردو میں اپنی نوعیت کی نئی کتابیں ہوں، وہ مصنّف یا موئف کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ اس موقع پر تحسین و تعریف کے کلمات کے استعمال سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔

> مولوی صاحب نے اپنی تبصرہ نگاری کو کبھی ادبی بددیانتی سے آلودہ نہیں کیا۔ یعنی انھوں نے نہ تو کبھی کسی کتاب پر متعصبانہ نقطۂ نظر سے کچھ لکھا اور نہ ہی کبھی کسی کتاب پر تبصرہ کیا، جس کے موضوع سے ان کو واقفیت نہ ہو۔ ان دو خصوصیات کی وجہ سے ان کی تبصرہ نگاری نے اردو تنقید میں ایک ایسی روایت کی بنیاد رکھی ہے جو نہایت ہی صحت مند اور مستحسن ہے۔ کسی خراب سے خراب کتاب میں بھی انہیں کوئی کام کی بات نظر آجاتی ہے تو وہ اس کو ضرور سراہتے ہیں۔

اور اگر کسی کتاب میں کوئی ایسا مسئلہ آجاتا ہے جس پر وہ خود کو تبصرہ کرنے کا اہل نہیں سمجھتے تو فوراً اس کا اقرار کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ "روح سیاست" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مترجمین نے اس ترجمے میں اکثر غیر مقفّیٰ عبارت لکھی ہے۔ ان کے خیال میں اس کا استعمال بمجبوری اس لئے جائز رکھا گیا ہے کہ ہماری زبان میں بلینک ورس کا رواج نہیں اور یہ مجبوری اس لئے واقع ہوئی کہ ایکٹروں کو ربط عبارت کے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ اس پر وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو ناٹکوں کے تفصیلی حالات سے واقف ہو۔ ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتے۔"
>
> (ادبی تبصرے صفحہ ۳۰)

ایسا لکھ دینا بڑے ظرف کی بات ہے۔ اسی کو ادبی دیانت کہتے ہیں اور یہی چیز مولوی صاحب کے سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

اسلوب کیا ہے؟ اس کا جواب عام طور پر دیا جاتا ہے کہ اسلوب شخصیت کا عکس ہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خود شخصیت ہی اسلوب ہو۔ یعنی میرے نزدیک اسلوب "عکس" نہیں "اصل تصویر" ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ادیب کی انفرادیت ہی اس کا اسلوب ہے۔ ایک انسان کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کے ذہنی رجحانات بڑا اہم حصہ لیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انفرادیت کی تشکیل ہی یہی کرتے ہیں۔ ذہنی رجحانات جب ایک عرصے کی تگ و دو کے بعد کوئی مخصوص صورت اختیار کر لیتے ہیں تو انسان کی انفرادیت وجود میں آتی ہے جو اسے اپنے ہم جنسوں سے ممیز کرتی ہے۔ اور پھر اس کے ہر فعل میں یہ انفرادیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ادیب کی تحریر کو بھی ایک مخصوص رنگ اور روپ یہی انفرادیت عطا کرتی ہے۔ اور اسی رنگ اور روپ کا دوسرا نام "اسلوب" ہے۔

ادب خیال اور بیان کا ایک خوب صورت امتزاج ہے۔ خیال کی اہمیت بہت زیادہ ہے، لیکن اگر خیال کو مناسب و موزوں طریقے سے ادا نہ کیا جائے تو ادبیت مجروح ہو جاتی ہے۔ ایک واقعہ جب ایک اخبار نویس بیان کرتا ہے تو وہ "خبر" بن جاتا ہے۔ لیکن اگر اسی واقعے کو ایک ادیب بیان کرے گا تو وہ فن پارہ بن جائے گا۔ وہ عنصر جس نے "خبر" کو "فن پارے" کا درجہ عطا کیا ادب کی بنیاد ہے۔ اسلوب کا تعلق اسی عنصر سے ہے۔ ایک ادیب اپنے اسلوب سے وہی جادو جگاتا ہے جو ایک مصوّر رنگوں کے امتزاج اور خطوطِ تصویر کی موزونیت سے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں ادیب کا اسلوب ایسا ہے اور فلاں کا ایسا تو اس وقت ہمارے ذہن میں لاشعوری طور پر یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ادیب نے اپنے موضوع کو پیش کرنے کے لئے بیان کا کیسا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ایک ادیب کے جملوں کی ساخت، لفظوں کے استعمال اور بات کہنے کے طریقے سے اسلوب کی خصوصیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مولوی صاحب کے اسلوب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے

کہ ان کی انفرادیت کی تشکیل میں جن ذہنی رجحانات نے حصہ لیا ہے ان کی نوعیت کیا ہے۔
مولوی صاحب نے ایک ایسے دور میں آنکھ کھولی کہ جب سرسید کی عقلیت پسندی کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ عبارت آرائی، قافیہ پیمائی اور تصنع سے بھرپور تحریروں کا رواج اُٹھ چکا تھا۔ ہر بات صاف اور سیدھے انداز سے کہی جانے لگی تھی۔ مولوی صاحب سرسید سے اور پھر مولوی حالیؔ سے بہت متاثر ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں کے خیالات انہوں نے اپنائے بلکہ ان کے طرز تحریر سے بھی تاثر لیا۔ ان دونوں کی سادگی اور سادہ بیانی کا اثر مولوی صاحب کے اسلوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سرسیدؔ کا اسلوب اگرچہ بہت سادہ و آسان ہے لیکن اس میں کہیں کہیں "اکھڑپن" پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسیدؔ کے ہاں "ادبیت" کی حیثیت ثانوی ہے اور "مقصدیت" کو اولیت حاصل ہے۔ ان پر "اصلاح" کا خیال اس حد تک طاری تھا کہ وہ تحریر کی خوبیوں یا خامیوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ مولوی حالیؔ کا اسلوب سرسیدؔ سے قدرے بہتر ہے۔ اس میں اگرچہ "اکھڑپن" نہیں پایا جاتا، مگر وہ جاذبیت بھی نہیں ہے جسے "ادبی حسن" کہا جا سکے۔ اس کا سبب بھی وہی "مقصدیت" کی اولیت ہے۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ حالیؔ کا اسلوب بے داغ ہے لیکن وہ شبلیؔ کے اسلوب کی طرح رنگین بھی نہیں۔ یہ فرق طبیعتوں اور شخصیتوں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا۔

مولوی عبدالحق نے حالیؔ اور سرسیدؔ سے سادگی اور سادہ بیانی لی، لیکن ان کا اسلوب صرف انہیں دو عناصر سے عبارت نہیں ہے۔ ان کے ہاں ایک تیسری خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جسے "رنگینی" کہا جا سکتا ہے اور یہ خصوصیت انہیں شبلی سے ملی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تحریروں میں کبھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ جہاں شبلیؔ کو "مطعون" کیا جا سکے، لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ وہ اسلوب کے معاملے میں شبلی سے اتنے ہی متاثر ہیں جتنے کہ حالیؔ اور سرسیدؔ سے (واضح رہے کہ مولوی عبدالحق مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں، حالی اور سرسید سے ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف تھی۔ شاگرد کا استاد سے متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے اور اس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مولوی صاحب شعوری یا غیر شعوری طور پر شبلیؔ کے انداز تحریر سے متاثر ہوئے) گویا مولوی صاحب کے اسلوب

بیان کی تین خصوصیات ہیں، سادگی، سادہ بیانی اور رنگینی۔ "سادگی سے مراد یہ ہے کہ عبارت آرائی اور دیگر تصنعات سے اجتناب کیا جائے۔ "سادہ بیانی" یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے دو ٹوک انداز سے کہا جائے۔ موضوع کی مناسبت سے کہا جائے اور پیچیدگی اور الجھاؤ سے دامن کشی کی جائے۔ "رنگینی" کا مطلب یہ ہے کہ نثر میں وہ لطافت پیدا کی جائے جو "ادبی حسن" کہلاتی ہے۔ یہ تینوں خصوصیات جس عمدگی اور خوش اسلوبی سے مولوی عبدالحق کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

مولوی صاحب لفظوں کے بہت بڑے مزاج داں ہیں۔ انہیں یہ بخوبی معلوم ہے کہ:

"الفاظ بھی ایک طرح انسان کی طرح جان دار ہیں، وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے، مرتے بڑھتے اور گھٹتے رہتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے، جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ وہ گذشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے۔ وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا ہے۔ یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ، شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے۔ جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے یہ انشاپردازی کا بڑا گُر ہے۔"

(تنقیدات صفحہ ۱۱)

مولوی صاحب کو انشاپردازی کا یہ گُر معلوم ہے وہ جس جگہ جو لفظ استعمال کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اُسی جگہ کے لئے وضع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی یہ نہیں دیکھتے کہ یہ لفظ کس زبان سے اُردو میں آیا ہے بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جس مقصد کے لئے یہ لفظ اردو میں آیا ہے وہ پورا ہوتا ہے کہ نہیں۔ اُن کی نثر ابوالکلام آزاد کی نثر کی طرح صرف عربی فارسی لفظوں ہی کی محتاج نہیں، بلکہ وہ ہندی لفظوں کو بھی بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ غریب سے غریب لفظ بھی ان کی نثر میں آکر بڑا مانوس دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کہیں متروکات کے استعمال کو بھی روا رکھتے ہیں لیکن اس طرح کہ پڑھنے والا اس سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ کہ آخر ان الفاظ کو متروک، کیوں قرار دیا گیا وہ۔ ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں جو ہماری زبان کے

مزاج پر پورے نہیں اُترے یا جن کی ثقالت مفہوم کو سمجھنے میں دشواری پیدا کرتی ہے۔

مولوی صاحب بڑے بڑے جملوں کے عادی نہیں ــــ وہ چھوٹے مربوط جملوں سے بڑی متوازن نثر لکھتے ہیں۔ چھوٹے جملے لکھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خیال کو دوسروں تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے، ان کی نثر کو حسین بنانے میں نادر و خوبصورت تشبیہات کو بھی بہت دخل ہے۔ یہ تشبیہیں محض لطافت بیان کے لئے نہیں ہوتیں، بلکہ ان سے مفہوم کی وضاحت کا کام لیا ہے۔ مثلاً مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا۔ کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی، دوست بھی اس کے جان نثار اور فدائی تھے لیکن اسطرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔"

(چند ہم عصر صفحہ ۴۹)

مولوی چراغ علی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حیدر آباد میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے، وہ اسی طرح سے رہے جیسے طوفان موج خیز میں لائٹ ہاؤس۔"

(چند ہم عصر صفحہ ۴۹)

اسی طرح اور بھی بہت سی تشبیہات پیش کی جا سکتی ہیں، جو مولوی صاحب کی تقریباً تمام تصانیف میں موجود ہیں۔ مولوی صاحب کبھی کبھی طنز اور مزاح سے بھی اپنی تحریر میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ طنز کا استعمال تو وہ وہاں کرتے ہیں جہاں وہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ عام طرح سے بات کرنے کا انداز موثر نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے "تذکرہ اعجاز سخن" پر تبصرہ لکھا ہے، وہ بہت ہی دلچسپ ہے اور طنز کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کتاب کو "سلسلہ ستم ظریف بک ڈپو" کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب بہت سی باتیں کہنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

"ابتدا میں مجھے تعجب ہوا تھا کہ یہ کتاب "سلسلہ ستم ظریف" میں کیوں داخل کی گئی، لیکن کتاب ختم کرنے کے بعد ثابت ہوا کہ بے شک وہ اسی سلسلے کے لائق تھی۔"

(تنقیدات صفحہ ۳۸)

اسی طرح "ناٹک ساگر" کے تبصرے میں لکھتے ہیں:

"ناظرین کو حیرت ہوگی کہ یہ پونے پانچ سو صفحے کی کتاب ایک ہفتے میں چھپ کر تیار ہوئی ہے، یہ لاہور کے مطابع کا کمال ہے، یہ تو خیر چھپائی کا کام ہے ہم نے سنا ہے کہ وہاں کے بعض اہل قلم ہفتہ بھر میں ایسی ضخیم کتاب تصنیف کر ڈالتے ہیں"

(ادبی تبصرے صفحہ ۵۳)

اس سلسلے میں وہ بعض اوقات اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ہند کے جلسے کا خطبہ صدارت ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں:

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جا رہا تھا، چلتے چلتے رستے میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا، اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی" پھر جھٹ اُٹھ کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں تو کہنے لگا "جوانی ہی میں کون سے تیر مارے تھے"۔ جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اس وقت میرے سامنے ہے تو مجھے وہ شریف بڈھا یاد آتا ہے"

غرض مولوی صاحب کا اسلوب بڑا باغ و بہار ہے۔ اُن کا ایک ایک لفظ پڑھنے والے کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ مولوی صاحب کا اسلوب اُردو کے بنیادی اسالیب میں سے ہے میں اس پر صرف اس قدر اضافہ چاہونگی کہ صرف اسی اسلوب سے اردو زبان کی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

---

"تحقیق و تنقید (مولوی صاحب) کا مرغوب موضوع ہے ..... انہوں نے اپنی تحقیقات میں تنقیدی شعور کو سمو کر اور تنقیدات میں تحقیقی عمق کو جگہ دے کر تحقیق و تنقید کے اتصال و اتحاد کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا ہے"

— ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

○

○

ادب میں حالی کی سی درویشانہ کسرِ نفسی، سادگی، استغنا اور بے لوث خدمت حالی کے بعد صرف عبدالحق کے حصے میں آئی۔ مولوی صاحب کی مستقل تصانیف زیادہ نہیں، یہی اُن کے درویشانہ استغنا کو ظاہر کرتا ہے اور حالی کی جانشینی کا حق دلاتا ہے ورنہ پچھلی صدی میں اُردو زبان سے متعلق تمام تر علمی تحقیقات بالواسطہ یا بلا واسطہ مولانا کی ذات سے متعلق رہی ہیں۔ اُن کے خطبات، اُن کے مقدمات، اُن کے خطوط، اُن کی روزمرّہ گفتگو، ایسے نکات و اشارات سے پُر ہے، جنہوں نے اَن گنت مستقل تصانیف کو جنم دیا۔"

——— شاہد عشقی

سیّد معین الرحمٰن

# مولوی عبدالحق کی علمی اور ادبی خدمات

مولوی عبدالحق نے شعور کی آنکھ کھولی تو سرسیّد، آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، حالیؔ اور شبلی کا شہرہ تھا۔ اُدھر اردو ایک پُرآشوب دور میں داخل ہو رہی تھی کیوں کہ اس کے مقابل ہندی زبان اور دیوناگری خط کی تحریک نے زور پکڑ لیا تھا۔ اس تحریک نے جس کا آغاز ۱۸۶۷ء کے قریب ہوا، سرسیّد کے آخری دنوں میں باقاعدہ ایک ہل چل کی صورت اختیار کرلی۔ یہ مولوی عبدالحق کی طالب علمی کا دور تھا۔ ایک حسّاس اور باشعور نوجوان کی حیثیت سے اُنھوں نے اِس فضا کا مُطالعہ کیا اور اِس سے ایک خاص اثر قبول کیا۔ اُنھوں نے ابھی انٹرنس کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا کہ سرسید کے "تہذیبُ الاخلاق" میں اردو زبان کے مُستقبل کے موضوع پر اُن کا ایک مضمون شائع ہوا جس پر اس نوعمر اہلِ قلم کو ہر طرف سے داد ملی۔

مولوی عبدالحق کی تعلیم و تربیت سب کی سب کم و بیش علی گڑھ میں ہوئی اور یہاں بھی خصوصیت سے اُنھیں سرسیّد کی "چشمِ نگراں" میسّر آئی۔ رشید احمد صدیقی نے ٹھیک کہا ہے[۱] کہ عُنفوانِ شباب کی بے پایاں اور بسا اوقات تُند صلاحیتوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کو صحیح راستے پر لانے اور رکھنے کے لیے بڑے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مولوی صاحب یقیناً خوش قسمت تھے کہ ان کو سرسیّد کا سایہ اور سہارا اور اُن کے نادرۂ روزگار رفقائے کرام کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ سرسیّد اور حالیؔ جیسے مشاہیر کی شفقت اور صُحبت نے مولوی عبدالحق کے ذہن کو صیقل کر دیا۔ اُن کا مذاقِ ادب نکھرتا اور سنورتا گیا۔ مزاج میں ضبط و تحمل، متانت و اعتدال اور تحریر میں صفائی، سادگی، قوّت و استدلال کے جوہر چمک اُٹھے۔ وہ سرسیّد کی تحریک اور حالیؔ کی تحریر سے بہت زیادہ مُتاثر ہوئے اور بالآخر اسی کو اُنھوں نے اپنی زندگی کا نصبُ العین اور اندازِ نگارش کا معیار و محور ٹھہرایا۔

[۱] ہم نفسانِ رفتہ، ص ۱۸۰

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولوی عبدالحق دو تین برس مدرسۂ آصفیہ، حیدر آباد کے صدر مُدرّس رہے۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں وہ رسالۂ "افسر" سے بھی بحیثیت مدیر وابستہ ہوگئے۔ لگ بھگ اِسی زمانے میں وہ اُمورِ عامہ (ہوم سیکرٹری) میں مُترجم بنائے گئے جہاں بارہ تیرہ سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے ـــــ ۱۹۱۱ء میں وہ ناظم (ڈائریکٹر) تعلیم کے مددگار اور چند ماہ بعد اوائل ۱۹۱۲ء میں صوبۂ اورنگ آباد کے سررشتۂ تعلیم کے صدر مہتمم (انسپکٹر آف اسکولز) مُقرر ہوئے اور اس طرح اُن کا تعلیمی اور علمی تجربہ ترقی کرتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں مُنعقد ہوا تو وہ "شعبۂ ترقیٔ اردو" کے سیکرٹری منتخب کئے گئے اور اس کے بعد اردو اُن کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام میں مولوی عبدُالحق کی تحریک اور مساعی کو بڑا دخل ہے۔ صدر مہتممیٔ تعلیمات سے مولوی عبدُالحق کو جامعہ عثمانیہ کے سررشتۂ تالیف و ترجمہ کی نظامت پر ترقی دی گئی۔ چند سال بعد اورنگ آباد میں عثمانیہ کالج قائم ہوا تو اُنہیں اس کا پرنسپل مُقرر کیا گیا۔ کم و بیش تینتیس ۳۳ برس تک سرکاری خدمات انجام دے کر مولوی عبدُالحق نے ۱۹۳۰ء میں پنشن لے لی، لیکن فوراً بعد اُنہیں بہ اِصرار جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کا صدر بنا دیا گیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے ایما پر اُنہوں نے اِس مَنصب کو قبول کیا لیکن چند ہی سال بعد زبان کی حفاظت و مدافعت کے پیشِ نظر وہ اِس اعزاز اور خدمت سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے۔

۱۹۱۲ء میں انجمن ترقیٔ اُردو سے وابستہ ہوتے ہی مولوی عبدُالحق نے زبان کو علمی مضامین کے اظہار کے قابل بنانے کے لئے علمی موضوعات پر تصانیف و تراجم کے سلسلے کو تیز تر کر دیا۔ مغربی علوم کے ترجموں میں سب سے بڑی دقّت اُن کی مخصوص اِصطلاحات تھیں جن کے مُترادفات مشرقی زبانوں میں نہیں ملتے تھے۔ مولوی عبدُالحق نے اصطلاحاتِ علمیہ کی لغت مُرتّب کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور ایسی مُسلسل سعی و محنت سے جو اُن کا طرّۂ اِمتیاز رہی ہے، مختلف علوم کی اصطلاحات کو مُرتّب کر کے چھپوایا اور برابر اس میں مُناسب ترمیم و تصحیح اور اضافے کرتے رہے۔

اِصطلاحاتِ علمیہ کی لُغت سے قطع نظر ۱۹۲۷ء میں مولوی عبدُالحق نے انگریزی اردو لُغت کے ترجمے کا عہد آفرین کام مُکمل کیا۔ بڑی تقطیع کے دو کالمی ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر مُشتمل انگریزی سے اُردو کی یہ لُغتِ کبیر انجمن کی طرف سے شائع کی گئی۔ یہ لغت

جس میں تقریباً دو لاکھ انگریزی لغات کے ہم معنی اردو الفاظ دیئے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی رہبری و نگرانی میں متعدد اہلِ علم کی دس گیارہ برس کی محنت سے تیار ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں حکومتِ حیدرآباد نے اُردو زبان کی جدید و مکمل لغت کی تسوید و تالیف کی خدمت مولوی عبدالحق کے سپرد کی۔ مولوی عبدالحق ہی کے لفظوں میں ایک کامل و جدید مستند لغت میں:

ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ہوگا کہ وہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اُردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اور اُس وقت سے تا حال اِس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے اُس کے کون کون سے معنی متروک ہو گئے اور کون کون سے اَب تک باقی ہیں اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معنی پیدا ہوئے۔ اِن تمام اُمور کی توضیح کے لئے زبان کے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی اصل تحقیق کرنی ہوگی یعنی یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی یا بدل گئی ہے۔ اصل زبان میں اس کے کیا معنی تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے۔"

ظاہر ہے اِن خطوط پر ایک جامع لُغت کی ترتیب کس قدر دُشوار، کٹھن اور محنت و وقت طلب امر تھا مگر مولوی عبدُالحق نے بڑی حوصلہ مندی سے کام میں ہاتھ ڈالا اور بڑی مستعدی اور تیزی سے لُغت کی تالیف کا کام شروع ہوگیا۔ اَلفاظ کی اَصل اور سرگذشت کا پتہ چلانے کے لئے اُن کی نگرانی میں سنسکرت اور ہندی کے بعض ماہرین کا تقرر عمل میں آیا۔ نظم و نثر کی مستند کتابوں سے اَلفاظ و اَسناد ڈھونڈنے میں کئی کئی اَصحاب مصروف رہے۔ خود مولوی عبدالحق جزوی تلاش و تحقیق تک میں شریک رہتے یہاں تک کہ دس پندرہ برس میں اِس سلسلے کا بہت کچھ مواد جمع ہوگیا۔ مسودے کا بڑا حصہ مطبع میں پہنچ گیا تھا، اس کے کچھ اجزا حیدرآباد دکن کے سرکاری مطبع میں چھپ بھی لئے تھے کہ یہ سارا سرمایہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہوگیا۔

پاکستان آنے کے بعد مولوی عبدالحق نے لُغت سازی کے کام کی طرف نئے سرے سے توجہ کی۔ جمیل الدین عالی کے بقول:

اَسناد کی فراہمی اور تشریح نگاری کے کام ساتھ ساتھ شروع کئے گئے، دس

بارہ برس کی مدّت میں صرف اَلف ممدودہ، اَلف مقصودہ، ب اور بھ کے الفاظ تک کا مسوّدہ مکمل ہو سکا۔ بابائے اُردو کی وفات سے یہ کام جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ (بہر نوع) اُردو زبان میں کوئی لُغت اَیسی موجود نہیں ہے، جس میں مذکورہ حرُوف کی حد تک اِتنے زیادہ اَلفاظ ہوں اور پھر تشریح نگاری میں جس تفصیل سے کام لیا گیا ہے، وُہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔"

(اداریہ سہ ماہی "اردو" اپریل ۱۹۶۶ء ص ۴)

مُولوی عبدالحق اُردو کے بلند پایہ لُغوی، جَیّد عالم اور ماہرِ لسانیات تھے۔ "قواعدِ اُردو" کے نام سے اُردو زبان کے اَجزائے صرفی و نحوی اُصول پر اُن کی مُجتہدانہ تالیف بڑی گراں قدر، مبسوط، اور مُستند ہے۔ اس میں الفاظ کی ساخت، اِرتقائی تغیرات، مُرکّبات و محاورات، عبارت کی نحوی ترکیب اور عروض کے ضروری اصول و قواعد پر اَیسی مُرتّب اور مُشرح تفاصیل بہم پہنچائی ہیں کہ زبان کے نکات و قواعد کی تمام و کمال معرفت نصیب ہو جاتی ہے۔ قواعد کے علاوہ ۱۹۳۴ء میں مُولوی عبدُالحق نے ثانوی دَرجوں کے طلبا کی ضروریات کے پیشِ نظر "اُردو صرف و نحو" پر ایک کتاب تالیف کی، یہ کتاب بقول کسے تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اَپنے موضوع پر پہلی مُستند کتاب ہے جو سائنٹفک بُنیادوں پر لکھی گئی، مُولوی عبدُالحق سے پہلے اِس مُوضوع پر جن مُصنّفین نے قلم اُٹھایا اُنہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کی قواعد کو مشعلِ راہ بنایا اور اُردو زبان کے مخصوص مزاج و منہاج کو نظر انداز کر دیا۔ مُولوی عبدُالحق نے عربی اور فارسی کی قواعد کو صرف اُسی حد تک پیشِ نظر رکھا ہے جہاں تک اُس کی ضرورت تھی، اُنہوں نے اُردو زبان کی خصُوصیات کو پوری طرح سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی اور پہلی بار اِس اہمیّت کا احساس دلایا کہ اُردو کی قواعد عربی و فارسی کا چربہ نہیں بلکہ بعض اَیسی خصوصیات کی حامل ہے جو صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔[1]

تحقیق و تدقیق سے مُولوی عبدُالحق کو گہرا شغف تھا۔ اُن کا شمار اُردو ادبیات کے قدرِ اَوّل کے مُحققوں میں ہوتا ہے۔ اُنہیں ادب کی تاریخ سے عموماً اور زبان کی تاریخ سے خصوصاً بڑی دل چسپی رہی ہے۔ اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ تاریخی ژرف نگاہی کے ثبوت ملتے ہیں۔ اُردو کی اِبتدا اور اس کے تاریخی ارتقا پر اُن کی بہت اچھی نظر تھی اور یہ اَیسا شعبہ ہے جس میں کوئی

[1] گرد پوش، اُردو صرف و نحو، مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۱ء

اُن کا حریف نظر نہیں آتا۔

مولوی عبدالحق کا بڑا کارنامہ اُردو ادب کے اُن شاعروں اور مُصنفوں کو زندگی عطا کرنا ہے، جو معنوی طور پر مرچکے تھے۔ اُنہوں نے متعدد قدیم و نایاب تذکروں کا کھوج لگا۔ بڑی جان فشانی سے انہیں ترتیب دیا، اور اس طرح گویا تاریخ ادب کی گم شدہ لڑیوں کو ہم رشتہ کیا۔ آل احمد سرور نے ٹھیک کہا ہے کہ:

"عبدالحق نے ہمارے کلاسیکی اَدب کو جسے ہم مُردہ سمجھ بیٹھے تھے ہمارے لئے زندہ کیا۔"[1]

اُن کی تلاش و تحقیق نتائج کے اعتبار سے زبان کی تاریخ پر ایسا گراں قدر احسان ہے جسے اُردو زبان کے نام لیوا کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

تذکروں کے علاوہ اُنہوں نے بیسیوں دکنی مخطوطات کو گُم نامی کے عمیق غاروں سے باہر نکالا اِس طرح قدیم اُردو کے بہت سے گراں مایہ جواہر ریزوں نے، جو صدیوں سے دُور دست مقامات خصوصاً غیر معروف خانقاہوں میں مدفون پڑے تھے، مولوی عبدالحق کی تلاشِ صادق کی بدولت زندگی کی روشنی دیکھی۔ ان پارینہ سال کرم خوردہ کتابوں کی فراہمی سے بھی زیادہ سخت مرحلہ ان کا پڑھنا اور انہیں پڑھ کر ان کے مطالب کی وضاحت کرنا تھا۔ اکثر مخطوطے خطِ نسخ میں تھے مگر ہندی اصوات، حروف و اعراب میں فرق تھا۔ کتنے ہی لفظ متروک ہو چکے تھے، انہیں پڑھنا اور سمجھنا بڑا کٹھن اور دشوار تھا۔ مولوی عبدالحق نے یہ سب کھکیڑیں اُٹھائیں اور بڑی کاوش اور جاں کاہی سے متون کو مرتب کیا اور قدیم دکن کی نظم اور نثر کی بہت سی کتابیں بہ تصحیح، ذیلی حاشیے اور فرہنگِ الفاظ کے ساتھ اہلِ اُردو کے سامنے پیش کیں۔

قدیم اردو کے موضوع پر وہ برابر اپنی تحقیق کے نتائج مقالات و مضامین کی صورت میں شائع کرتے رہے۔ اُن کے تحقیقی مقالات اور قدیم نظم و نثر کی اشاعت نے اس عام نظریے کو باطل کر دیا کہ اُردو لشکری زبان ہے، جس نے مغل سلاطین خاص کر شاہ جہان کے عہد میں جنم لیا۔ مولوی عبدالحق نے بابر کی آمد سے بھی سو برس پہلے کی کتابیں دریافت کیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام پر اُن کے بسیط تبصرے نے اُردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والوں کو وَرطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اکبر و جہانگیر کے اس ہم عصر نے بڑی تقطیع کے تقریباً اٹھارہ سو صفحات پر پچاس ہزار کے قریب اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ قدامتِ زبان کے سبب،

---

[1] تنقیدی اشارے (پہلا پاکستانی ایڈیشن)، ص ۲۰۸

قطب شاہ کا یہ کلیات عسیر الفہم ضرور ہے، لیکن بلاشبہ یہ اردو ہی کی ابتدائی اُٹھان اور صورت کا نمونہ ہے۔

مولوی عبدالحق کا ایک پُر مغز تحقیقی مقالہ "اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" کئی بار علاحدہ مختصر کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ دو اور طویل مقالے بھی کتابی شکل میں ملتے ہیں۔ ایک "مرحوم دہلی کالج" اور دوسرا "مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر"۔ ۱۹۶۱ء میں انجمن کی طرف سے مولوی عبدالحق کے تحقیقی مقالات کا ایک مجموعہ "قدیم اردو" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں اُن کے اٹھارہ گرانقدر مقالات شامل ہیں۔ ملک الشعرائے بیجاپور کے سوانح اور کارناموں پر ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب "نصرتی" بھی مولوی عبدالحق کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

غرض مولوی عبدالحق کی سعی و تلاش نے نہ صرف اُردو ادب کی تاریخ کو کئی صدی اُدھر تک وسیع کر دیا یعنی گیارھویں کے بجائے ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں اسے بولتے ہوئے سُنا دیا بلکہ اس کے سبب مرحوم ہاشمی فرید آبادی کے لفظوں میں[ا] ہمارے سامنے ہندوستان کی ملّی تاریخ اور تہذیبی وحدت کے مطالعے کا ایک نیا باب کھل گیا۔

مولوی عبدالحق نے انجمن اور دوسرے اداروں یا اشخاص کی طرف سے شائع ہونے والی متعدد اور متنوع کتابوں پر بلند پایہ اور فاضلانہ مقدّمات بھی لکھے۔ اِن مقدمات کو سب سے پہلے مرزا محمد بیگ نے ۱۹۳۳ء میں دو جلدوں میں مرتب کیا۔ اس کے کوئی ایک تہائی صدی کے بعد ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان مقدمات کو ازسرِ نو مرتب کیا اور بہت کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ انہیں ایک جلد میں شائع کیا اس ایڈیشن میں موضوعات وار مولوی عبدالحق کے ستاون مقدمات شامل ہیں۔ چند مقدمات سے قطع نظر جو اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، مقدماتِ عبدالحق کا یہ ایڈیشن مولوی عبدالحق کے کم و بیش سب مقدمات پر حاوی ہے۔

مقدماتِ عبدالحق کو تاریخ ادبیاتِ اُردو میں بوجوہ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے ٹھیک[۲] کہا ہے کہ اگر یہ مقدمے نہ ہوتے تو کلاسیکل لٹریچر کے تحفظ و احترام کا اور پھر اسے ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کا جذبہ اتنا عام نہ ہوتا، جتنا اب ہے۔ یہ مُقدّمات مولوی عبدالحق کے وسیع مطالعے، ان کی نکتہ رسی اور دیدہ وری کے شاہد ہیں۔

---

[ا] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ...، ص ۲۷۵

[۲] برگِ گل، بابائے اُردو نمبر (مرتبہ: راقم الحروف و رفقا) اگست ۱۹۶۳ء ص ۲۵۲

"مقدمات"۔ کتاب، صاحبِ کتاب اور نفسِ کتاب کے امکانی وقوف کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس لئے بڑے پُرمایہ اور سدا بہار رہیں۔ ان مقدمات سے مولوی عبدالحق کے تنقیدی شعور، اُن کی تحقیقی استعداد اور ہر دو عناصر کے باہم امتزاج پر مولوی عبدالحق کی غیر معمولی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔

مولوی عبدالحق محقّق ہونے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے بہت بڑے ناقدِ ادب بھی تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مختصر مجموعہ ۱۹۲۹ء میں انجمن کی طرف سے "چند تنقیداتِ عبدالحق" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور ایک مجموعہ تراب علی خاں باز نے "تنقیداتِ عبدالحق" کے نام سے مرتب کر کے لاہور سے شائع کیا تقسیم ملک بعد ان کے تنقیدی مضامین کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ تقسیم سے پہلے کے مجموعوں کو بھی کسی اعتبار سے نمائندہ اور مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ مولوی عبدالحق نے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے تنقیدی مقالات و مضامین لکھے جو ان مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں اور بہت کچھ رسالہ "اُردو" کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔ طرزِ جدید کے مطابق عملی تنقید کا مذاق عام کرنے میں رسالہ "رسالہ" کو جو مولوی عبدالحق کی زیرِ ادارت پچھلے چالیس برس تک باقاعدگی سے نکلتا رہا، بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پریم چند نے بجا طور پر اسے اُردو رسائل کا "قافلہ سالار" کہا تھا۔ اس رسالے میں کتابوں پر تبصرہ کا حصہ ہمیشہ بڑا معرکے کا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کے "غیر رسمی" تبصروں نے تنقیدی شعور بیدار کرنے میں بڑا اہم حصہ لیا ۱۹۴۷ء میں دانش محل لکھنؤ نے "ادبی تبصرے" کے نام سے مولوی عبدالحق کے بعض تبصرے کتابی شکل میں شائع کئے یہ نقد و تبصرے کا ایک معیار قائم کرتے ہیں اور آج بھی روزِ اوّل کی طرح بڑے وزن و وقار کے حامل ہیں۔

مولوی عبدالحق پر حالی کی شخصیت نے بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ تنقید کا چسکا ان کو حالی ہی کی صحبت میں لگا اور ان کے توسل دہ شیفتہ سے بھی متاثر ہوئے۔ بصیرت و شعور، ذاتی رائے زنی کی صلاحیت اور وسعتِ مطالعہ، نقد و بصر کے لئے انتہائی ضروری ہے خود مولوی عبدالحق کے لفظوں میں:

> تنقید جس قدر عام ہے، اسی قدر مشکل ہے ...... تنقید پر وہی لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دُوربین ہو، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دربائے ادبیات کا شناور بھی ہو۔

جس نے ایک مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دلنشیں کرا سکتا ہے، ہماری زبان میں یہ کام صرف مولانا حالیؔ مرحوم نے کیا ہے۔ فن کی حیثیت سے وہ اس کے بانی ہی نہیں ایک اعلیٰ پائے کے ادبی نقاد ہیں اور جن کی تحریریں ہمیشہ بڑی وقعت اور قدر سے دیکھی جائیں گی۔"

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۴۸)

عقلیت، واقعیت اور چھان بین، مولوی عبدالحق کی تنقید کے بنیادی عناصر ہیں۔ حالی کی طرح اُن کی تنقید میں بھی گہرے تفکر اور آزادانہ رائے کی کمی نہیں۔ اُن کے نزدیک:

"عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کر دیتی ہے، تنقید نظر نیچی کر لیتی ہے اور انصاف اُدھر مُنہ پھیر لیتا ہے ......"

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۷۳)

مولوی عبدالحق تنقید کرتے وقت اعتدال، توازن اور معقولیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے وہ اُردو نثر میں خوشگواری، سادگی و متانت، اس کے موجودہ انقلاب و ارتقا اور اس کی وسعت اور ادبی صلاحیت کو سرسید کی مساعی کا نتیجہ گردانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اُن کی تحریر کو تنقید سے بالا سمجھ کر، اپنی رائے کو عقیدت و محبت کی بھینٹ نہیں چڑھا دیتے بلکہ کمال عقلیت اور متانت کے ساتھ سرسید کی نثر کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"(سرسید) کو اَدائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسنِ بیان کو قربان کر دیتے ہیں جس سے اکثر اُن کی عبارت سُست اور پھُسپھُسی معلوم ہوتی ہے۔"

(چند ہم عصر، ص ۲۹۲)

مولوی عبدالحق حالی کے سب سے بڑے متبع ہیں وہ اُن کے اتھاہ جذبۂ انسانیت کو بڑی قابلِ قدر چیز سمجھتے ہیں اور ان کی اپنی نیک نفسی، پاک سیرتی، سادگی اور شرافت نے اس جوہر کو خصوصیت کے ساتھ اپنایا لیکن اسلوب احمد انصاری کے لفظوں میں[1]

---

[1] "اردو" بابائے اُردو نمبر (مرتبہ: سید وقار عظیم) اگست ۱۹۶۲ع ص ۱۹۰

حالی کے صحیح جانشین ہونے کے باوجود مولوی عبدالحق شخصیت کی چھان بین (EVA LUATION) میں حالی سے زیادہ دُور رس ہیں اور ان کا خیر و شر کا تصور عقلی ہے، جذباتی نہیں۔ وہ انتہائی ہمدردی، محبت اور عقیدت کے باوجود اپنی رائے کے منصفانہ اظہار میں پس و پیش نہیں کرتے خود حالیؔ کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے کسی رُو رعایت سے کام نہیں لیا ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے، کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں بلکہ شیوہ ہوگئی ہے۔ (حالی) سیدھی سادی باتیں کرتے تھے...... ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تعلّی آگئی ہے۔"

(چند ہم عصر، ص ۱۶۸)

مولوی عبدالحق کی تنقید بے جھجک اور بے باک ہوتی ہے وہ نام کو نہیں دیکھتے۔ سرسید کی عبارت میں پھسپھسا پن ہو یا حالیؔ کی شاعری میں کہیں تعلّی کا شائبہ نظر آئے، وہ اس کی نشاندہی سے نہیں چوکتے۔ "چند ہم عصر" میں سرسید کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ "ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں" بایں ہمہ مولوی عبدالحق نے اپنے ایک ممتاز اور نامور ہم عصر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے متعلق جس بے جھجک انداز میں اپنی رائے مرتب کی ہے وہ "قابلِ داد" ہے:

"(رشید احمد صدیقی) کے طرزِ بیان میں ایک بانک پن پایا جاتا ہے، جس میں شوخی کی جھلک ضرور ہوتی ہے لیکن بعض اوقات لفاظی کے الجھاؤ سے اُلجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ صدیقی صاحب اُردو کے اُن انشاپردازوں میں سے ہیں۔ جن سے بڑی اُمیدیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ طبیعت کی اُفتاد اُنہیں کدھر لے جاتی ہے جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اُس میں بگڑنے کے لچھن بھی ہوتے ہیں۔"

(چند تنقیداتِ عبدالحق، ص ۱۰)

مولوی عبدالحق جذباتیت یا ذاتی پسند ناپسند سے کام لئے بغیر انتہائی توازن اور منطقی استدلال کے ساتھ اپنی جچی تلی رائے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر نہایت

پختہ رچے ہوئے تنقیدی شعور کا نمونہ ہوتی ہے۔ وہ تنقید کرتے ہوئے مواد اور اسلوب دونوں پر یکساں نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تنقید کو عصر حاضر کے جدید رجحانات کے مطابق صحت مند بنانے میں بھی حصہ لیا کیوں کہ اُن کے نزدیک:

شاعری کے انقلابات اور تغیرات اپنے زمانے کے انقلابات اور تغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شعر کو شاعر سے اور اُس کے زمانے سے الگ کرکے دیکھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو اُس کے احباب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جدا کر دینا۔"

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۵)

یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق تنقید کرتے وقت نہ صرف زیرِ نقد کلام کے ماحول اور اُس دور کے اُن معاشرتی و سماجی اثرات پر جس میں اس نے جنم لیا ہے نظر ڈالتے ہیں بلکہ "کلیم" کے ذہن و دل کے دَر و بست کو بھی ٹٹولتے ہیں یعنی خارجی اور داخلی دونوں قسم کے حسن و قبح پر نظر رکھتے ہیں۔ تنقید اُن کے نزدیک عقیدت یا منافرت کا اظہار نہیں بلکہ انتہائی ذمہ دارانہ فرض ہے۔ وہ کبھی کسی موضوع کو اُس وقت تک چھیڑتے نہیں دکھائی دیتے جب تک اُسے ہر پہلو سے دیکھ بھال نہیں لیتے۔ انھوں نے تنقید کا تحقیق سے پیوند لگایا۔ موضوع زیرِ بحث کو اچھی طرح ذہن میں رچانے بسانے کے بعد وہ تخلیقی عمل کے ماتحت اس کے معائب و محاسن کا تجزیہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں حیرت انگیز حد تک عقلیت، متانت اور اعتدال و توازن ملتا ہے۔

متین الرحمن مرتضیٰ کے بقول[۱] شبلی کا یہ خیال دُرست ہے کہ حالی کنویں کی مانند ہیں جو محدود ہوتا ہے لیکن گہرائی رکھتا ہے اور خود شبلی نہر یا دریا کی مانند ہیں جس کی گہرائی اس کی وسعت کی بہ نسبت بہت معمولی اور حقیر ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے کنویں کی گہرائی اور دریا کی وسعت کو ہر دو بزرگوں سے کچھ اس طرح اصل سے بڑھ کر اپنایا کہ وہ بحرِ ذخّار کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جو کنویں سے کہیں زیادہ گہرائی اور دریا سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

مولوی عبدالحق بہت بڑے خطیب اور اُردو کے معروف و ممتاز وکیل اور مبلغ بھی تھے

---

[۱] برگ گل، بابائے اردو نمبر (مرتبہ راقم الحروف و رفقا) اگست ۱۹۶۲ء ص ۲۳۸

اوّل اوّل دو جلدوں میں مولوی عبدالحق کے خطبات علی الترتیب ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۴ء میں انجمن کی طرف سے شائع ہوئے ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے تیرہ خطبوں اور تقریروں کے اضافے کے ساتھ ان خطباتِ کو یک جا کر کے مرتب کیا۔ خطباتِ عبدالحق کے اس جامع ایڈیشن کی اشاعتِ ثانی ۱۹۶۴ء میں چار مزید خطبات کا اضافہ کیا گیا۔ اب اس مجموعے میں کل اڑتیس خطبے اور تقریریں شامل ہیں۔

یہ خطباتِ مختلف مواقع پر اور پاک و ہند کے مختلف مقامات پر دیئے گئے۔ خطبات کا موضوع ہر جگہ زبان دلسان اور شعر وادب کے مسائل و معاملات سے متعلق رہا ہے۔ اس کے باوصف یہ خطبے اعادہ و تکرار اور یکسانیت کے عیب سے کم و بیش خالی ہیں۔ وہ ہر مرتبہ اپنی بات زیادہ توانائی اور تازگی سے پیش کرتے اور اسے ذہنوں میں جماتے اور منواتے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھی خطابت کا ایک میزان معیار یہ بھی ہے کہ وہ سامعین کو کس حد تک زیرِ اثر لیتی ہے اس لئے خطابت کو شریفانہ نعرہ بازی کہا گیا ہے جس میں مجومی نفسیات کا دخل ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق خطبات میں سامعین کو مختلف وسیلوں سے متوجہ کرتے ضرور نظر آتے ہیں لیکن اس حد تک نہیں کہ اس کاوش میں اُن کے خطبے وقتی ہو کر رہ گئے ہوں۔ یہ اپنے "اندازِ گذارش و نگارش" کے سبب زود اثر اور موادِ معنی کے اعتبار سے مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں۔

مولوی عبدالحق کو انسانی سیرتوں کی عکاسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ اُن کی کتاب "چند ہم عصر" جس کا شمار ادبیاتِ عالیہ میں ہوتا ہے اِس کی بڑی عُمدہ مثال ہے۔ انھوں نے جن ہم عصروں پر قلم اٹھایا ہے، اُن سے وُہ کسی نہ کسی طور پر مُتاثر ہوئے اور رہے ہیں۔ اس طرح سیرت نگاری کے لئے ہم عصروں کے انتخاب اور چناؤ کے سہارے ہمیں خود مولوی عبدالحق کی سیرت، اُن کے عقائد و نظریات اور مرکزی اقدارِ حیات تک رسائی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے ممدوحین کی جن خوبیوں کو سراہا، جن عادات و اطوار کی ستائش کی اور جن شخصی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے ان کی روشنی میں ہمیں مولوی عبدالحق کے محاکمے میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔

مولوی عبدالحق کے کردار کی تعمیر اپنے "اُستادِ معنوی" حالی کے کردار کی طرح خلوص پر ہوئی۔ حالی کی طرح وہ بھی سادگی کے دل دادہ ہیں۔ وہ ہمیشہ بیان میں سادگی اور

صفائی پر زور دیتے ہیں۔ زبان میں بلاوجہ لفاظی اور ثقالت کو بدعت خیال کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک "سادگی و پرکاری" کمالِ صناعی ہے اس میں ادب بھی شامل ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں. یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اس کے ساتھ موضوعِ تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لُطف اُٹھائیں، اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تضیعِ اوقات ہے۔

وسعتِ مطالعہ اور زیرِ فکر موضوع پر غائر نظر قدرتی طور پر سادہ بیانی کا موجب ہوتی ہے، مگر سادہ بیانی پر قدرت ہر ایک کے بس کی بات نہیں اس کے لئے گہرا ریاض، وسیع مطالعہ اور فکر و نظر میں کشادگی ضروری ہے۔ "پریشاں خیالی تحریر میں" دھندلا پن" پیدا کرتی ہے۔ شعوری طور پر آراستہ زبان عجزِ بیان کا مظہر ہوتی ہے اور یہ شیوہ ضعفِ ادبیت کی دلیل ہے"۔ اس عقب میں ہم اگر مولوی عبدالحق کی نثر کا جائزہ لیں تو اُن کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حالی کے بعد وہ اُردو کے سب سے بڑے نثار ہیں اُن کے نزدیک:

"آسان اور مشکل اضافی لفظ ہیں۔ یہ ذوق کی بات ہے اور ادب میں یہی منزل بڑی کٹھن ہے وہاں آسان اور مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا وہاں تو دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بے محل آگیا ہے تو ایسا ہی بُرا ہے جیسا بے موقع مشکل لفظ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور اُلجھا ہوا نہ ہو۔ سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہو سکتے ہیں۔"

(خُطباتِ عبدالحق، ص ۲۶۲)

سادگی اور صفائی کے مفہوم کی اس روشنی میں دیکھا جائے تو مولوی عبدالحق بسا اوقات حالی پر بھی سبقت لے جاتے ہیں۔ اُنھیں کے کہنے کے مطابق:

"ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے۔"

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۱۲)

زبان میں لفظوں کی ساخت، عہد بہ عہد تغیر اور ان کے استعمال و معنی میں لطیف فرق و امتیاز کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ وہ بعض اوقات عبارت میں موقع و محل کے مطابق کوئی نامانوس اور غیر مستعمل لفظ یا ہندی یا سنسکرت اور بھاشا کی کوئی متروک ترکیب اس چابکدستی سے استعمال کر جاتے ہیں کہ تحریر میں جان پڑ جاتی ہے مثلاً "چند ہم عصر" میں مولوی چراغ علی کے متعلق یہ سطور کس قدر خوب صورت نظر آتی ہیں:

"تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے، اس کی تہہ تک پہنچتے اور اس کے مالہ و ماعلیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے۔"

مولوی عبدالحق کی تحریر میں انسانی فکر و شعور کے لئے رہ نمائی، فنی قدروں کے نفاذ اور ادبی و لسانی مسائل پر احکام کی فراوانی ملتی ہے، جو اُن کی بصیرت کی امین اور عظمت و بزرگی کی علامت ہے۔ وہ اعلیٰ پائے کے خطیب و معلّم اخلاق بھی تھے، ان کے خطبے اور دوسری تحریریں اخلاقی درس کا بہت عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں اقوام عالم کے عروج و زوال علی الخصوص مسلمانوں کے ارتقا و تنزل پر ان نظر گہری تھی وہ اسباب و علل کو "اپنی نظر" سے دیکھنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریریں پائیدار تجربوں اور اعلیٰ انسانی اور فنی قدروں کی دولت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ اُن کی تحریر میں خیال افروز مقامات قدم قدم پر آتے ہیں، جن سے پڑھنے والے کو روشنی نصیب ہوتی ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنّف اسے کچھ دے رہا ہے اس کا وقت ضائع نہیں کر رہا۔ یہاں چند اقتباسات بے محل نہ ہوں گے:

"صحیح قدم، منزلِ مقصود کا پتا دیتا ہے۔"

(خطباتِ عبدالحق ص، ۴۲۰)

"جو نہ سمجھنا چاہے، اُسے کون سمجھا سکتا ہے۔"

(خطبات ص، ۵۳۶)

"آنکھوں کے اندھے کو انگلی پکڑ کر رستہ دکھا سکتے ہیں لیکن عقل کے اندھے کے لئے رہ نمائی کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔"

(خطبات ص، ۵۱۸)

"علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو، صحیح ذوق نہ ہو تو

علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔"

(چند ہم عصر، ص ۲۵۵)

"کسی تحریر یا ادب کی پشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔"

(چند ہم عصر، ص ۲۸۳)

"سکوت، سکون، بے عملی و بے اعتنائی انسانوں اور قوموں کے دشمن ہیں۔"

(خطبات، ص ۲۷۷)

"ہم حیات کو جکڑ بند نہیں کر سکتے..... یہ اس کے لئے موت ہے۔"

(خطبات، ۲۰۳)

"ادب میں حسن و خوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے۔"

(مقدمات، ص ۲۶۰)

"زندگی بسر کرنا اور اسے صحیح طور سے برتنا ہی خود ایک بڑی نیکی ہے، اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض و غائیت ہے۔"

(مقدمات، ص ۱۷۴)

"ہر زندہ زبان اور زندہ شے میں تغیر و تبدل اور اصلاح کا ہونا لازم ہے۔"

(خطبات، ص ۵۸)

"قومی تہذیب کی عمارت زبان کی بنیادوں پر چنی جاتی ہے۔"

(خطبات، ص ۳۳۵)

"غیر سے مقابلہ اتنا مشکل نہیں جتنا اپنوں سے اور یہ سخت سانحہ ہے"

(خطبات، ص ۲۳۸)

"چوٹ کھائے ہوئے دلوں سے ڈرنا چاہیئے"

(خطبات، ص ۲۴۸)

"دل کی زبان بڑی بلیغ اور پر اثر ہوتی ہے۔"

(خطبات، ص ۵۷۲)

"حقیقت پر پردہ ڈالنا یا جانتے ہوئے خاموش رہنا بھی اخلاقی جرم ہے۔"

(خطبات، ص ۹)

"امرا کی صحبت آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتی۔"

(مقدمات، ص ۴۷۸)

"اچھا اُستاد دُنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔"

(مقدمات، ص ۱:۲:۳۰)

"وہ غلطی وہی کرتا ہے جو کچھ کرتا بھی ہے، جو کچھ کرتا ہی نہیں وہ غلطی کیا کرے گا۔"

(خطبات، ص ۴۳۵)

"کام سے انسانیت آتی ہے۔ سیرت اور اخلاق بنتے ہیں۔ ظاہر و باطن کی اصلاح ہوتی ہے۔ ہم جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں مگر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔"

(خطبات، ص ۴۳۷)

"جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے۔"

(خطبات، ص ۲۴۶)

"ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔"

(خطبات، ص ۳۹)

"محض اس بنا پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں گذشتہ سے اپنا تعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے۔"

(خطبات، ص ۶۹)

"ترقی کے لئے تخریب ضروری ہے مگر لازم نہیں۔"

(خطبات، ص ۶۸)

"شعر کہیں بند نہیں وہ اسی قدر وسیع ہے جس قدر کہ زندگی۔"

(خطبات، ص ۲۰۱)

"اپنے سہارے آپ کھڑا ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا تکتا ہے خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اُس سے زیادہ کھوتا ہے۔"

(چند ہم عصر، ص ۱۳)

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔"

(چند ہم عصر، ص ۳۸۳)

یہ اقتباسات بغیر کسی خاص کاوش اور ترتیب کے پیش کر دیئے گئے ہیں لیکن بلحاظ ان سے ایک نتیجہ یہ ضرور نکلتا ہے کہ مولوی عبدالحق کے ہاں معنی و مفہوم کی اکائیوں اور لفظوں میں بہت کم فرق اور فاصلہ ہوتا ہے۔ انہوں نے دنیا کو دیکھا اور برتا تھا۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں، ذہن روشن تھا۔ اس سے ہٹ کر اور بڑھ کر وہ نتائج کے استنباط کی خداداد صلاحیت سے متصف اور بہرہ ور تھے۔ یہی وجہ کہ زمانے، ذہن، زندگی، کائنات زبان و لسان، انسان اور ادب و شعر وغیرہ سے متعلق انہوں نے جو باتیں کہی ہیں اور جس دقیع اور بلیغ انداز میں کہی ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔

مولوی عبدالحق اردو کے بابا و مسیحا، بے لوث و بے مثال خدمت گزار، جید عالم، مجتہد قواعد و نگار ماہرِ لسانیات، قدرِ اوّل کے لغوی، محقق و نقاد، بہت بڑے خطیب اور مقدمہ نویس، غضب کے سیرت نگار صاحب طرزِ انشاء پرداز اور اعلیٰ درجے کے مفکر اور منتظم تھے۔ یہاں اس بات کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مولوی عبدالحق نے اردو زبان کو برِ عظیم میں مقبول عام بنانے کے لئے کس قدر جدوجہد کی۔ صرف تقسیم ہند سے پہلے ہی کے نو دس سالہ طوفانی دوروں کی مسافت کا اندازہ لگایا جائے تو بات پچاس ساٹھ ہزار میل تک پہنچتی ہے اس سے ان کی ہمت و استقلال، لگن و استقامت اور غیر معمولی تڑپ اور دھن کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس غیر معمولی اخلاص و انہماک، خداداد قابلیت اور غیر منقطع جدوجہد سے بیدا ئی احساس اور حمائتِ اردو کی جو عام لہر اور فضا پیدا ہوئی اُس کا احاطہ دشوار ہے۔

غرض مولوی عبدالحق نے اپنی بے پناہ تنظیمی قوت، غیر معمولی استعدادِ کار اور اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو تادمِ مرگ اردو زبان و ادب کی ترویج و تہذیب کے لئے وقف رکھا۔ اُن کا سا جوشِ عمل اور انہماک رکھنے والا بے لوث خدمت گزار اردو زبان کی تاریخ میں کوئی دوسرا نہیں گزرا۔

سید معین الرحمٰن صاحب کا ہر کام داد اور بیداد دونوں سے بالاتر ہوتا ہے - ان کی نئی کتاب 'نقد عبدالحق' مجھے خاص طور پر بے حد و بغایت پسند آئی — یہ ''عبدالحقیات'' میں ایک قیمتی اضافہ ہے -

**محمد طاہر فاروقی**
(پروفیسر زبان اردو و علوم پاکستانی ، انقرہ یونیورسٹی ، ترکی
سابق صدر شعبۂ اردو ، پشاور یونیورسٹی)

سید معین الرحمٰن ، اردو کے ان ابھرتے ہوئے لکھنے والوں میں ہیں جن کا ہر قدم تیزی کے ساتھ منزل کی سمت بڑھ رہا ہے - ان میں علمی و ادبی کاموں کی جو قابلیت اور لگن ، جو حوصلہ اور سلیقہ ہے ، وہ ان کے ہم عمروں میں کم نظر آتا ہے -

مولوی عبدالحق کی ذات و صفات سے معین صاحب کو شروع ہی سے لگاؤ رہا ہے - اسی لگاؤ کا دوسرا نام ، ادیب کا خلوص ہے جو ادبی کاموں میں عظمت کے آثار پیدا کر کے ادب کے ساتھ ساتھ ، ادیب کو بھی امر بنا دیتا ہے - 'نقد عبدالحق' اسی نوع کی تالیف ہے جس میں مرتب کے اخلاص نے مولوی صاحب کے جملہ کمالات کو نہایت خوش اسلوبی سے سمیٹ لیا ہے -

یہ کتاب ، مولوی عبدالحق پر پہلی مبسوط اور جامع دستاویز ہے اور اس کا مطالعے کیے بغیر کوئی شخص ، مولوی صاحب کے فکر و فن سے شناسا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا -

**ڈاکٹر فرمان فتح پوری**
(شعبۂ اردو ، کراچی یونیورسٹی)

سید معین الرحمٰن صاحب نے صحیح معنوں میں 'طالب علم' کا مزاج پایا ہے — حصول علم کے لیے جس تلاش و تجسس ، کام کی لگن اور جذبۂ انکسار کی ضرورت ہے وہ ان کی شخصیت اور کردار کا نمایاں حصہ ہے - دبستان عبدالحق پر کافی کام ہو چکا ہے لیکن معین صاحب نے بابائے اردو کے فکر و فن سے متعلق نگارشات کا جو مجموعہ مرتب کیا ہے اس کی اپنی ایک مستقل حیثیت اور افادیت ہے اور یقیناً اس کی قدر کی جائے گی -

**ڈاکٹر اقتدا حسن**
(پروفیسر دانش گاہ علوم شرقیہ ، نیپلز ، اطالیہ)

سیّد معین الرحمٰن

کی ایک یادگار تالیف

''بابائے اُردو — احوال و افکار''

مشمولہ :

# نقدِ عبدالحق

''مولوی صاحب پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ تالیف رہنمائے خاص کی حیثیت رکھے گی۔''
—— **نیاز فتح پوری**

''بابائے اردو مرحوم کے کام اور شخصیت اور خدمات سے متعلق یہ کتاب قابل قدر ہے۔''
—— **مولانا عبدالماجد دریا بادی**

''بابائے اردو — احوال و افکار'' سے بے حد خوش وقت ہوا۔ یہ کام مستقل تصنیف سے بدرجہا زیادہ مشقت طلب اور صبر آزما تھا۔ آپ نے اسے نہایت خوش اسلوبی اور جامعیت سے انجام دیا۔ اس کی تحسین کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔''

—— **مولانا غلام رسول مہر**

''بابائے اردو کے متعلق آپ کی دل چسپ اور مفید تالیف کو نہ صرف ہر وہ شخص جسے مولوی صاحب مرحوم سے ذاتی نیاز حاصل تھا، بلکہ اردو زبان و ادب کا ہر نام لیوا حرزِ جاں بنائے گا۔''
—— **پروفیسر حمید احمد خاں**
(وائیس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی)

''بابائے اردو — احوال و افکار'' کے ذریعے آپ نے اردو ادب کا ایک بیش قیمت کارنامہ انجام دیا۔''
—— **ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں**
(صدر شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی)

''مولوی صاحب کی حیات اور علمی کارناموں پر آئندہ تحقیقی کام کرنے والے اس دستاویزی مواد سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔''
—— **ڈاکٹر شوکت سبزواری**
(مدیر اوّل، ترقیٔ اردو بورڈ، کراچی)

**نذر سنز**